جلد ششم

مع ترجمہ وتشریح

مرتّبہ

محمد فاروق خاں

ترتیب

دیباچہ ---------- ۷

اخلاق

اَخُلاق ۱۱

اخلاقیات ---------- ۲۹

۱-اسلام میں اخلاق کی اہمیت ۲۹

۲-انسانی اخلاق ۳۵

۳-اخلاق کا تعلق ایمان سے ۳۸

۴-اخلاق کا تعلق انسانی زندگی سے ۴۷

۵-اخلاق کی جامعیت ۵۰

مکارمِ اخلاق ۵۷

ادراک و نظر

اخلاص	۵۷	شکر و احسان شناسی	۹۵
علِم	۷۰	قدر شناسی	۱۰۵
فہم و فراست	۸۴	صدق	۱۰۵
شعور و حس	۸۷	شرحِ صدر	۱۰۹
حکمت و معرفت	۹۳	یقین و ایمان	۱۱۰

- تعظیمِ حق ۱۱۳
- رضا ۱۱۷
- وفا ۱۱۹
- خوفِ خدا ۱۲۰
- ورع ۱۲۶
- عفت ۱۳۲
- حزم واحتیاط ۱۳۵
- تقویٰ ۱۳۸
- امانت ودیانت ۱۴۶
- توبہ واستغفار ۱۵۴
- امید وبیم ۱۶۱

ذوقِ صحیح ۱۶۴

- رجوع الی اللہ ۱۶۴
- انس ومحبت ۱۶۴
- غیرت ۱۷۳
- حیاوشرم ۱۷۵
- عفت وضبطِ نفس ۱۸۰
- زہد ۱۸۳
- استغنا ۱۸۷
- صاف سینہ ۱۸۹
- توکّل ۱۹۰
- جذبۂ اطاعت ۱۹۳
- قناعت ۱۹۴
- خوش ذوقی ۱۹۵
- طہارت ونظافت ۱۹۸
- سلیم الطبعی ۲۰۰
- خوشی ومسرت ۲۰۱
- فکروغم ۲۰۲
- ترکِ لایعنی ۲۰۵
- شہرت سے پرہیز ۲۰۸
- تعظیم ۲۰۹
- احترامِ قدر ۲۰۹

وقار وعظمت ۲۱۱

- علوّ ہمت ۲۱۱
- عزتِ نفس ۲۱۳
- حلم ومتانت ۲۱۳
- وسعتِ ظرف ۲۱۶
- وزن ۲۱۸
- وقار وسنجیدگی ۲۲۲

✪ متانت وشائستگی	۲۲۳	✪ عدل وانصاف	۲۶۱
✪ اعتدال ومیانہ روی	۲۲۵	✪ مروّت	۲۶۳
✪ خاموشی وکم گوئی	۲۲۷	✪ تواضع وانکسار	۲۶۷
✪ قوت وشجاعت	۲۳۵	✪ سادگی	۲۶۹
✪ ذمہ دارانہ حیثیت	۲۳۷	✪ شگفتگی وخوش مزاجی	۲۷۱
✪ رائے کی مضبوطی	۲۳۹	✪ فیّاضی	۲۷۲
✪ ثبات واستقامت	۲۴۳	✪ انفاق	۲۷۸
✪ غصہ پر قابو	۲۴۶	✪ نقطۂ نظر	۲۸۴
✪ صبر	۲۴۹	✪ عفوودرگزر	۲۸۹
✪ صبر مصائب میں	۲۵۳	✪ دردمندی	۲۹۰
✪ صبر انتقامی جذبات میں	۲۵۸	✪ رفق ونرمی	۲۹۰
✪ صبر دشمن کے مقابلہ میں	۲۵۹	✪ شفقت ورحمت	۲۹۶
✪ صبر اطاعت میں	۲۶۰	✪ جانوروں پر رحم	۲۹۹

اجتماعی محاسن

ادراک ونظر

✪ دانش	۳۰۷	✪ حبّ فی اللہ	۳۰۸

ذوقِ صحیح

✪ ایثار	۳۱۲	✪ نصح وخیر خواہی	۳۱۸
✪ راست روی	۳۱۴	✪ بھائی کی حمایت	۳۲۳
✪ متقیانہ زندگی	۳۱۵	✪ ایفائے عہد	۳۲۶
✪ شفقت علی الخلق	۳۱۷	✪ حسنِ معاملہ	۳۲۹

○ باہمی میل وجول	۳۳۱	○ حسنِ ظن	۳۴۴
○ باہم صلح کرانا	۳۳۲	○ عیب پوشی	۳۴۵
○ خدمتِ خلق	۳۳۴	○ رازداری	۳۴۷
○ صلۂ رحمی	۳۳۵	○ حاجت روائی	۳۴۹
○ جان کا احترام	۳۳۶	○ سفارش	۳۵۴
○ دردومحبت	۳۳۷	○ سادگی	۳۵۵
○ جذبات کا احترام	۳۴۳	○ معصومیت	۳۵۷

وقار و عظمت

○ سکون ووقار	۳۵۹	○ دوسرے کے مرتبہ ومقام کالحاظ	۳۶۵
○ نرمی وبردباری	۳۵۹	○ زبان کی حفاظت	۳۶۸
○ اعلیٰ ظرفی	۳۶۰	○ خوش گفتاری	۳۷۹
○ اعتدال پسندی	۳۶۱	○ گفتگو میں متانت	۳۷۹
○ قصور معاف کرنا	۳۶۳	○ طہارتِ زبان اور پاکیزہ زندگی	۳۸۱
○ پاکیزگیِ نفس	۳۶۴	○ لوگوں کی اذیتوں اور پریشانیوں کا خیال	۳۸۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کلام نبوت میں اخلاق کے مباحث اب تک جلد دوم میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب ترتیبِ نو میں انھیں جلد ششم اور جلد ہفتم میں جگہ دی گئی ہے۔ جلد ششم میں اخلاقِ حسنہ سے متعلق احادیث اوران کی تشریحات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جلد ہفتم میں اخلاق ذمیمہ سے متعلق احادیث پیش کی گئی ہیں۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ اس جلد کے ابواب کی ترتیب بھی دوسری جلدوں کی طرح انتہائی سائنٹفک ہواور احادیث کی تشریحات حتی الامکان عام فہم اور موثر ہوں۔ احادیث کی تشریح میں زیادہ اجمال سے کام نہیں لیا گیا ہے تاکہ عام قارئین حدیثوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ محسوس کریں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس نے جس طرح اس خدمت کی توفیق بخشی اسی طرح وہ اسے شرفِ قبولیت بخشے اور قارئین اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں۔

خاکسار

محمد فاروق خاں

۱۱رجنوری ۲۰۱۲ء

اخلاق

اخلاق

اخلاق کو انسانی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کی مثال نہیں ملتی جس میں نیکی و بدی کا سرے سے کوئی تصور نہ پایا جاتا رہا ہو۔ جو لوگ جبریت (Determinism) کے قائل ہیں وہ بھی علی الاعلان اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے نزدیک جھوٹ اور سچ میں یا ایمان داری اور مکر و فریب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سچائی، خیر پسندی اور سلامت روی انسان کی مطلوب صفات ہیں۔ انسانی ضمیر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہوسکتا کہ وہ ایفائے عہد کے مقابلے میں مکر و فریب کو، ایثار و قربانی کے مقابلے میں خود غرضی کو اور جذبۂ اخوت و ہم دردی کے مقابلے میں بغض و حسد اور ظلم و ستم کو بہتر سمجھنے لگے۔

انسانوں سے کسی خاص قسم کے اخلاق کے مطالبے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جہاں کوئی ارادہ و اختیار نہ پایا جاتا ہو وہاں کسی اخلاق و کردار کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے ارادہ و اختیار سے ہے۔ انسان کو دنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے اس لیے اس کا ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہی چیز ہے جو اسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

انسانی افعال و کردار کی کوئی مادّی توجیہ ممکن نہیں۔ شعور کو مادہ کی پیداوار سمجھنا صحیح نہیں۔ بے شعور مادہ کا مطالعہ ایک مادّی تحقیق ہے۔ مادّی اسباب کے ذریعے سے شعور کی تشریح کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ میکس پلانک (Max Plank) نے کہا ہے:

> ”کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو محض علت و معلول کے قانون کے ذریعے سے اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق کبھی بھی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے کسی اور قانون یعنی قانونِ اخلاقیات کی ضرورت ہے۔[۱]“

---

(۱) The Universe in the light of Modern Physics

انسان کو صاحب ارادہ و اختیار قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ نفس انسانی کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اسے اخلاق و کردار کا حامل قرار دینے کے لیے کوئی وجہ جواز ممکن نہیں ہے۔

اخلاق و کردار کے لیے ارادہ و اختیار کی آزادی کے علاوہ ایسے حقیقی، مستقل اور مطلق (Real Permanent and Absolute) اقدار حیات کی بھی ضرورت ہے جو اخلاقی قوانین کا مدار قرار پائیں۔ جن کی قدر و قیمت اضافی اور عارضی نہ ہو بلکہ ان کی قدر و قیمت مستقل اور ذاتی (Intrinsic) نوعیت کی ہو جن کے تحفظ کے لیے آدمی اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو سکے۔

علاوہ ازیں انسانی زندگی میں کسی اعلیٰ نظام اخلاق کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کا کوئی ایسا مقصود و منتہا نہ ہو جو مطلق قدر کا حامل ہو، جس کی جانب بڑھنے میں ہم اپنی تمام تر کوششیں صرف کر کے تسکین پا سکیں اور جس تک پہنچنے پر ہماری اپنی تکمیل کا بھی انحصار ہو۔ زندگی کا کوئی بلند مقصود و منشا ہی آدمی کو ہر قسم کی گم راہیوں اور تلون و انتشار سے بچا کر فطرت کے صحیح راستے پر لگا سکتا ہے۔ اسی کے حصول کی کوشش انسان کی اصل کام یابی اور اس کی اپنی ذات کی تکمیل کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر ہماری زندگی میں بھی اور خاص طور سے ہماری اندرونی زندگی میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔

اوسپنسکی (Ospunskey) نے لکھا ہے:

> ''انسان جب تک اپنے اندرونی تضادات میں وحدت قائم نہ کر لے اسے اپنے آپ کو ''میں'' کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس کا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص یہ وحدت حاصل کیے بغیر اپنے آپ کو صاحب اختیار و ارادہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ ارادہ نتیجہ ہوا کرتا ہے خواہشات کا۔ جس شخص کی خواہشات ہی مستقل نہ ہوں اس کی حیثیت محض اپنے جذبات اور خارجی تاثرات کے کھلونے کی ہوگی۔ اسے خبر نہیں ہو سکتی کہ دوسرے ہی سانس میں وہ کیا کہہ دے گا اور کیا کر گزرے۔ اس کی زندگی کے ہر لمحے پر اتفاقات کا پردہ پڑا ہوگا۔(۱)''

زندگی میں داخلی توافق کی بڑی اہمیت ہے۔ داخلی توافق کے بغیر معاشرے میں بھی کسی

---

(1) The New Model of universe P.132

توافق اور وحدت کی امید نہیں کی جاسکتی۔ رہا مسئلہ اخلاقی اقدار (Moral values) کے حصول کا تو حقیقت کے علم کے بغیر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ راشڈل (Rashdall) کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے:

''یہ ممکن نہیں کہ حقیقت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر اخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو یا ہمارے اخلاقی نقطۂ نظر سے ہمارا تصورِ حقیقت متاثر نہ ہوتا ہو۔''

حقیقت سے صرفِ نظر کر کے کسی اعلیٰ اور پائدار نظام اخلاق کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مستقل اور مطلق اخلاقی قدروں کے لیے ناگزیر ہے کہ زندگی اپنی کوئی حقیقی غرض و غایت رکھتی ہو۔ اس کائنات کو کسی عظیم مقصد کے تحت وجود بخشا گیا ہو۔ اور کائنات کی تمام چیزیں محض اس مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسباب کی حیثیت رکھتی ہوں۔

پھر اس سے آگے بڑھ کر کسی اعلیٰ اخلاقی نظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تسلسلِ حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ کیوں کہ اگر ہماری زندگی مسلسل اور مستقل نہیں ہے تو مستقل قدروں سے ہمارا ربط و تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر انسانی افراد کا منتہائے خیال محض قریبی مفاد کا حصول ہو تو کبھی بھی ان کی سیرتوں میں توازن پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ ایسے افراد پر مشتمل کوئی معاشرہ مستحکم اور پائدار ہوسکتا ہے۔

میکنزی (Meckenzie) نے اخلاقی مسائل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب ہم کہتے ہیں کہ اخلاقیات کے مطالعہ کا تعلق ایسے انسانی کردار سے ہے جو حق اور خیر کا حامل ہو تو اس سے ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اس نقطۂ نظر سے ہوتا ہے کہ ہمارا کردار (Conduct) کسی ایسے منتہا یا آئیڈیل (End or Ideal) کے لیے مفید ہوتا ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہو اور اس کا تعلق ان قوانین اور اصولوں سے ہوتا ہے جن کی رہ نمائی میں ہمارا کردار اس منتہا کے حصول کے لیے صحیح رخ اختیار کرتا ہے۔ یوں تو مختلف مقاصد کے لیے ہم کام کرتے ہیں جیسے مکان کی تعمیر، کتاب کی تصنیف وغیرہ لیکن اخلاقیات میں کردار کا مطالعہ بہ حیثیت کل (As a whole) مطلوب ہے۔ یہ کسی مخصوص قسم کے کردار کا مطالعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ

مختلف مقاصد میں سے کسی ایک خاص سے تعلق نہیں رکھتا جو اس کے پیش نظر ہو بلکہ اس کا تعلق اس بڑے اور آخری منتہا سے ہے جو ہماری پوری زندگی کے لیے رہ نما ثابت ہوتا ہے۔ اس منتہا کو بالعموم ''خیرِ اعلیٰ'' کی حیثیت دی جاتی ہے۔(۱)''

دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم اور قابلِ قدر شے وہ ہے جسے اہلِ یونان نے ناؤس (Nous) یا نوئٹک ناؤس (Noetic Nous) کا لقب دیا ہے۔ جس کو عربی زبان میں نفس یا نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ اسی کو بھارت میں آتما سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نفس کی مادّہ سے الگ اپنی مستقل ہستی ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے کائنات کے اندر اسے فوقیت حاصل ہے۔ کائنات میں مرکزی حیثیت نفس کی ہے۔ کائنات کی ساری رعنائی و دل کشی کا ادراک نفس کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اسی کے سبب سے کائنات میں معنویت کی نمود ہے۔ ساری کائنات کا جوہر اور خلاصہ نفس ناطقہ ہی ہے۔ کائنات میں جو چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں وہ نفس کے امکانات کے سوا اور کچھ نہیں۔ نفس ہی وہ چراغ ہے جس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جب اصل صورتِ حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کی کوئی چیز بھی نفس انسانی کا مقصود نہیں ہو سکتی۔ نفس کا مقصود وہی ہوگا جو اس سے عظیم تر اور اعلیٰ ہو۔ اس لیے لازماً نفس انسانی کا مقصود و منتہیٰ ایک نفس مطلق (Supreme And Absolute Personality) ہی ہو سکتا ہے۔ ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ نفس ہر اعتبار سے اپنا مقصود خود ہے لیکن اس میں بعض ایسی دشواریاں ہیں جن کا حل ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اپنی تمام تر خوبیوں اور کمالات کے باوجود نفس قائم بالذات نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی خالق نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کامل ترین ذات (Perfect in His Personality) کی صورت میں ہوتا۔ اسے خود کا پورا علم ہوتا، اس کے لیے ضلالت اور گم راہی کے الفاظ بے معنی ہوتے اور اس کی تکمیل کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اگر نفس کے مقصود کو ہم شخصیت (Personality) سے عاری تسلیم کریں تو اس صورت میں وہ نفس انسانی سے کم تر و فروتر ہوگا اور اسے کوئی بھی نفس کا مقصود قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے لازماً اپنا مقصود و منتہیٰ کوئی ذات مطلق (Absolute Personality) ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہی ذات ہے جس کو دنیا خدا کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ خدا ہی درحقیقت تمام حقیقتوں کا

---

(۱) A Manual of Ethics P.2

سرچشمہ اور ہماری ہستی کا اصل مرکز و محور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل کا تصور ذات مطلق کے بغیر ممکن نہیں اور نہ حیات اخروی پر ایمان لائے بغیر حیات کے تسلسل کا مسئلہ حل ہوتا ہے جس سے اخلاقی قدروں کے حصول کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

انسان کے لیے کسی ایسے اخلاقی نظام کا تصور جس کی بنیاد مادیت کے بہ جائے عالم گیر معنوی اصولوں پر قائم ہو کوئی ایسا تصور نہیں ہے جس سے ہماری زندگی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ ہم میں ہر شخص اپنے ہر دنیوی معاملے میں کوئی نہ کوئی معنوی نقطۂ نظر رکھنے پر مجبور ہے۔ انسان غیر شعوری طور پر محض میکانی انداز میں اپنا کوئی کام انجام نہیں دیتا۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کا علم وارادہ کام کرتا ہے۔ مآل اندیشی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ خالص مادّیت کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے کہ کوئی اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل کیوں کرے؟ اپنے قریبی مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام کوئی کیوں آئے؟ کم زوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ہم کیوں اختیار کریں؟ اس میں شبہ نہیں کہ مادیت کے علم برداروں میں ایسے اشخاص ملتے ہیں جنھوں نے قربانیاں دی ہیں۔ مفلسوں، ناداروں اور مظلوموں کی حمایت میں وہ سرگرم کار رہے ہیں لیکن ان کا یہ طرز عمل ان کے بنیادی نظریہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یقیناً یہ مادیّت کا نہیں مادیت سے ماورا کسی اور شے کا اثر تھا جو ان کے نفس کے کسی گوشے میں چھپا رہا ہے۔

اخلاقی اقدار کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اخلاق ہی وہ قابل قدر جوہر ہے جس کے ذریعے سے روحانی مادّی اور جمالیاتی (Aesthetic) قدروں میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اسی کے ذریعے سے معاشرے میں پائے جانے والے تضادات باہمی توافق میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اخلاق ہی وہ قوت ہے جس سے انسان کی زندگی اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جو تغیرات سے بلند و بالا ہے۔ حقیقت کے ساتھ زندگی کی یہی ہم آہنگی اور توافق ہے جس کو مفکرین نے حقیقی آزادی اور حصول صداقت سے تعبیر کیا ہے۔

مادہ پرست مادہ ہی کو اصل حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں جو کچھ بھی ہے وہ محض مادہ کی کارفرمائی ہے۔ مثلاً ان کے بعض لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ معاشی نظام کی ہیئت ہی میں انسانی زندگی کا سارا راز پنہاں ہے۔ مذہب واخلاق، تہذیب اور کلچر سب معاشی صورتِ حال کی پیداوار ہیں۔ درحقیقت حقائق کا یہ نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ مارکس اور مارکس کے متبعین کم ازکم اگر نفسیات اور اینتھروپولوجی ہی سے واقفیت رکھتے تو نفسیات انھیں بتاتی کہ پیداواری طاقتیں

انسانی دماغ کے اعمال وافعال کی تشریح سے یکسر قاصر ہیں۔ انسانی ذہن ذرائع پیداوار کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اوران پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اینتھروپولوجی انھیں اس بات سے واقف کراتی کہ روحِ انسانی فریب محض نہیں ہے بلکہ انسانی کلچر کی پیدائش اوراس کی نشو ونما میں درحقیقت اسی کی جلوہ گری ہے۔ مادی اسباب کو وہی کام میں لاتی اوران سے مختلف اسالیب کی تشکیل کرتی ہے۔ مختلف اسالیب میں اسی کا اظہار ہوتا ہے۔

خود یہ کائنات صرف افادیت، جس سے ہمارے مادّی مفادات وابستہ ہوتے ہیں، کی مظہر ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اندر دوسرے اور قابلِ لحاظ اشارات بھی پائے جاتے ہیں جو افادیت سے برتر ہیں، جن کو نظر انداز کر کے کائنات کی جو توجیہ بھی کی جائے گی ناقص اور غلط ہوگی۔ کائنات معنی رکھتی ہے۔ زندگی معنویت کی حامل ہے۔ اس کی دریافت سے مادیّت بالکل قاصر ہے۔ کائنات کے اندر نمایاں طور پر کسی بلند و برتر ذات کے علم وارادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ کائنات کے اندر کسی کے علم وارادہ کے کارفرما ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ساری کارفرمائی اخلاق کی ہے۔ علم وارادہ کا ظہور ہمیشہ اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ انسان کی ضروریات اور کائنات کی فراہم کردہ اشیاء میں انتہائی گہرا ربط وتعلق ہے۔ جسم کو برقرار رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب انسان اپنے خارج میں موجود پاتا ہے۔ یہ بہتے دریا، یہ چشمے اور میدان، یہ مختلف قسم کے درخت اور جانور، یہ پھول پھل اور کھیتیاں انسان کے فطری مطالبات کا جواب ہیں۔ انھیں خالق کی رحمت کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اشیاء جنھیں ہم اپنے گرد وپیش دیکھتے ہیں درحقیقت اخلاقِ خداوندی ہی کے زندہ مظاہر ہیں۔

اخلاقی کارفرمائی کی اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح تصویریں موجود ہیں لیکن انسان ان کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے کی پرورش میں اصل دخل والدین یا اعزہ واقربا کی اس شفقت ومحبت کا ہوتا ہے جو انھیں بچے سے ہوتی ہے۔ یہ اخلاق کا کرشمہ ہے نہ کہ خالص مادیت کا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اگر ہمیں ذوقِ جمال سے نوازا گیا ہے تو دوسری طرف کائنات کی ہر چیز کو حسن اور آراستگی بخشی گئی ہے۔ اس کو محض مادہ کی کرشمہ سازی قرار دے کر مطمئن ہو رہنا ذہنی وفکری خودکشی کے مرادف ہے۔ مارکس اور دوسرے مادہ پرست اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ زندگی کو مادیت پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک فائق تر

شے اپنے سے ادنیٰ درجے کی چیز کی تابع کیوں کر ہوسکتی ہے۔ زندگی شعور واحساس کی ایک آباد دنیا ہے جس کا سر چشمہ کوئی باشعور قادر مطلق ذات ہی ہوسکتی ہے اور صرف وہی ذات زندگی کا مقصود ومنشا بھی قرار پاسکتی ہے۔ خدا کو اپنی زندگی سے الگ کر کے صرف یہی نہیں کہ انسان خدا کے حقوق کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ اس کا یہ رویہ خود اس کے اپنے خلاف بھی ہے کیوں کہ اس طرح وہ اپنی حیثیت کو گرادیتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ہمارے جسم کے تمام اعضا ہاتھ، پیر وغیرہ بہ ظاہر اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت جو کچھ ہے وہ ہماری شخصیت کی نسبت سے ہے۔ اگر ہمارے دست و پا ہماری شخصیت کے تابع نہ ہوں تو ان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے۔ نظام جسمانی میں مرکزی حیثیت ہماری شخصیت کو حاصل ہے۔ اس لیے ہمارے تمام اعضا اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لیے ہر لحہ ہمارے دست نگر رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اصل حیثیت کی تعیین خدا کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اس نسبت و تعلق کے بغیر ہماری حالت ایک ایسے ہاتھ پیر کی رہ جاتی ہے جس کو جسم سے کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا ہو۔ ایسے کٹے ہوئے ہاتھ پیر اور خاک کے ڈھیر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہتا۔ انسان یہ تو سمجھتا ہے کہ ہاتھ یا پیر کا جسم سے کٹ کر الگ ہونا اس کے لیے ہلاکت ہے لیکن اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے وہ اس ہلاکت کو محسوس کرنے سے بالعموم قاصر رہتا ہے جس میں وہ خدا سے الگ ہو کر مبتلا ہوتا ہے۔

اخلاق انسان کے لیے کوئی ناخوش گوار بوجھ ہر گز نہیں ہے۔ رنگ و بو پھولوں پر بوجھ نہیں۔ پرندوں کے پر پرندوں کے لیے کبھی بار ثابت نہیں ہوتے بلکہ یہ پر ان کے لیے باعث زینت بھی ہیں اور پرواز میں ان کے مددگار بھی۔ یہی حال پھولوں کے رنگ و بو اور آنکھوں کی پلکوں کا بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بھی حقیقی حسن وخوبی اخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق سے عاری ہو جانے کے بعد انسان کے پاس کوئی قابلِ قدر شے باقی نہیں رہتی۔ اخلاقی مطالبات ہماری فطرت کے اظہار کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

اخلاق درحقیقت ایک عالم گیر اور آفاقی اصول کا نام ہے۔ وہی ہماری باطنی زندگی کا بھی قانون ہے۔ اخلاق ہی ہے جس کے ذریعے سے انسان کی اندرونی زندگی میں توازن اور اس کی انفرادی واجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے۔ یہی وہ آفاقی اصول ہے جس کا مشاہدہ ہم کائنات کے نظام میں بھی کرتے ہیں۔ کائنات کی ساری ہی چیزیں ایک صحیح اور فطری قانون کی

تابع ہیں جس کے پیچھے خدا کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ اس کا اعتراف کرنے پر آج بڑے سے بڑے مفکر بھی اپنے کو مجبور پا رہے ہیں۔ انھیں یہ ماننا پڑا ہے کہ یہ کائنات ایک مشین کے مشابہ ہونے کے بہ جائے ایک ذہن سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مادی تصورِ حیات انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں اپنے شباب پر تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں خود یورپ کے کتنے ہی مفکروں اور سائنس دانوں کو نئے انکشافات اور تحقیقات کے بعد اپنے نظریہ میں تبدیلی کرنی پڑی ہے۔ جے۔ ایس۔ ہالڈ نے (J.S.Haldane) نے لکھا ہے کہ زندگی کے مسئلہ کو طبیعاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا غلط ہے۔ زندگی اور انسان کی ذات (Personality) کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کی محض مادّی تعبیر ممکن نہیں۔[۱]

سائنس نے اب ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں بڑے بڑے سائنس داں یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ شے (Thing) سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ صرف عمل (Action) ہے یا وقوعات (Events) کی عمارت ہے۔[۲] اس سے اس بات کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ یہ کائنات اندھے بہرے مادّے کی تخلیق نہیں بلکہ اس کا منبعِ وجود کوئی ذہن و ارادہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں کائنات خُلقِ رب کا مظہر ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ارادہ واختیار کی دنیا میں اپنے رب کی اطاعت کرے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (ہود)

"بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی کام عدل، حکمت اور حق کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اس نے حق اور خیر کے تحت کائنات کی تخلیق کی ہے۔ ہمارے ارادہ واختیار سے بھی جو چیز مطلوب ہے وہ حق وصداقت کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ انسان کی فلاح اور اس کی کام یابی کا اصل انحصار اس کے ظاہر اور باطن کی درستی پر ہے۔ ظاہر و باطن کو خَلق وخُلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں: فلانٌ حسن الخُلق والخَلق۔ "فلاں کا باطن بھی اچھا ہے اور ظاہر بھی۔" ظاہر کو اگر ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں تو باطن یا روح کا ادراک بصیرت کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہو یا باطن ہر ایک اپنی ایک

---

(۱) Prof. J.S. Haldane in 'The Philosophical Basis of Biology.

(۲) Quoted By IQBAL in his Lectures.

مخصوص ہیئت وصورت پر قائم ہوتا ہے۔ یہ صورت و ہیئت اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ خُلق یا نفس کی ہیئت راسخہ ہی ہے جس سے اعمال وافعال کا صدور ہوتا ہے۔ اگر ہم سے اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا باطن بہتر ہے۔ اسی کو خُلق حَسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ آدمی کے رجحانات، مزاج اور ذوق سے اس کی باطنی صورت و ہیئت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کسی کے ذوق اور رجحان کو اس کے اخلاق و کردار سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ رسکن (Raskin) نے غلط نہیں کہا ہے کہ ذوق حقیقت میں اخلاق کا کوئی جز و یا حصہ نہیں بلکہ ذوق ہی اصل اخلاق ہے۔ کسی کو جانچنے کے لیے پہلا اور آخری سوال جو اس سے کر سکتے ہیں وہ یہی کہ اسے کیا پسند ہے؟ آدمی کی پسند اور ناپسند اس کی غماز ہوتی ہے کہ خود وہ آدمی کیا ہے۔

اخلاقیات کے مطالعہ میں حق، حسن اور خیر (Truth, Beauty and Goodness) کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کا تعلق اصل میں ہمارے علم واحساس اور عمل سے ہے۔ اگر آدمی حق وصداقت کے دریافت کرنے میں ناکام رہا تو حقیقت میں وہ صحیح علم (True knowledge) سے محروم ہے۔ اس کی زندگی اگر ایک جمالیاتی تجربہ میں ڈھل نہ سکی تو اس کی حس کی (Feeling) دنیا ویران ہی رہی۔ اسی طرح اگر وہ ''خیر'' کو سمجھنے میں کامیابی حاصل نہ کرسکا تو عملی لحاظ سے وہ یکسر خاسر قرار پائے گا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ حق وصداقت (Reality) کیا ہے؟ وہ ان چیزوں کو اہمیت دیتا ہے جو حسن وخوبی کی حامل ہوں۔ اسی طرح وہ اس عمل کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں خیر کا پہلو شامل ہو۔ عام مطالعہ میں صرف انسانی اعمال کا مطالعہ ہی اخلاقیات کے تحت کیا جاتا ہے۔ حق وصداقت کے حصول کو فلسفہ کا موضوع قرار دیا گیا ہے۔ اور حسن وخوبی کو جمالیات کا موضوع سمجھا جاتا ہے۔ لیکن زندگی کی ان تینوں قدروں میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر نیک عمل کو علم سے الگ نہیں کرسکتے۔ جو عمل صحیح علم کے مطابق نہ ہو وہ ضلالت ہے۔ سقراط نے کہا ہے:

Virtue is a kind of knowledge.

''نیکی علم ہی کی ایک قسم ہے۔''

سقراط کی مراد یہ ہے کہ اخلاقی فرائض کے نتائج اگر ہم پر پورے طور پر واضح ہوں تو لازماً ہم ان سے بے اعتنائی اختیار نہیں کرسکتے۔ غلط طرزِ عمل خود اپنے خلاف ایک سعی نامشکور

ہے۔ اپنے خلاف کوئی اقدام کر کے کوئی اپنے تحفظ کا فریضہ کیوں کر انجام دے سکتا ہے۔

اخلاقیات سے جمالیات کو بھی الگ نہیں کر سکتے۔ ارسطو کے نظریہ کی رو سے اخلاقی زندگی خود اس کے اپنے جمالیاتی اوصاف کی بنا پر قابلِ قبول ہوتی ہے:

Only beauty is good.

''حسن و جمال کی حامل شے ہی خیر ہے۔''

حسن و جمال کا تعلق محض جسم ہی سے نہیں ہے۔ اخلاقی لحاظ سے بھی بعض چیزیں جمالیاتی (Morally excellent) ہوتی ہیں۔ کانٹ (Kant) کے الفاظ میں وہ ہیرے کی طرح خود اپنی روشنی سے چمک رہی ہوتی ہیں۔ وہ اس شے کی طرح ہوتی ہیں جس کی قدر و قیمت خود اس کے اپنے وجود سے قائم ہوتی ہے۔

خوشی (Pleasure) کا بھی اخلاق سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ صحیح اخلاقی طرزِ عمل سے سچی شادمانی حاصل ہوتی ہے۔ یہ شادمانی محض روحانی نہیں ہوتی بلکہ ذہنی، قلبی اور جمالیاتی بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

Virtue is its own reward and vice is its own punishment.

''نیکی بہ ذات خود اپنی جزا اور بدی بہ ذات خود اپنی سزا ہوتی ہے۔''

اخلاق ہی کے ذریعے سے آدمی کی تکمیل ممکن ہوتی ہے۔ کمال کا حصول اخلاق کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ اور اس طرح کے جن خیالات کا اظہار مفکر شخصیتوں نے کیا ہے ان کے ذریعے سے درحقیقت زندگی ہی کے مختلف پہلوؤں اور قدروں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اخلاق کے ذریعے سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اخلاق زندگی کو ایک فورم (Form) دیتا ہے۔ اخلاقی قدروں کا لحاظ زندگی کے تمام گوشوں میں مطلوب ہے۔

اخلاقیات میں فلاسفروں نے اپنا اولین فرض یہ سمجھا ہے کہ وہ زندگی کا حقیقی منتہا و مقصود دریافت کریں۔ افلاطون اور ارسطو سے لے کر اسپونزا (Spinoza)، کانٹ، ہیگل اور گرین (Green) تک سبھی نے یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ منتہا و مقصود کی تعیین کے بعد انسان کی ذمہ داری خود بہ خود متعین ہو جاتی ہے اور اس کا وجوب اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی منتہا و مقصود کے پس منظر میں انسان کی پوری زندگی اپنا ایک فورم اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مفکروں کو ان کی کاوش نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ وہ یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ زندگی کے مقصود و

منتہا (Ultimate End) کا انسان کی موجودہ حیات سے اتنا قریبی رشتہ ہے کہ موجودہ حیات و وجود کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ زندگی اسی میں داخل و شامل ہے۔ اخلاق کے فلاسفروں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو اس حد تک واضح اور لوگوں کی نگاہوں میں اسے اس درجہ عریاں کر دیں کہ عام انسانی شعور اسے اپنی گرفت میں لے سکے۔

جہاں تک ضابطہ یا قوانین کا مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اخلاق و کردار جب بلند ہو جاتا ہے تو اخلاقی قوانین اور اصول انسان کے لیے اجنبی نہیں رہتے بلکہ وہ اس کے اپنے ہی شعور و احساس کی مرئی صورت ثابت ہوتے ہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنے دل کی گہرائی میں پا رہا ہو اس کے اختیار کرنے کے لیے کسی خارجی قانون اور ضابطہ کے دباؤ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسے قانون اور اصولوں کی پاسداری کا مطالبہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی خود اپنے تئیں خیانت نہ کرے، وہ خود اپنے لیے سچا ہو:

To Thine Yourself Be True.

''تم اپنے تئیں سچے بنو۔''

اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی خود اپنی مخالفت ہے۔

انسانی معاشرہ سے انسان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اپنے سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ مختلف نفوس و افراد سے مل کر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ مثالی شخصیت کا کامل اظہار معاشرہ کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی ذمہ داریوں کو انسانی اخلاق سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اخلاق کا اعلیٰ اور کامل تصور وہی ہے جس میں فرد کی بہبود اور اجتماعی لحاظ سے نوع انسانی کی فلاح کا راز پوشیدہ ہو، جس سے مشکلیں آسان ہوتی ہوں، الجھے ہوئے مسائل کا خاتمہ ہوتا ہو اور ہمارے دل و دماغ کو سکون و راحت حاصل ہوتی ہو۔ اور جس کے ذریعے سے دنیا ظلم و فساد سے پاک ہو سکتی ہو۔ برفو (Briffaultt) کا ذہن اس طرف گیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی عظیم الشان عمارت آپ تعمیر کریں اگر وہ باطل کو مٹا کر اس کی جگہ حق کو قائم کرنے سے قاصر ہے تو وہ بے معنی چیز ہے۔ اس اوپری عمارت کو اخلاقیات کی عمارت نہیں کہا جا سکتا[۱]''

اخلاق کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تذکرے کے بعد یہ سوال باقی رہتا ہے

---

(۱) The Making of Humanity

کہ انسان اخلاقی نظام فکر و عمل کے لیے ایسے واضح ضوابط اور قوانین کہاں سے اخذ کرے جو سب کے لیے واجب الاطاعت ہوں۔ جس کے صحیح اور اعلیٰ نظام و اخلاق ہونے میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ انسانی علوم میں باضابطگی واضح ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں اور نہ اس کے بغیر انسانی فکر کو انتشار و تلون سے بچایا جا سکتا ہے۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف مذہب کے پاس ہے، انسانی فکر کے سامنے اخلاق کے فطری تقاضے تو ابھر سکتے ہیں لیکن مذہب کے تعاون کے بغیر مکمل اور قابل اعتماد ضابطۂ اخلاق ترتیب دینے سے وہ یکسر قاصر ہے۔ مذہب کے علاوہ دوسرے ذرائع خواہ وہ نفسیات و وجدان ہو یا تجربات و احساسات، اصل ماخذ کے صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ اصل ماخذ کی حیثیت ان کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ محض جزوی صداقتوں کے علم سے ایک اعلیٰ اور محکم نظام اخلاق کی تشکیل کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔ ایک قطعی اور واجب الاطاعت قانون کی ضرورت کا احساس تو کانٹ کو بھی ہوا ہے لیکن وہ اس کی کوئی واضح تشریح کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔

اخلاق کے سلسلے میں خیر و شر کے صحیح تصور کا سوال سامنے آتا ہے۔ لیکن اس کے حل کرنے میں ہمارا تجرباتی اور وجدانی علم ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ عقل اس معاملے میں دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔ اخلاق کی پشتیبان قوت اور داعیات و محرکات کے بارے میں انسانی فکر نے جو چیزیں تجویز کی ہیں ان کی نفی نہیں کی جا سکتی لیکن مذہب کی رہ نمائی نہ ہو تو ان چیزوں کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اور نہ انھیں کوئی محکم بنیاد میسر آتی ہے۔

اس سلسلے میں جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں جو کامل، مستند اور خدا کی طرف سے آیا ہوا آخری دین ہے تو ہمیں ان سارے ہی سوالات کا کافی و شافی جواب مل جاتا ہے جو اخلاقیات کے مطالعہ میں ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہم کو خیر و شر، نیک و بد، صحیح اور غلط کا واضح علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں صاف الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت اور کتاب الٰہی ہے۔ خدا نے جو قانون اخلاق عطا فرمایا ہے اس کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے یہی بنیاد کافی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ انسان کے لیے جس منتہا و مقصود کی ضرورت ہے وہ خدا کی ذات اور رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی۔ خدا کی ذات ہی وہ نفس اعلیٰ اور کامل ترین ذات ہے جو نفس انسانی کا ملجا و ماویٰ قرار پاتی ہے۔ اگر خدا کی ہستی کے سوا کسی اور شے کو ہم منشائے حیات اور غایت ہستی قرار دیتے ہیں تو یہ حق کے خلاف اور

نفس انسانی پر ظلم ہوگا۔ نفس انسانی کو جیسا کہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے دوسری تمام اشیاء کے مقابلے میں فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس لیے اس کا مقصود کوئی ایسی چیز ہرگز نہیں ہوسکتی جو شخصیت (Personality) کے وصف سے عاری ہو۔ اس لیے لازمی طور پر انسان کے جذبات و احساسات اور اس کی سعی و جہد کا رخ خدا ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تارے آسمان میں دیر تک چمکتے ہیں۔ چاند ہماری تاریک راتوں کو منور کرتا ہے اور سورج سے روشنی و تمازت حاصل ہوتی ہے، لیکن ہمارے دل کے نہاں خانے کے لیے ان کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے اور نہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی امنگوں کے لیے ان کے پاس کوئی گرمی ہے۔ کائنات میں جو بھی ہے خدا کا دست نگر اور محتاج ہے اس لیے اس کے سوا کوئی نہیں جو ہماری زندگی اور ہماری تگ ودو کا اصل محور و مرکز قرار پاسکے۔

انسان کے لیے واضح فلاح اور خیر کی بات یہ ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جس سے وہ دنیا میں دوچار ہے۔ جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار ہو وہی درست ہے اور جو طرز عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار نہ ہوسکے بلکہ اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو وہ غلط ہے۔ خدا کی ہدایت ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ خدا کی محبت، اس کی رضا اور خوش نودی کی طلب اور اس کی ناراضی سے بچنے کی فکر اخلاق کی پابندیوں اور برے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک ہے۔ خدا شناس افراد سے مل کر جو سوسائٹی اور صالح ریاست وجود میں آتی ہے جس کی تشکیل خدا کے دیے ہوئے قانون کی روشنی میں ہوتی ہے اس کے اندر خود خدائی نظامِ اخلاق کے قیام کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر قانون کی پابندی پر آمادہ کرنے کے لیے فرض شناسی کا احساس بھی پورے طور پر کام کرنے لگتا ہے اور حق سے محبت اور باطل سے نفرت کا جذبہ بھی اس سلسلے میں محرک کا کام کرتا ہے۔

اسلام جزوی سچائیوں کی نفی ہرگز نہیں کرتا وہ سب کی سب اسلام کے اخلاقی نظام میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ بہ جائے اس کے کہ وہ منتشر اجزاء کی شکل میں یا ناقص حالتوں میں موجود ہوں اسلام انھیں محکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسلام حصولِ کمال کی خواہش کو جسے فکر انسانی کی نظر میں ایک اخلاقی محرک کی حیثیت حاصل ہے رد نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام نے اس کی اہمیت کی تصدیق کی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۙ وَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ

(الاعلیٰ:۱-۵)

”اپنے خدائے برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے خاکہ بنایا تو تناسب بھی قائم کیا اور جس نے مقدر کیا تو رہ نمائی بھی فرمائی اور جس نے سبزہ اگایا تو اسے گھنا اور سرسبز و شاداب بھی کیا۔“

مطلب یہ ہے کہ خدا نے پیدا ہی نہیں کیا، اچھی ساخت بھی عطا کی۔ پھر اس نے اچھی ساخت اور حسن فطرت ہی نہیں بخشی بلکہ مقصود و غایت کی طرف رہ نمائی بھی فرمائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمین میں سبزہ اور گھاس اگاتا ہے اور اس میں جو صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں انھیں ابھارنے اور ترقی دینے کا نظم بھی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ننھے ننھے انکھوے بڑھ کر نہایت گھنے، شاداب اور خوش نما درخت ہو جاتے ہیں۔ اس قانون سے انسان کی زندگی الگ نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو صرف زندگی ہی نہیں عطا کی بلکہ وجود دے کر اس نے اسے اس کے مقصدِ وجود کا علم بھی بخشا۔ وہ انسان کو اس راہ کی طرف رہ نمائی فرماتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو پا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اسلام ہماری زندگی کے نازک سے نازک پہلوؤں کا محافظ ہی نہیں ہے بلکہ وہ ان کو درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پامال کر دے اور تکمیل سے اسے محروم رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا ۙ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا ؕ (الشمس:۹،۱۰)

”کام یاب ہو گیا جس نے اسے (اپنے نفس کو) نکھارا۔ اور ناکام ہوا جس نے اسے دبایا اور خراب کیا۔“

انسان کی تکمیل حقیقت میں اپنے رب کی طرف بڑھنے ہی سے ہوتی ہے، خدا سے بے نیاز و بے گانہ ہو کر انسان پستی میں جا گرتا ہے اور کام یابی کے بلند مرتبے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اسلام نے اس کی پوری وضاحت کر دی ہے کہ انسان اپنی تکمیل کے لیے دنیا کے آزمائشی دور میں کون سا طرز عمل اختیار کرے۔ اس سلسلے میں اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس سے فرد ہی نہیں، جماعت، قوم اور پوری انسانیت ترقی کی طرف بڑھ سکتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کی تکمیل میں مزاحم ہونے کے بہ جائے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں اس خوشی (Pleasure) کی بھی نفی نہیں کی گئی ہے جس کا ذکر اخلاق کے مفکرین کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ خدا کی رضا کی طلب اور اس کے لیے سعی و جہد اور اس کے دیے ہوئے قانون کی پیروی بہ ذات خود سب سے بڑی خوشی کی چیز ہے۔ اسلام ذہن و دماغ اور دل کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ انسان کے سارے ہی جذبات اور اس کی خواہشات کا احترام کرتا ہے۔ البتہ وہ اسی خوشی کو سند جواز عطا کرتا ہے جو فطری اور احکام خدا کے تحت ہو۔ اخلاقی فرائض کی انجام دہی میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے اسے تو اسلام نے دین و ایمان کی علامت تک قرار دیا ہے۔ چنانچہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے:

اِذْ سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَ سَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔

(احمد)

''جب تمھیں اپنے اچھے کام سے خوشی ہو اور اپنے برے کام سے تکلیف اور افسوس ہو تو تم مومن ہو۔''

خوشی خواہ ذہنی ہو یا روحانی اور جمالیاتی اگر اس خوشی اور دینی قدروں کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو تو وہ معتبر ہے۔ اسلامی نظام حیات میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد کی خوشی اور جماعت اور پوری انسانیت کی خوشیوں کے درمیان کوئی تضاد و تصادم پیدا نہ ہو۔

خدائی ہدایت کے ذریعے سے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہی اصل علم ہے۔ دوسرے علوم خواہ وہ تجرباتی ہوں یا وجدانی ان کی حیثیت اصل علم کے شواہد کی ہے، اخلاقیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ قوانینِ حیات، عقل و وجدان اور انسان کے تجربات سب کے سب خدائی ہدایت کے حق اور خیر ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اصل معیار خدا کی ہدایت ہے۔ حکماء کی تجویز کردہ چیزوں کی اس سے نفی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ان کی تصحیح و تکمیل ہوتی ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز غلط حدود میں پہنچ گئی ہے تو خدا کی ہدایت میں اسے ایک جامع نظام کے اندر اس کے اپنے ٹھیک مقام پر رکھا گیا ہے۔

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ اسلام میں اخلاق صرف جنت اور دوزخ کے تصور پر مبنی ہے۔ جنت اور دوزخ کا تصور اخلاق کی اصل اساس نہیں ہیں بلکہ یہ اخلاق کے آخری نتائج ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ کسی کا مال ہڑپ کرو گے تو جیل جانا

پڑے گا تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کام کی برائی قید خانہ پر مبنی ہے۔ خود اس فعل میں کوئی برائی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی سے کہا جائے کہ سچائی اختیار کرنے والے کو سوسائٹی میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہو سکتا ہے کہ سچائی کی اساس مقامِ عزت کا حصول ہے، سچائی اپنے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔

قرآن حکیم نے خیر و شر کا ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس کی بلندیوں کا تصور بھی عام ذہن نہیں کرسکتا۔ قرآن خیر کو ''معروف'' کہتا ہے یعنی اس کے نزدیک خیر وہ ہے جس سے انسان کی فطرت مانوس ہے۔ جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جسے وہ پہچانتی ہے۔ شر کو قرآن ''منکر'' کہتا ہے، یعنی شر اس کے نزدیک وہ ہے جس سے انسان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ جو انسانی فطرت کے لیے اجنبی ہے۔ جس کو وہ جانتی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں نیکی و بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک نیکی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلا جائے۔ مطلوب یہ ہے کہ آدمی ترقی کر کے اس مرتبے کو پالے جہاں دین کی کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف نظر نہ آئے۔ سب کچھ اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو۔ جنت کی تعریف میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝

(حٰمٓ السجدہ: ۳۱)

''تمھارے لیے وہاں وہ سبھی کچھ ہے جو تمھارا جی چاہے اور وہاں تمھارے لیے وہ سبھی کچھ ہے جس کی طلب تمھارے اندر ہو۔''

اسلامی نقطۂ نظر سے فطرت کے خلاف عمل کرنے کا نام بدی ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی تنزل اور گراوٹ کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی چیز مرغوب و پسندیدہ نہ پائی جائے۔ جو کچھ بھی ہو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ جہنم ایک ایسا ہی مقام ہے جس تک آدمی کو اس کی اخلاقی گراوٹ ہی پہنچاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی اصل بنیاد انسان کی اپنی فطرت کی پہچان اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اخلاق کوئی خارجی شے نہیں بلکہ وہ فطرت انسانی کا صحیح اظہار ہے۔ انسان اگر اپنے حقیقی جذبات و احساسات کو پہچان لے تو اخلاقی تقاضے اس کے اپنے دل کی امنگوں سے مختلف کوئی چیز نہیں ہیں۔ جب تک انسان اپنی حقیقی فطرت سے آشنا نہیں ہوتا وہ برائی سے خواہ بچ بھی جائے مگر اس کے دل و دماغ بہ دستور گنہ گار رہیں گے۔

آدمی کی جیسی شخصیت ہوتی ہے اس سے اعمال کا صدور بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ کسی عمل کے پیچھے صرف جبلّی تحریک (Motive) ہی کا دخل نہیں ہوتا اس میں اس کا ذہن وفکر اور اس کی عقل بھی کام کرتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے آئیڈیل اور مقصدِ حیات کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے جس کو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اخلاق وکردار زندگی کا کچھ حصہ یا آرنلڈ (Mathew Arnold) کے خیال کے مطابق تین چوتھائی ہی نہیں ہوتا بلکہ فطری طور پر وہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی غیبی چیزیں بھی اخلاق کے لیے محرکات کا کام کرتی ہیں جن کا احساس عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوتا۔ آدمی جب اپنی زندگی کو عالم غیب و بسیط سے جو عالمِ حقیقت ہے ہم آہنگ کر لیتا ہے تو خدا کی طرف سے اسے تائید و مدد حاصل ہونے لگتی ہے۔ اسے علم وحکمت سے نوازا جاتا ہے۔ اسے طمانینت اور سکینت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتے بھی اس کے دل میں نیک خیالات و احساسات القا کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ خدا کی ایک اعلیٰ اور معصوم مخلوق کی معیت بھی اسے حاصل ہے۔

انسانی حیات میں اخلاق کا نمایاں اظہار حقوق کی ادائے گی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان پر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اس کے خالق و مالک خدا کا ہے۔ خدا کے حقوق کے ادا کرنے میں اس کی عبادت، پرستش، اطاعت وغیرہ ساری ہی چیزیں داخل ہیں۔ خدا کے بعد بندگان خدا کے حقوق ہیں جن سے اس کے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ خدا کے بندوں میں سب سے نمایاں حق والدین کا ہوتا ہے کیوں کہ والدین سے انسان کا تعلق انتہائی قریبی اور گہرا ہوتا ہے۔ پھر درجہ بہ درجہ دوسرے لوگوں کے حقوق سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ تفصیل قرآن کی اس آیت میں ملتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ ۝

(النساء: ۳۶)

’’اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، والدین، قرابت داروں،

یتیموں، مسکینوں، پڑوسی رشتے دار، اجنبی ہم سایہ، پہلو کے ساتھی، مسافر اور جو تمھارے
زیر دست ہوں سب کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ بلاشبہ اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں
کرتا جو مغرور اور ڈینگیں مارتا ہو۔"

اس آیت میں والدین، اعزہ اور دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیتے ہوئے خدا کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح والدین، رشتہ داروں وغیرہ کے ساتھ نیک برتاؤ انسان کے لیے ایک اخلاقی اور فطری بات ہے ٹھیک اسی طرح خدا کی اطاعت و بندگی کا مطالبہ بھی ایک فطری مطالبہ ہے جس کا اخلاق انسانی سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں طرح کے حقوق کے ادا کرنے میں ایک ہی بنیادی اخلاقی اصول کام کرتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے صرفِ نظر کرنا اس بنیادی اصول کی تردید کے ہم معنی ہے اور اس سے انسان خود اپنے اخلاق و کردار کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے۔ بنیادی اخلاقی اصول زندگی کے تمام ہی شعبوں میں کام کرتا ہے خواہ زندگی کا سیاسی شعبہ ہو یا معاشی۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اخلاقی فرائض کو ادا کرنے میں محض کسی خارجی قانون کی پیروی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ آدمی کا کوئی ایسا ایثار ہے جو کسی اجنبی (Alien) طاقت کے لیے ہو بلکہ یہ تو ان اجزائے حیات کی فطرت کے ساتھ ہمارے محض ہم آہنگ ہوجانے کا اظہار ہے جن سے انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ چنانچہ افلاطون (Plato) نے کہا ہے:

> Virtue will be a kind of health and beauty and good habit of the soul; and vice will be a Disease and Deformity and Sickness of it.

"نیکی کو صحت اور حسن کی ایک قسم اور روح کی ایک اچھی فطرت کہا جائے گا اور گناہ کو
مرض اور روح کا بگاڑ اور اس کی بیماری قرار دیں گے[1]"

سچ ہے، نیکی کی تلاش اور گناہوں سے اجتناب بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی صحت کا طالب اور بیماری سے بچنے کی کوشش کررہا ہو۔

☙❧

(۱) G. Lowes Dicknson

اخلاقیات

اسلام میں اخلاق کی اہمیت

﴿۱﴾ عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ بَعَثَنِیْ لِتَمَامِ مَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ وَ کَمَالِ مَحَاسِنِ الْاَفْعَالِ۔ (شرح السنۃ)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے مجھے اخلاقی خوبیوں اور اچھے کاموں کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے۔''

تشریح: مؤطا امام مالک کی ایک روایت ہے: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ۔ ''مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کروں۔'' مسند احمد میں یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات میں ملتی ہے۔

ان احادیث میں نبی ﷺ نے ایک بڑی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ میری بعثت کی اصل غرض و غایت اخلاق و اعمال کے مکارم و محاسن کی تکمیل ہے۔ اخلاق درحقیقت فطری جذبات و احساسات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ ایک غیر مرئی شے ہے۔ جس کا اظہار آدمی کے مختلف اعمال و افعال کے ذریعہ سے ہوتا رہتا ہے۔ ارادہ و اختیار اور جذبات و احساسات کے صحیح اور بہترین استعمال سے اس زندگی کی نمود ہوتی ہے جس کو ہم مثالی اور پسندیدہ زندگی کہتے ہیں۔ نبی ﷺ کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ آپؐ نے انسانی زندگی کو مختلف اکائیوں میں تقسیم کرنے کے بہ جائے اسے ایک 'کُل' قرار دیا۔ اور زندگی کے ہر پہلو اور اس کے ہر شعبہ سے متعلق خواہ اس کا تعلق معاشرت و معیشت سے ہو یا حکومت و سیاست سے، اخلاق کے صحیح اصول و ضوابط بیان فرمائے۔ انھیں عملاً زندگی میں برت کر دکھایا اور ان ہی اصولوں پر سوسائٹی اور ریاست کا نظام قائم فرمایا۔

آپؐ کے اس ارشاد سے کہ ''میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں'' انسانی زندگی کی ایک صحیح اور بہترین تعبیر ملتی ہے۔ آپؐ نے اخلاق کو فرسودہ اور محدود تصوّر سے پاک کر کے اسے وسیع تر مفہوم بخشا اور اس کو آفاقیت عطا فرمائی۔ یہاں تک کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی حصہ بھی اخلاق سے الگ اور آزاد نہ رہا۔ اور زندگی اس اصول وضابطہ سے ہم آہنگ ہوگئی جو اصول وضابطہ ہم کو کائنات میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اور جس کی اصل روح قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (التغابن:۱)

''اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور اسے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔''

〈۲〉 وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سب سے زیادہ مجھے وہ لوگ محبوب ہیں جو تم میں اخلاق کے لحاظ سے سب سے اچھے ہیں۔''

تشریح: ترمذی میں حضرت جابرؓ سے ایک روایت آئی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ وَ اَقْرَبِكُمْ مِّنِّىْ مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا وَ اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَيَّ وَ اَبْعَدَكُمْ مِّنِّىْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَيْهِقُوْنَ۔ ''تم میں سب سے زیادہ مجھے وہ لوگ محبوب ہیں اور قیامت کے دن ان ہی کی نشست بھی مجھ سے زیادہ قریب ہوگی جو تم میں اخلاق کے لحاظ سے سب سے اچھے ہیں۔ اور تم میں سب سے زیادہ ناپسند وہ لوگ ہیں اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے دور رہنے والے وہ لوگ ہیں جو زیادہ باتیں بنانے والے، چرب زبان اور تصنع سے بات کرنے والے متکبر ہیں۔''

انسان حقیقت میں ایک اخلاقی وجود ہے۔ اس کے اچھے یا برے ہونے کا اصل پیمانہ اخلاق ہی ہے۔ رسولِ خدا (ﷺ) کا قربِ خاص اور محبت ان ہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو اخلاقی

اعتبار سے بہتر اور فائق تر ہوں گے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ آپؐ کی محبت اور قرب کامیابی کی نمایاں علامت ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جو اخلاق کے لحاظ سے تم میں سب سے اچھے ہیں۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ زندگی کی قدر و قیمت متعین کرنے میں اصل فیصلہ کن چیز اخلاق ہے۔ اس لیے مبارک ہیں وہ لوگ جو اخلاقی لحاظ سے اپنے کو بہتر سے بہتر حالت میں دیکھنے کی تمنا دل میں رکھتے ہیں۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ رَجُلٍ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَ: قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا خَيْرُ مَا اُعْطِيَ الْاِنْسَانُ؟ قَالَ: اَلْخُلُقُ الْحَسَنُ۔ (بیہقی فی شعب الایمان، بغوی فی شرح السنۃ عن اسامۃ بن شریک)

ترجمہ: مزینہ قبیلہ کے ایک شخص سے روایت ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، انسان کو جو کچھ عطا ہوا ہے اس میں سب سے بہتر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''حسنِ اخلاق۔''

تشریح: حسن اخلاق اپنے ظاہر اور نتائج کے لحاظ سے خدا کی ایک بڑی عطا ہے۔ حسن اخلاق میں جو جاذبیت اور حسن پایا جاتا ہے اس کا کسی اور شے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق میں جو قوت اور اثر ہے وہ کسی کرامت (Miracle) میں بھی نہیں ہے۔ اخلاق سے دشمنوں کے دل بھی مفتوح ہو جاتے ہیں۔ ایک داعی کی زندگی میں تو اخلاق کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ نبی (ﷺ) کی شفقت اور نرم دلی کو قرآن نے خدا کی رحمت قرار دیا ہے۔ کارِ نبوت کے انجام دینے میں اس اخلاقی وصف کی جو اہمیت ہے اس پر بھی قرآن نے روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد ہوا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج (آل عمران: ۱۵۹)'' (اے نبیؐ) یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لیے نرم مزاج ہو۔ اگر کہیں تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب

تمھارے پاس سے چھٹ جاتے۔ تم انھیں معاف کردو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور دین کے کام میں انھیں بھی شریک مشورہ رکھو۔"

〈۵〉 وَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَ صَائِمِ النَّهَارِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "مومن اپنے حسنِ اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات میں (اللہ کے حضور میں) کھڑے رہتے ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ حسن اخلاق ایک ایسا مطلوب وصف ہے جس سے بہت سی چیزوں کی تلافی ممکن ہے۔ یہاں تک کہ اپنے اخلاق کے ذریعہ سے آدمی اس شخص کے درجہ اور مقام کو بھی حاصل کر لیتا ہے جو راتوں میں خدا کی عبادت کرتا اور دن میں روزہ رکھتا ہے۔ با اخلاق مومن حقیقت کی نگاہ میں ہمیشہ خدا کی اطاعت و بندگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کی روح کی پاکیزگی اور اس کی طبیعت کی صالحیت اسے ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی روحانیت اور کردار کے اعلیٰ مقام سے جوڑے رکھتی ہے۔

〈۶〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ اَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ؟ فَقَالَ: تَقْوَى اللّٰهِ، وَ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَ سُئِلَ عَنْ اَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّارَ؟ فَقَالَ: اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اکثر لوگ کس وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: "تقویٰ اور حسن اخلاق کے سبب۔" آپؐ سے پوچھا گیا کہ اکثر لوگ کس وجہ سے دوزخ میں جائیں گے؟ فرمایا: "زبان اور شرم گاہ کے سبب۔"

تشریح: جنت میں اکثر لوگ اپنے حسن اخلاق اور خدا ترسی کی وجہ سے جائیں گے۔ زبان اور شرم گاہ کی عدم حفاظت اور ان گناہوں کے سبب جو ان دونوں سے تعلق رکھتے ہیں اکثر لوگ دوزخ میں داخل کیے جائیں گے۔ جو لوگ زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کا خیال رکھیں گے امید ہے کہ ان کی پوری زندگی ستھری اور پاک ہوگی۔

〈۷〉 وَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَ هُوَ بَاطِلٌ

بُنِیَ لَهٗ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّةِ وَ مَنْ تَرَکَ الْمِرَاءَ وَ هُوَ مُحِقٌّ بُنِیَ لَهٗ فِیْ وَسَطِ الْجَنَّةِ وَ مَنْ حَسَّنَ خُلُقَهٗ بُنِیَ لَهٗ فِیْ اَعْلَاهَا۔ (ترمذی، شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا جب کہ وہ بے کار اور لغو (یعنی لائق ترک) ہی ہے اس کے لیے جنت کے (اندر) کنارے کی جگہ مکان بنایا جائے گا اور جس کسی نے جھگڑنا ترک کر دیا حالاں کہ وہ حق پر تھا اس کے لیے جنت کے وسط میں مکان تعمیر ہوگا اور جس نے اپنے اخلاق کو بہتر بنالیا اس کے لیے جنت کی بلندیوں پر مکان تعمیر کیا جائے گا۔''

تشریح: اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کو زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جن لوگوں کی زندگی حسن اخلاق سے مزین ہوگی انھیں جنت کے اعلیٰ طبقہ میں جگہ حاصل ہوگی اس لیے کہ حقیقت کی نگاہ میں اعلیٰ درجہ کے لوگ وہی ہو سکتے ہیں جو اخلاق کے لحاظ سے بہتر ہوں۔

〈۸〉 وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت کے روز مومن کی میزان میں جو سب سے وزنی چیز رکھی جائے گی وہ حسن اخلاق ہے۔''

تشریح: حسنِ اخلاق چوں کہ زندگی کا حقیقی حسن اور اصل انسانی کردار ہے اس لیے یہ فطری بات ہے کہ میزان عمل میں سب سے زیادہ اسی کا وزن ہوگا۔ آدمی کی پہچان اس سے ہرگز نہیں ہوتی کہ اس کے پاس کیا سروسامان ہے بلکہ آدمی کی اصل پہچان اس سے ہوتی ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ خدا کے یہاں اصل سوال اس کا نہیں ہوگا کہ انسان نے دنیا میں کتنی دولت جمع کی اور کتنی شہرت حاصل کی بلکہ اصل سوال یہ ہوگا کہ وہ خدا کے پاس کیسی شخصیت لے کر حاضر ہوا ہے۔ شخصیت کی تعمیر آدمی کے افکار و اعمال اور اخلاق ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ آدمی اگر اخلاق کے لحاظ سے پست ہے تو خواہ وہ دنیا کا سب سے دولت مند اور ذی اقتدار شخص ہو حقیقت میں وہ ایک مفلس اور ذلیل وجود ہے۔

〈۹〉 وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَا اَبَا ذَرٍّ لَا عَقْلَ کَالتَّدْبِیْرِ وَلَا

وَرَعَ كَالْكَفِّ وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔ (البیہقی)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہ تدبیر کے مثل کوئی عقل ہے اور نہ ورع (اجتناب و احتیاط) کے مثل کوئی تقویٰ اور نہ خوش خلقی کے مثل کوئی حسب پایا جاتا ہے۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ اس عقل کے مانند کوئی عقل نہیں جس کے ساتھ تدبیر ہو یعنی آدمی انجام کار پر نظر رکھے اور مفاسد سے بے خبر نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عقل سے کام تو لیتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ انجام کار کو دیکھ سکے تو اس کی عقل اور دانش وری اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔

دین میں امتثال اوامر اور نواہی سے اجتناب دونوں ضروری ہیں لیکن بعض اعتبار سے ممنوعات سے اجتناب کی اہمیت امتثال اوامر سے بڑھ کر ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بیماری کی حالت میں دوا کے مقابلہ میں پرہیز کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل اور حقیقی فضیلت اور شرف کی چیز خوش خلقی ہے۔ اگر یہ نہیں تو سب کچھ لاحاصل ہے۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ تو نے میری پیدائش کو حسن و خوبی سے نوازا، پس میرے اخلاق کو بھی حسن و خوبی عطا کر۔''

تشریح: یعنی جس طرح تو نے میرے ظاہر کو بہتر بنایا ہے اسی طرح مجھے باطنی اور اخلاقی حسن و خوبی بھی عطا کر۔ اخلاقی اوصاف کے بغیر انسان کے ظاہری وجود کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

﴿۱۱﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: خِيَارُكُمْ اَطْوَلُكُمْ اَعْمَارًا وَ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔

(احمد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں یہ نہ بتاؤں کہ تم میں بہتر لوگ کون ہیں'' لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپ ضرور بتائیں

اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: ”تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جن کی عمریں دراز اور جن کے اخلاق اچھے ہیں۔“

تشریح: عمر اگر لمبی ہے تو آدمی کو اس کے مواقع بھی زیادہ میسر ہوتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیک کام اور خدا کی اطاعت اور بندگی کر سکے۔

انسانی اخلاق

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا النَّاسُ كَالْاِبِلِ الْمِأَةِ لَا تَكَادُ تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لوگ ان سَو اونٹوں کے مانند ہیں جن میں مشکل ہی سے تم کسی کو سواری کے قابل پاسکو۔“

تشریح: یعنی جس طرح اونٹوں کی ایک کثیر تعداد میں اپنے مطلب کا اونٹ آسانی سے نہیں ملتا ٹھیک یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ معیاری اور انسانی اوصاف و کمالات کے حامل لوگ کم ہی ملتے ہیں۔ یہ حقیقت اگر ہمارے پیش نظر رہے تو ہم اس صورتِ حال سے کبھی بددل اور مایوس نہیں ہوں گے کہ زیادہ سے زیادہ اچھے اور بھروسے کے لوگ کیوں نہیں ملتے۔ ایسے لوگ ہوتے ہی کم ہیں۔ لیکن اگر کچھ تھوڑے افراد بھی معیاری قسم کے میسر آجائیں تو وہ ایک بڑی اکثریت پر بھاری ہوں گے۔ ان کے ذریعہ سے بڑے سے بڑا کارنامہ انجام پاسکتا ہے۔ تاریخ انسانی بھی ہمیں یہی بتاتی ہے۔

انسانی اخلاق اور انسانی صلاحیتوں کو اسلام کے ذریعہ جلا ملتی ہے۔ اسلام کی روشنی میں وہ چمک اٹھتے ہیں۔ انسان کے اندر جو بھی خوبیاں اور صلاحیتیں پائی جاتی ہیں ان کے صحیح استعمال سے ہی وہ کامیابی کے بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

اس حدیث سے نبی (ﷺ) کی حقیقت پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ مومن کا فرض ہے کہ وہ دنیا میں حقائق سے صرف نظر کر کے ہرگز زندگی نہ گزارے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَكْرَمُ النَّاسِ؟ قَالَ: اَتْقَاهُمْ۔ فَقَالُوْا: لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْأَلُكَ۔ قَالَ: فَيُوْسُفُ نَبِیُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِیِّ اللّٰهِ ابْنِ نَبِیِّ

اللّٰہِ ابْنِ خَلِیْلِ اللّٰہِ۔ قَالُوْا: لَیْسَ عَنْ ھٰذا نَسْئَلُکَ۔ فَقَالَ: فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْأَلُوْنَ خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِھُوْا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے معزز اور بزرگ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”جوان میں سب سے زیادہ متقی ہو۔“ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم آپؐ سے یہ بات نہیں پوچھتے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”سب سے زیادہ معزز یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ ہیں۔“ لوگوں نے کہا کہ ہم آپؐ سے یہ نہیں پوچھتے۔ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا تم معادنِ عرب کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ ان میں جو جاہلیت میں بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ہیں بہ شرطے کہ (دین میں) سمجھ حاصل کرلیں۔“

تشریح: انسانوں کی مثال معدنیات کی ہے۔ جس طرح معادن میں مختلف قسم کی معدنیات ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ لوہا، کوئلہ وغیرہ کے علاوہ سونے اور چاندی کی کانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ جہاں ایک طرف بہترین اور قابل قدر انسان ہمیں ملتے ہیں وہیں ایسے لوگوں سے بھی اکثر سابقہ پیش آتا ہے کہ انسانیت کا سر ندامت سے جھک جائے۔

جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں جرأت مند، بہادر، ایثار پیشہ، باحوصلہ، عالی ظرف اور زندہ دل یعنی انسانی خوبیوں کے حامل تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ بہ شرطے کہ اسلام کی صحیح معرفت انھیں حاصل ہو جائے۔ پست اور بے حوصلہ قسم کے لوگ نہ جاہلیت اور باطل کے کام کے ہوتے ہیں اور نہ اسلام کی سربلندی اور انسانیت کی خدمت میں ان کا کوئی خاص حصہ ہو سکتا ہے۔

(۳) وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ تَجِدُوْنَ النَّاسَ مَعَادِنَ خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِھُوْا وَ تَجِدُوْنَ خَیْرَ النَّاسِ فِیْ ھٰذَا الشَّاْنِ اَشَدَّھُمْ لَہٗ کَرَاھِیَۃً وَ تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ ذَا الْوَجْھَیْنِ الَّذِیْ یَاْتِیْ ھٰٓؤُلَآءِ بِوَجْہٍ وَ یَاْتِیْ ھٰٓؤُلَآءِ بِوَجْہٍ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”تم

لوگوں کو معادن (معدنیات کی کانوں) کے مانند پاؤ گے۔ ان میں جو جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں، بہ شرطے کہ وہ (دین میں) سمجھ حاصل کرلیں۔ اور تم اس معاملہ (اسلام) میں لوگوں میں سب سے بہتر اس کو پاؤ گے جس کو اس سے سب سے زیادہ نفرت تھی۔ اور تم لوگوں میں سب سے بُرا اسے پاؤ گے جس کے دو رُخ ہوں۔ اِن لوگوں کے پاس جاتا ہو تو ایک منہ کے ساتھ اور اُن کے پاس پہنچتا ہو تو دوسرے منہ کے ساتھ۔"

تشریح: حالتِ کفر میں جسے اسلام سے سخت نفرت اور دشمنی تھی اور اسلام کو مٹانے کی کوشش میں جو شخص پیش پیش رہا ہے وہی ایمان لانے کے بعد اسلام کی محبت میں سب سے زیادہ بے خود و سرشار دکھائی دیتا ہے اور اس سے اسلام کی عظیم خدمات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ جس شخص کے اندر دشمنی کی طاقت نہ ہو اس کے اندر دوستی کی صلاحیت کہاں سے آجائے گی۔

دورُخا پن جس کی وضاحت اس حدیث میں کی گئی ہے پستیِ کردار کی انتہائی گھناؤنی اور قبیح حالت ہے۔ جو شخص اخلاق و کردار کی اس پستی تک پہنچ گیا ہو سمجھیے وہ سماج میں ایک انتہائی مکروہ وجود ہے، اس سے فتنہ و شر کے سوا کسی دوسری چیز کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح کے لوگوں کی ساری تگ و دو کے پیچھے فریب کاری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ پست اور بے حوصلہ قسم کے لوگ نہ جاہلیت اور باطل کے کام کے ہوتے ہیں اور نہ اسلام کی سربلندی اور انسانیت کی خدمت میں ان کا کوئی خاص حصہ ہوسکتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ مُّعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ اَنَّهٗ قَالَ: اٰخِرُ مَآ اَوْصَانِیْ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حِیْنَ وَضَعْتُ رِجْلِیْ فِی الْغَرْزِ اَنْ قَالَ لِیْ: اَحْسِنْ خُلُقَکَ لِلنَّاسِ یَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ۔ (مؤطا امام مالک)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آخری وصیت جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے کی جب کہ میں رکاب میں پاؤں رکھنے لگا تھا وہ یہ تھی:

"اے معاذ بن جبل! اپنے اخلاق کو لوگوں کے لیے بہتر رکھنا۔"

تشریح: یعنی لوگوں کے ساتھ تمھارا رویہ اعلیٰ اخلاق کے تحت ہو۔ مومن کی حیثیت ہمیشہ ایک

ذمہ دار کی ہوتی ہے۔ اسے اپنی مومنانہ ذمہ داریوں سے کسی حالت میں بھی سبک دوش قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اخلاق کا تعلق ایمان سے

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَ خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآئِهِمْ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اہل ایمان میں ایمان کے لحاظ سے سب سے کامل شخص وہ ہے جو ان میں اخلاق کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔ اور تم میں اچھا وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے اچھا ہو۔“

تشریح: اس حدیث سے واضح ہے کہ ایمان اور اخلاق میں گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ مومن کے اخلاق اور اس کی عملی زندگی میں درحقیقت اس کے ایمان و یقین ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ آدمی کا ایمان اگر کامل اور قوی ہوگا تو لازماً اس کے اخلاق بھی سب سے اچھے ہوں گے۔ آدمی کے اچھے ہونے کی نمایاں علامت یہ ہے کہ اس کا سلوک اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا ہو۔ عورتوں کو کم زور سمجھ کر بالعموم لوگ ان کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ عورتوں پر عام طور سے تاریخ کے ہر دور میں ظلم ہوتا رہا ہے۔ عورت اگر مرد کی سرپرستی میں دی گئی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ مرد کے مظالم کا نشانہ بنے بلکہ سماج کی تعمیر اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری تھا کہ عورت مرد کی قوامیت کو قبول کرے۔ اسلام نے سوسائٹی میں ایک طرف عورت کے مقام کو بلند کیا، دوسری طرف اس نے عورتوں کے حقوق کی پوری حفاظت کی ذمہ داری لی۔ اس کا انکار وہ شخص نہیں کرسکتا جس نے اسلام کے معاشرتی نظام کا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ ؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ اَعْطٰی لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”جس شخص نے محبت کی اللہ کے لیے، دشمنی کی اللہ کے لیے، دیا اللہ کے لیے اور روکا (یعنی نہ دیا) اللہ کے لیے اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔“

تشریح: یعنی تکمیلِ ایمان یہ ہے کہ ہم اپنی ذاتی خواہشات اور نسلی وقومی عصبیتوں سے بلند ہوں۔ زندگی میں ہم جو روش بھی اختیار کریں اس میں اصلاً خوش نودیِ رب ہی ہمارے پیش نظر ہو۔ دوستی ہو کہ دشمنی، دینا ہو یا روکنا، ہمارا سب کچھ ایک خدا کے لیے ہی ہو۔ کامل حوالگی کے بغیر اللہ پر ایمان لانے کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ کوئی شخص دعویٰ تو یہ کرتا ہو کہ وہ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھتا ہے لیکن معاملاتِ زندگی میں وہ خدا کے احکام اور اس کی پسند اور ناپسند کو یکسر نظر انداز کرتا چلا جائے تو اس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ وہ یا تو خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتا یا رکھتا ہے تو اس کا ایمان نہایت ناقص اور کم زور ہے۔ اور ابھی اس کا ایمان اس کی زندگی میں قوتِ محرکہ بن کر نہیں ابھر سکا ہے۔ اس کی یہ حالت انتہائی تشویش ناک ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں اسی طرح کی ایک حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: فَاِذَا اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدْ اِسْتَحَقَّ الْوِلَایَةَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ ”پس جب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اس کی محبت اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اس کی دشمنی اور نفرت ہوگئی تو وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی ولایت سے نواز دے۔“

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَفَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی اَمْرٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم جنت میں داخل نہ ہوگے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ اور تم ایمان والے نہ ہوگے جب تک کہ تم باہم ایک دوسرے سے محبت نہ رکھو۔ کیا میں تمھیں وہ چیز نہ بتادوں کہ اگر تم اسے عملاً اختیار کرلو تو باہم تمھارے درمیان محبت پیدا ہو جائے۔ آپس میں سلام کو رواج دو۔“

تشریح: یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی تقریباً ان ہی الفاظ کے ساتھ ملتی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ اگر وہ خدا کے قرب اور اس کی جنت کے خواست گار ہیں تو انھیں اپنی زندگی میں عام انداز سے ہٹ کر ایک خاص طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جنت کا حصول زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ لیکن جنت میں دخول ایمان کے بغیر ممکن

نہیں۔جس طرح انسان کا معدہ مکھی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔اگر غفلت میں کوئی مکھی پیٹ میں چلی جاتی ہے تو فوراً ابکائی آتی ہے اور قے کے ذریعہ سے معدہ مکھی کو باہر پھینک دیتا ہے۔ٹھیک اسی طرح جنت کی پاکیزگی اور نظافت غیر مومن کے ناپاک وجود کو ہرگز قبول نہ کر سکے گی۔اس لیے انسان اگر اپنی فطری خواہش کی تکمیل یعنی جنت حاصل کرنی چاہتا ہے تو وہ خود کو جنت کا اہل بنائے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کفر سے دست بردار ہو کر ایمان لے آئے۔اور ایمان سے مقصود کسی خاص نظریہ وعقیدہ کا محض زبانی اقرار نہیں ہے بلکہ مطلوبِ ایمان یہ ہے کہ وہ زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت کی شکل میں نمایاں ہو۔ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم باہم ایک دوسرے سے محبت سے پیش آئیں۔ہمارے درمیان اصل رشتہ محبت کا ہو۔باہم محبت پیدا کرنے والی چیزیں کئی ہو سکتی ہیں۔ان میں سے اس کے لیے ایک موثر ذریعہ یہ ہے کہ ہم معاشرہ میں سلام کو زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کوشش کریں۔ایسا نہ ہو کہ ایک شخص اپنے بھائی کے پاس سے گزرے تو اس سے اپنے تعلق کا اظہار کیے بغیر یوں ہی بے گانہ وار گزر جائے۔ایسی بے گانگی کی توقع تو کسی چمن کے پھولوں سے بھی نہیں کی جاتی۔وہ تو اپنے پاس سے گزرنے والوں تک اپنی خوش بو پہنچا ہی دیتے ہیں۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَ وَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم میں سے کوئی ایمان لانے والا نہ ہو گا جب تک کہ میں اس کے لیے اس کی اولاد اور اس کے باپ اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔"

تشریح: صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بہ خدا اے اللہ کے رسولؐ، آپؐ مجھے ہر شے سے بڑھ کر محبوب ہیں سوائے اپنی جان کے۔اس پر رسول اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ نہیں اے عمر! (تم مومن نہ ہو گے) جب تک کہ میں تمھیں تمھاری اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم، آپؐ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب اے عمرؓ (تم مومن ہو)۔

رسولؐ سے محبت رکھنی اللہ کی محبت ہی کی وجہ سے واجب ہے۔محبت الٰہی درحقیقت

دین وایمان اور تمام اعمال کی اصل ہے۔ جو عمل اللہ کے لیے نہ ہو یا جس کے پیچھے خدا کی خوش نودی کی طلب کارفرما نہ ہو وہ مقبول نہیں۔ اسی لیے حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایسا قاری یا مجاہد یا صدقہ کرنے والا جہنم میں داخل ہوگا جو ریا کار ہو۔ عبادت، انابت اور تبتل الی اللہ وغیرہ درحقیقت محبت الٰہی ہی کے متضمنات میں سے ہیں۔ خدا نے مخلوق کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے (الذٰریت:۵۶) یعنی خدا سے غایت درجہ محبت رکھے اور اسے دل و جان سے پسند کرے۔ لیکن خدا کی تعظیم کے بغیر یہ محبت کامل نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے عبادت میں غایت درجہ محبت میں غایت درجہ تذلل کا مفہوم بھی شامل ہے۔

زندگی میں اصل فیصلہ کن چیز محبت ہی ہے۔ اور یہی چیز آخرت میں بھی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ چناں چہ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' (آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہوگی۔'' (بخاری و مسلم) زندگی کی اصل غرض و غایت محبت الٰہی ہی ہے۔ دوسرے لوگوں سے محبت کا رشتہ خدا کی محبت کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔ اس طرح عزیز واقارب اور دوست اور احباب کی محبت کو ایک ایسی بنیاد مل جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ محبت بھی نہ صرف یہ کہ مستحکم بلکہ اہل نظر کے نزدیک بامعنی بھی ہوجاتی ہے۔

محبت کہتے ہیں اپنی ذات کے دائرہ سے نکلنے کو۔ جو شخص صرف اپنے ہی گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور جس کی تگ و دو صرف اپنے ہی لیے وقف ہوتی ہے وہ لفظ محبت کے معنی سے ناآشنا ہے۔ نبیؐ کو سب سے بڑھ کر حتیٰ کہ اپنی جان سے بڑھ کر محبت رکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مومن کے قلبی لگاؤ کا مرکز ومحور اپنی ذات سے کہیں زیادہ رسولِ خداؐ کی ذات ہوتی ہے۔ یہ چیز اسے ہر طرح کی تنگ دامانیوں سے نجات دلاتی اور اسے ایک ایسی دنیا میں داخل کردیتی ہے جہاں اسے کوئی غیر نظر نہیں آتا۔ اب اپنی ہی نہیں ساری انسانیت کی فلاح و بہبود اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ انسانیت کا ہر قیمتی سرمایہ اس کا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی پریشانیاں اس کی اپنی پریشانیاں بن جاتی ہیں۔ اس لیے کہ جس رسولؐ کو وہ اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہے وہ سارے عالم کا خیر خواہ ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ رسول پاکؐ سے محبت کا رشتہ اسے خودغرضی، موقع پرستی اور ہر قسم کے تعصب سے بلند نہ کردے۔

جب خدا کا رسولؐ مومن کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے تو اسے خدا سے کس

درجہ محبت ہوگی اس کا اندازہ آدمی خود کرسکتا ہے۔ ایمان کی یہ کیفیت اگر ہمارے اندر پیدا ہوجائے تو پھر کیا دین کی راہ میں آگے بڑھنے میں کوئی چیز ہمارے لیے رکاوٹ بن سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَةً وَّالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔ اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔''

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا یَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ اَبَدًا۔ (نسائی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
''بخل وحرص اور ایمان دونوں کسی بندے کے دل میں کبھی بھی جمع نہیں ہوں گے۔''

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

تشریح: آدمی اپنے لیے شر کو نہیں بلکہ خیر اور بھلائی کو پسند کرتا ہے اس لیے لازماً اسے اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے بھی خیر کا طالب ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر ہمارا ایمان ناقص ہی رہے گا۔ ایمان تو ہمیں ہر طرح کی تنگی سے 'خواہ وہ دل کی تنگی ہو یا فکر ونظر کی' نکال کر وسعتِ قلب کی دولت سے بہرہ مند کرتا ہے جس کی بقا کا ضامن وہ جذبہ ہوتا ہے جسے ہم محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ قِیْلَ مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: اَلَّذِیْ لَا یَأْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ۔
(بخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بخدا

وہ ایمان نہیں رکھتا، بخدا وہ ایمان نہیں رکھتا، بخدا وہ ایمان نہیں رکھتا۔" پوچھا گیا: "کون اے اللہ کے رسول (ایمان نہیں رکھتا)؟" فرمایا: "وہ شخص جس کا ہم سایہ اس کی برائیوں سے مامون و محفوظ نہ ہو۔"

تشریح: یعنی یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ مومن کا پڑوسی اس سے کسی قسم کا خطرہ اور اندیشہ محسوس نہ کرے بلکہ اس سے وہ اپنی جان اور مال اور عزت کو محفوظ پائے۔ مومن سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی کی عزت یا مال پر ڈاکہ ڈال سکتا ہے۔ وہ تو لوگوں کا محافظ اور ان کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

﴿۹﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِىْ يَشْبَعُ وَ جَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ. (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہم سایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔"

تشریح: مومن لوگوں کا غم خوار ہوتا ہے۔ ہم سایہ بھوکا رہ جائے اور وہ پیٹ بھر کر مزے لے کر کھائے ایسی سخت دلی کا اظہار کسی مومن شخص سے ممکن نہیں۔ اگر کوئی ایمان کا دعوے دار ایسا سخت دل اور بے رحم ہے تو اسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ کیا عجب کہ یہ ضعیف اور کم زور ایمان بھی اس کے یہاں زیادہ دن تک نہ ٹھہر سکے۔

﴿۱۰﴾ وَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِىِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ وَالْفَاجِرُ خَبٌّ لَئِيْمٌ. (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "مومن بھولا بھالا اور شریف و فیاض ہوتا ہے اور فاجر (غیر مومن) چالاک (فریب کار) اور کمینہ و بخیل ہوتا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان کا آدمی کے اخلاق و عمل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مومن سادہ مزاج ہوتا ہے۔ وہ فریب کھا سکتا ہے لیکن وہ خود کسی کو فریب دے، ممکن نہیں۔ لیکن مومن کو بار بار دھوکا بھی نہیں دیا جاسکتا۔ چناں چہ حدیث میں ہے: لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَيْنِ۔ (بخاری و مسلم) "مومن کو ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔" مومن کریم ہوتا

ہے۔ کریم کہتے ہیں شریف کو۔ فیاضی شرافت کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس کے برخلاف فاجر کے بارے میں شرافت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ لئیم یعنی کمینہ ہوگا۔ جس کی واضح ترین علامت بخل ہے۔ اس حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ مومن حسنِ اخلاق کا پیکر اور فاجر شخص بداخلاقیوں کا مظہر ہوتا ہے۔ مومن کی طبیعت میں شرافت ہوتی ہے۔ اس کی ذہانت باعث شر و فتنہ نہیں بن سکتی۔ وہ بے خبر اور ناسمجھ نہیں ہوتا لیکن اس کی ذہانت وبصیرت جہل اور چال بازیوں سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں ایک فاجر شخص سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ لوگوں کو اپنی چال بازیوں سے پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس سے کمینگی کے سوا کسی اور چیز کا اظہار ممکن نہیں۔ بھلائیوں کے لیے اس کا دامن ہمیشہ تنگ دکھائی دے گا۔

﴿۱۱﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ الْحَیَاءَ وَالْاِیْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُھُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حیا اور ایمان دونوں ساتھ یکجا رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے جب ایک کو اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھالیا جاتا ہے۔''

تشریح: ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُھُمَا تَبِعَہُ الْاٰخَرُ۔ ''چنانچہ ان میں سے ایک کو سلب کرلیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اسی کے ساتھ جاتا رہتا ہے۔'' ایمان اور اخلاق میں کتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے اس کا بہ خوبی اندازہ اس حدیث سے کیا جاسکتا ہے۔ شرم وحیا کو اخلاقی اوصاف میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقٌ وَّ خُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ۔ (موطا امام مالک) ''ہر ایک دین کا ایک خُلق ہوتا ہے۔ اسلام کا خُلق حیا ہے۔'' یعنی ہر مذہب کا ایک مزاج (Nature, manner) ہوتا ہے۔ اسلام کے مزاج کی لطافت اور پاکیزگی کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ حیا اس کے مزاج میں شامل و داخل ہے۔ حیا کے متعلق ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایمان سے اس کا گہرا اور انتہائی قریبی رشتہ ہے۔ ایمان اور حیا میں باہم انتہائی وابستگی پائی جاتی ہے۔ ان میں کوئی ایک اگر باقی نہ رہے تو دوسرا بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ ایک کے رخصت ہوتے ہی دوسرا بھی دم توڑ دے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے ایمان کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایمان اپنی فطرت کے لحاظ سے ہمیشہ ایک پاکیزہ زندگی میں ڈھلنے کو بے قرار رہتا ہے۔ جب تک وہ ایک پاکیزہ زندگی کی شکل اختیار نہیں کر لیتا اسے قرار میسر نہیں آتا۔ جس طرح سے کہ کسی مسموم فضا میں آدمی کا دم گھٹتا ہے۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کو بے چین ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ایمان کا بھی ہے۔ اب اگر ہماری زندگیوں سے حیا، غیرت وشرم وغیرہ اخلاقی اوصاف ناپید ہوتے جا رہے ہیں تو کسی کو اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ ہماری ایمانی حالت حد درجہ تشویش ناک ہے۔

﴿۱۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ وَّلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ وَّلَا یَنْتَھِبُ نُھْبَۃً یَّرْفَعُ النَّاسُ اِلَیْہِ فِیْھَا اَبْصَارَھُمْ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زانی اس حال میں کہ وہ مومن ہو زنا نہیں کرتا اور نہ شرابی اس حال میں کہ وہ مومن ہو شراب پیتا ہے، اور نہ چور اس حال میں کہ وہ مومن ہو چوری کرتا ہے، اور نہ اچکّا اس حال میں کہ وہ مومن ہو کوئی چیز اچکتا ہے جب کہ لوگ (بے بسی کی حالت میں) اس کی طرف اپنی آنکھیں اٹھاتے ہیں۔''

تشریح: یعنی جب کوئی شخص زنا کرتا یا شراب پیتا ہے یا وہ چوری کرتا یا لوگوں کے دیکھتے دیکھتے کسی کی کوئی چیز اچکتا ہے تو اس وقت اس کی مومنانہ حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ایمان کے بہ جائے اس کے اندر اس وقت کوئی دوسری ہی چیز کام کر رہی ہوتی ہے۔ حالاں کہ مطلوب یہ ہے کہ اس کے تمام اعمال کا صدور اس کے ایمان کے تقاضے کے طور پر ہو۔ آدمی کی زندگی میں ایمان کی جگہ کوئی اور قوت کام کرنے لگ جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان اس کے دل میں ابھی پوری طرح گھر نہیں کر سکا ہے اسی لیے ایمان کی حریف قوت کو اس کی زندگی میں کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِذَا زَنَا الرَّجُلُ خَرَجَ مِنْہُ

اَلْاِیْمَانُ کَانَ عَلَیْہِ کَالظُّلَّۃِ فَاِذَا انْقَلَعَ رَجَعَ اِلَیْہِ الْاِیْمَانُ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص زنا کرتا ہے تو ایمان اس کے اندر سے نکل کر اس کے سر پر سائبان کی طرح قائم ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ یہ کام کر چکتا ہے تو ایمان اس کی طرف پھر لوٹ آتا ہے۔''

تشریح: ایمان جو زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے گناہ کے وقت آدمی کا رشتہ اس سے منقطع سا ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گناہ کے بعد آدمی کی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی جو گناہ کے وقت ہوتی ہے۔ گناہ کے بعد آدمی کو سخت ندامت ہوتی ہے۔ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے۔ خدا سے توبہ کرتا ہے۔ اس طرح ارتکابِ گناہ کے باوجود اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی کا دل ایمان کی حقیقی کیفیات سے پھر معمور ہو سکے۔

﴿۱۴﴾ وَ عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ: قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ابْنُ جُدْعَانَ کَانَ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ یَصِلُ الرَّحِمُ وَ یُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ فَھَلْ ذٰلِکَ نَافِعُہٗ؟ قَالَ: لَا یَنْفَعُہٗ لِاَنَّہٗ لَمْ یَقُلْ یَوْمًا رَّبِّ اغْفِرْ لِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ابن جُدعان زمانۂ جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مسکین کو کھانا دیتا تھا تو کیا یہ اس کے کام آئے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ اس کے کچھ کام نہ آئے گا اس لیے کہ اس نے کسی دن بھی یہ نہ کہا کہ میرے رب، جزا و سزا کے دن تو میری خطا کو بخش دینا۔''

تشریح: یعنی وہ شخص کفر میں مبتلا تھا، آخرت پر اس کا ایمان نہ تھا۔ اس لیے وہ خدا سے کبھی مغفرت کا طالب نہ ہوا۔ ایمان کے بغیر خواہ کتنے ہی نیک اعمال ہوں وہ اکارت جائیں گے۔ آخرت میں وہ ہرگز آدمی کے کام نہ آسکیں گے۔ معلوم ہوا کہ نیک اعمال خدا کی نگاہ میں وہی معتبر ہیں جن کا اصل محرک ایمان ہو نہ کہ کچھ اور۔ ایمان کے بغیر حقیقت میں وہ زندگی ہی میسر نہیں ہوتی جسے قابلِ قدر قرار دیا جائے۔ جب کسی کو وہ زندگی ہی میسر نہ ہو جو مطلوب ہے تو اس کے اعمال و افکار اور اخلاق کو کیسے باوزن ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

﴿۱۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ مَا الْاِیْمَانُ؟ فَقَالَ مَنْ سَرَّتْہُ

حَسَنَتُهٗ وَ سَاءَ تْهُ سَیِّئَتُهٗ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ (الحاکم فی المستدرک)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''نیکی کر کے جس کو خوشی ہو اور برائی کر کے جس کو غم اور پچھتاوا ہو تو وہ مومن ہے۔''

تشریح: اس حدیث سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ایمان انسان کے اعمال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ایمان درحقیقت آدمی کے ذوق و فطرت کو نکھار دیتا ہے۔ ایمان کی اصل بنیاد ہی دراصل انسان کا ذوق صحیح اور حاسّہ، فطرت ہے۔ اسی لیے مومن کو نیکی سے مسرت اور برائی سے انقباض ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر مومن شخص کو اپنے برے اعمال ہی خوش نما اور مسرت بخش معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ کفر سب سے پہلے اس کے ذوق و فطرت ہی پر حملہ آور ہو کر اسے بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ پھر اس کی حالت اس مریض کی سی ہو جاتی ہے جس کے مرض نے اس کی زبان کا ذائقہ خراب کر دیا ہو اور اسے میٹھی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہو۔ قرآن میں ہے: اَفَمَنْ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ط فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ز صلے (سورۂ فاطر، آیت ۸) ''پس کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل خوش نما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھتا ہو (تو کیا وہ برائی سے باز آئے گا؟) پس اللہ جسے چاہتا ہے گم راہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔'' سب سے بڑی گم راہی اور ضلالت یہی ہے کہ آدمی کا ذوق اور اس کی طبیعت ہی مسخ ہو جائے۔ اور وہ صحیح ذوق اور دل کی صحیح کیفیت کی لذّت سے محروم ہو کر رہ جائے۔

اخلاق کا تعلق انسانی زندگی سے

〈۱〉 عَنِ النَّوَاسِ بْنِ سَمْعَانَؓ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ، فَقَالَ: اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ، وَ کَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْهِ النَّاسُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت نواس بن سمعانؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''نیکی حسن اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمھارے سینہ میں کھٹک پیدا کرے اور تمھیں یہ ناپسند ہو کہ لوگوں کو اس کی اطلاع ہو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ نیکی اپنی حقیقت کے لحاظ سے حسن اخلاق سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ حسنِ اخلاق ہی کا دوسرا نام نیکی ہے۔ جس کی زندگی حسن اخلاق سے خالی ہے وہ نیکی کے تمام محاسن سے محروم ہے۔ جس چیز سے آدمی کی طبیعت اِبا کرے، جس پر آدمی کا دل مطمئن نہ ہو، جو دل میں چبھے، جسے وہ خود نامحبوب سمجھتا ہو اور یہ پسند نہ کرتا ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کے علم میں آئے، وہی گناہ ہے۔ اس کے برخلاف جو چیز ہماری فطرت کے مطابق ہو، جسے ہماری فطرت پسند کرے، جس کو عملاً اختیار کرنے سے دل کو خوشی اور فرحت حاصل ہو وہی نیکی ہے۔

نیکی اور گناہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جس طرح سے روشنی اور تاریکی دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا ممکن نہیں اسی طرح سے نیکی (حسن اخلاق) اور گناہ کو کبھی جمع نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص گناہ کی راہ اختیار کرتا ہے وہ سب سے پہلے خود اپنے ساتھ بے وفائی کا رویّہ اختیار کرتا ہے۔ گناہ درحقیقت ایک خیانت ہے جو آدمی اپنی فطرت اور اپنے ضمیر کے ساتھ کرتا ہے۔ جب کہ نیکی حقیقت میں خود شناسی، عزتِ نفس اور روح کی بیداری کا دوسرا نام ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا الْاِیْمَانُ؟ قَالَ: اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَ سَآءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَمَا الْاِثْمُ؟ قَالَ: اِذَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ شَیْءٌ فَدَعْهُ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''جب تمھاری نیکی تمھارے لیے خوشی کا باعث ہو اور تمھاری بدی تمھارے لیے ناگواری کا سبب ثابت ہو تو تم مومن ہو۔'' اس نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! پھر گناہ کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: ''جب کوئی چیز تمھارے دل میں تردّد پیدا کرے تو اسے چھوڑ دو۔''

تشریح: جس طرح ایمان کا اخلاق سے گہرا تعلق ہے ٹھیک اسی طرح اخلاق ہماری پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور اسے متاثر کرتا ہے۔ مومنانہ اخلاق سے جو زندگی وجود میں آتی ہے اس میں نیکیاں محض نیکیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ آدمی کی زندگی میں سب سے بڑھ کر باعثِ سرور و راحت بھی ہوتی ہیں۔ اس طرح کی زندگی میں بدی اور برائی نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ شے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر بشری کمزوری کے سبب سے کسی مومن سے کسی خطا اور برائی کا ارتکاب بھی ہو جاتا

ہے تو اس کا ضمیر اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی ساری خوشی چھن جاتی ہے۔ جب تک وہ اپنی غلطی کی تلافی نہیں کر لیتا اسے چین اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُ مَا کُنْتَ وَ اَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُھَا وَ خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔ (احمد، ترمذی، دارمی)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا ڈر رکھو جہاں کہیں بھی ہو اور برائی کے بعد نیکی کر لو تاکہ نیکی برائی کو مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو۔''

تشریح: یہ ایک نہایت اہم حدیث ہے۔ آدمی جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی ہو، امیر ہو یا مفلس، بااختیار ہو یا کم زور، رات کی تاریکی اور تنہائی میں ہو یا دن کی روشنی میں اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے، خدا کی عظمت کا پاس ولحاظ اسے ہمیشہ ہونا چاہیے۔ یہی چیز اسے ہر قسم کے ظلم وطغیان یا ذلّت وپستی اور ہر قسم کے گناہوں سے بھی محفوظ رکھے گی اور یہی چیز اسے خدا سے بھی قریب کرے گی۔ یہاں تک کہ وہ خدا کا محبوب ترین بندہ بن سکتا ہے۔

حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ اگر بدقسمتی سے آدمی سے کوئی برائی سرزد بھی ہو جائے تو خدا کی رحمت سے وہ مایوس نہ ہو فوراً تلافی کی فکر کرے۔ اس کی بہترین شکل یہ ہے کہ توبہ واستغفار کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا نیک عمل بھی کرے۔ جس سے اس گناہ اور برائی کے برے اثرات اس کے دل ودماغ سے زائل ہو جائیں اور اس کی زندگی گناہ کی آلودگیوں سے پاک ہو جائے۔ یہ چیز خدا کی رحمت کو اس کی طرف متوجہ کرنے میں بے حد موثر ثابت ہوگی۔

پھر جس طرح خدا کا یہ خاص حق ہے کہ بندہ ہر مقام پر اور ہمیشہ اپنے خدا کو یاد رکھے اور اس کی طرف سے غافل نہ ہو، اسی طرح بندگانِ خدا کا بھی اس پر یہ حق ہے کہ ان کے ساتھ اس کا جو معاملہ بھی ہو اس میں وہ حسنِ اخلاق کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھے۔ مخلوقِ خدا کا ہم پر حق بھی ہے اور وہ ہمارے لیے اس کی کسوٹی بھی ہے کہ ہم کس طرح کے آدمی ہیں۔ خودغرض، مغرور اور پست قسم کے یا عالی ظرف، بلند اور باکردار۔

اخلاق کی جامعیت

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَسَّمَ بَیْنَکُمْ اَخْلَاقَکُمْ کَمَا قَسَّمَ بَیْنَکُمْ اَرْزَاقَکُمْ۔ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُعْطِی الدُّنْیَا مَنْ یُّحِبُّ وَ مَنْ لَّا یُحِبُّ وَلَا یُعْطِی الدِّیْنَ اِلَّا مَنْ اَحَبَّ فَمَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ الدِّیْنَ فَقَدْ اَحَبَّهٗ۔ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا یُسْلِمُ عَبْدٌ حَتّٰی یُسْلِمَ قَلْبُهٗ وَ لِسَانُهٗ وَلَا یُؤْمِنُ حَتّٰی یَأْمَنَ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (احمد، بیہقی)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے تمھارے اخلاق کو تمھارے درمیان اسی طرح تقسیم کیا ہے جس طرح کہ اس نے تمھارے رزق کو تمھارے درمیان تقسیم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا تو اس کو بھی دیتا ہے جس سے محبت فرماتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبت نہیں فرماتا مگر دین صرف اسی کو عطا کرتا ہے جس سے اسے محبت ہوتی ہے۔ پس جس شخص کو خدا نے دین عطا کیا ہے لازماً اس سے اس کو محبت ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک مسلم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل اور اس کی زبان مسلم نہ ہو۔ اور وہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا ہم سایہ اس کی برائیوں سے مامون ومحفوظ نہ ہو۔“

تشریح: اخلاقیات کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ ایک اہم حدیث ہے۔ دنیا کی زندگی میں دو چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک رزق یا دولت وغیرہ جس کی طرف بالعموم لوگوں کی توجہ ہوتی ہے اور اس کے حصول میں وہ غفلت سے کام نہیں لیتے۔ مال کے ذریعہ سے آدمی اپنی مادّی ضروریات پوری کرتا یا اپنی زندگی کے عیش اور آرام میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسری چیز وہ ہے جسے حسن اخلاق سے تعبیر کیا گیا۔ اخلاق کا اصل تعلق آدمی کی اپنی ذات اور شخصیت سے ہوتا ہے۔ آدمی کیسا ہے؟ یہ اس کی دولت سے نہیں اس کے اخلاق ہی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ آدمی اخلاق کے لحاظ سے اگر بہتر نہیں ہے تو مال یا دولت کی فراوانی سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص لاغر اور دائم المریض ہو اور اس کا مرض بھی ایسا ہو کہ اس کی وجہ سے وہ مسلسل تکلیف اور درد وکرب میں مبتلا ہو تو اس کے دولت مند ہونے کے باوجود اس کی زندگی

ہمارے لیے قابلِ رشک نہیں ہوسکتی۔ اخلاق کی خرابی جسمانی مرض سے کہیں زیادہ تشویش ناک ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کی کوتاہ نظری ہے کہ وہ اخلاق کی قدر و قیمت کو عام طور پر محسوس نہیں کرتے۔

مال اور دولت کی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی بڑی اہمیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا اپنے دشمنوں تک کو دولت سے نواز دیتا ہے۔ لیکن اخلاقی خوبیاں اپنے ان ہی بندوں کو عطا فرماتا ہے جن سے اسے محبت ہوتی ہے۔ اس کی پہچان کہ کس شخص سے خدا کو محبت ہے اس سے ہوتی ہے کہ کس شخص کو اس کی طرف سے حسن اخلاق کا سرمایہ بے بہا عطا ہوا ہے۔

اس حدیث میں اخلاق کو عین دین قرار دیا گیا ہے چناں چہ فَمَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ الدِّيْنَ (پس جس شخص کو خدا نے دین عطا کیا ہے) میں دین کا لفظ اخلاق کی جگہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ اخلاق کو دین قرار دینے سے اصل مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان اپنے اخلاق کو بلند کرے۔ زندگی میں دین کی اصل بنیاد در حقیقت اخلاقی حس ہی ہے۔ خدا کی طاعت اور بندگی اور دین کے جملہ احکام کی بجا آوری حقیقت میں ہمارا اخلاق ہے۔ دین حق سے گریز خواہ وہ کسی بھی انداز میں ہو حقیقت کی نگاہ میں ایک سنگین اخلاقی جرم ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنْ مَّعَكَ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ؟ قَالَ: "حُرٌّ وَّ عَبْدٌ۔ قُلْتُ: مَا الْاِسْلَامُ؟ قَالَ: "طِيْبُ الْكَلَامِ وَ اِطْعَامُ الطَّعَامِ۔ قُلْتُ: مَا الْاِيْمَانُ؟ قَالَ: "اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ۔" قَالَ قُلْتُ: اَىُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ۔" قَالَ قُلْتُ: اَىُّ الْاِيْمَانِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "خُلُقٌ حَسَنٌ۔" قَالَ: قُلْتُ: اَىُّ الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "طُوْلُ الْقُنُوْتِ۔" قَالَ: قُلْتُ: اَىُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ۔ قَالَ: فَقُلْتُ: فَاَىُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ وَ اُهْرِيْقَ دَمُهٗ۔" قَالَ: قُلْتُ: اَىُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "جَوْفُ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ۔"

(احمد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اس امر (دین) میں آپؐ کے ساتھ (ابتدائے دعوت کے موقعہ پر)

کون تھا؟ آپؐ نے فرمایا: ''ایک آزاد اور ایک غلام۔'' میں نے عرض کیا کہ اسلام کیا ہے؟ فرمایا: ''پاکیزہ و عمدہ کلام اور کھانا کھلانا۔'' میں نے عرض کیا کہ ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ''صبر و سخاوت۔'' راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ سب سے بہتر اسلام کون سا ہے؟ فرمایا: ''اس شخص کا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ سب سے بہتر ایمان کون سا ہے؟ فرمایا: ''اچھا اخلاق۔'' وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کون سی نماز سب سے بہتر ہے؟ ارشاد فرمایا: ''قیام طویل کرنا۔'' کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کون سی ہجرت سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ جو کچھ تیرے رب کو ناپسند ہو اسے تو چھوڑ دے۔'' کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ کون سا جہاد سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ''اس شخص کا جس کا گھوڑا مارا جائے اور جس کا اپنا بھی خون بہایا جائے۔'' کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ساعتوں میں کون سی ساعت سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ''وسطِ شب کا آخری حصہ۔''

تشریح: حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ ان اشخاص میں شامل ہیں جنھیں ایمان لانے میں اوّلیت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اسلام محض خیال کی دنیا میں محدود ہو کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ مطلوب یہ ہے کہ زندگی کے مختلف امور و معاملات میں اس کا ظہور بہتر سے بہتر انداز میں ہو۔ بہ طور مثال آپؐ نے یہاں دو چیزوں کا ذکر فرمایا جن کے مواقع عوام اور خواص سبھی کی زندگیوں میں پیش آتے رہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام سراپا خیر اور خوئے دل نوازی کا دوسرا نام ہے۔ شیریں کلامی، عمدہ گفتگو اور فیاضی (کھانا کھلانا جس کا ایک واضح ثبوت ہے) صرف کلام کا ہی حسن اور عمل ہی کی خوبی نہیں ہے بلکہ یہ چیز خود آدمی کی اپنی خوبی اور اس کی محبوبیت کی بھی دلیل ہے۔ آدمی اگر ہر دل عزیز نہ بھی ہو تو اس وصف کے اختیار کرنے کے بعد بہت جلد لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے جگہ پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ محبوبِ خلائق بن جائے گا۔ یہ وصف ایسا ہے کہ جس سے خود اس کے اختیار کرنے والے شخص کی شخصیت میں بھی خوش گوار تبدیلی رونما ہوگی اور لوگوں کے لیے اس کی شخصیت میں خاص جاذبیت پیدا ہو جائے گی۔

ایمان دراصل غیر مرئی حقائق پر یقین کرنے کا نام ہے۔ اس کے برخلاف غیر ایمانی حالت یہ ہے کہ آدمی کی نظر محض ظاہر پر ہو۔ ایسا آدمی مادی طور پر جلد حاصل ہونے والے

فائدے ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے کے لیے مناسب اور غیر مناسب ہر تدبیر اختیار کرتا ہے۔ جائز اور ناجائز یا حلال اور حرام کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ایسا شخص کسی ایسے کام میں روپے خرچ کرسکتا ہے جس میں اسے دنیوی فائدے کی قوی امید ہو۔ لیکن کسی مسکین کی مدد یا کسی کارِ خیر میں روپیہ خرچ کرنا اس کے لیے کسی بڑی مصیبت سے کم نہیں۔ جب کہ ایمان آدمی کو اس تنگی سے نکال لیتا ہے۔ ایمان آدمی کو دور اندیش بناتا اور اس کے دل میں فراخی پیدا کرتا ہے۔ صبر اسی دور اندیشی اور سخاوت اسی فراخیِ دل کی علامت اور مظہر ہے۔ صبر اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کی نظر کسی ایسی چیز پر ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہے اور سخاوت وسماحت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ آدمی کی روح حرص وہوس اور بخل وآز کی قید وبند سے آزاد ہو چکی ہے۔

ایک مومن شخص کو کوئی اذیّت اور تکلیف پہنچے یا وہ معاشی تنگی اور کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ اس کے رب کی نگاہوں میں ہے۔ وہی بہترین حامی وناصر اور محافظ ہے۔ اسے اپنے رب کی کارسازی پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں تو اس فرض کے ادا کرنے میں اپنی توانائی اور اپنے اوقات کا بہترین حصہ صرف کرنا چاہیے جو خدا نے ہم پر عائد کیا ہے۔ رہے مسائل اور الجھنیں تو ان سے نمٹنے کے لیے ہمارا رب کافی ہے۔ اس لیے تمام ہی پریشان کن حالات میں جن میں عام طور پر لوگ صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو خودکشی تک کے مرتکب ہو جاتے ہیں، ایک مومن نہایت صبر واستقلال کا ثبوت دیتا ہے اور یہ محض اس کی ایمانی قوت کا کرشمہ ہوتا ہے۔

پھر اسلام کا یہ اثر بھی ظاہر ہونا چاہیے کہ ایک مسلمان سے اس کے کسی بھائی کو کسی قسم کا اندیشہ اور کوئی نقصان پہنچنے کا خوف باقی نہ رہے۔ اگر کسی مسلمان کی زندگی میں اسلام کا یہ اثر ظاہر نہیں ہوتا تو سمجھ لیجیے کہ اسلام کی بہترین حالت ابھی اسے میسر نہیں آسکی ہے۔

''قیام طویل کرنا'' کے لیے متن میں ''طول القنوت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم طویل قیام کے علاوہ طویل قرأت اور خشوع کی زیادتی بھی لیا گیا ہے۔ قنوت حقیقت میں نماز کی اصل روح ہے۔ نماز میں یہ چیز جتنی زیادہ پائی جائے گی اتنا ہی زیادہ اسے افضل قرار دیا جائے گا۔

عام اصطلاح میں ہجرت اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے لیے اپنے وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر

کسی دوسرے مقام پر منتقل ہوجانے کو کہتے ہیں۔ وطن اور اہل وطن کس کو عزیز نہیں ہوتے لیکن مہاجران سب کے مقابلے میں خدا کی رضا کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنی خوشی اور پسند کے مقابلے میں خدا کی خوشی اور اس کی پسند کو اختیار کرنا یہی ہجرت کی اصل روح ہے جس کی کارفرمائی مکان کی منتقلی ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے جملہ امور میں مطلوب ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ ہمارے رب کو جو ناپسند ہو اسے ہم چھوڑ دیں تو یہ ایک بہترین قسم کی ہجرت ہے اگرچہ اس ہجرت میں انتقال مکان نہ پایا جاتا ہو۔ اس رجحان وذوق اور اس کام کو ترک کر دینا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہو ترکِ وطن اور مکان سے کہیں بڑا اور انقلاب آفریں ترک ہے اس لیے بہترین ہجرت سے اس کی تعبیر ایک نہایت معنی خیز تعبیر ہے۔

میدان جہاد میں نہ صرف یہ کہ وہ خود قربان ہو گیا بلکہ اس کا گھوڑا بھی لوٹ کر گھر نہ آیا۔ فدائیت کی یہ ادا کس درجہ وجد آفریں ہے۔ اسے بہترین جہاد سے موسوم کرنا اسلام کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو وہ نگاہ عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے دنیوی ومادی سود وزیاں کے حجابات سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور آدمی کو نظر آنے لگ جاتا ہے کہ اس کے لیے اصل نفع کی بات کیا ہے اور اصلاً خسارہ اس کے لیے کس چیز میں ہے۔

وسط شب کا آخری حصہ رات کا وہ حصہ ہے جو نہایت پرسکون اور روح پرور ہوتا ہے۔ اس وقت کے قیام اور رکوع وسجود کے اثرات روح انسانی پر نہایت گہرے پڑتے ہیں۔ جو تنہائی اور یکسوئی رات کی اس ساعت میں حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری ساعت میں حاصل نہیں ہوتی۔ جذبۂ عبودیت سے معمور قلوب کے لیے تو یہ ساعت ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ وہ وقتِ خاص ہے جو مناجات اور اظہارِ عجز ونیاز کے لیے نہایت موزوں ہے اس لیے اس وقت دعا کے قبول ہونے اور بندے کی جانب اس کے رب کی رحمتوں کے متوجہ ہونے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب عام دنیا عالم خواب میں محو ہوتی ہے جس کی وجہ سے فتنۂ ریا میں مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ کم ہی ہوتا ہے۔

مکارمِ اَخُلاق

مکارمِ اَخلاق

ادراک ونظر

اِخلاص

〈۱〉 عَنْ عُمَرَ بْنِ خَطَّابٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ: اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَاَۃٍ یَّتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَ اِلَیْہِ وَ مَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ پس جس کسی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہوگی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔ اور جس کسی شخص نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہے۔''

تشریح: بخاری ہی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ (اعمال کا دارومدار تو بس نیت پر ہے)۔ مفہوم کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ ایک اہم حدیث ہے جس میں ایک نہایت بنیادی بات واضح الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے صحیح بخاری کے آغاز میں اسی حدیث کو رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو سات مقامات پر نقل کیا ہے جس سے اس حدیث کی افادیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس حدیث کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے تین تابعی (یحییٰ، محمد اور علقمہ) ایک دوسرے سے نقل کرتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ یہ حدیث اسلام کا ثلث ہے۔ یعنی اسلامی تعلیمات کے ایک تہائی حصے کو اس حدیث نے اپنے اندر لے رکھا ہے۔ بعض دوسرے بزرگوں نے اسے ربع اسلام قرار دیا ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک اس حدیث کو فقہ کے ستر ابواب میں دخل حاصل ہے۔ یہ اس حدیث کی جامعیت کا بین ثبوت ہے۔

غلط ارادے سے یا بے ہوشی اور بے خبری کی حالت میں آدمی جو کچھ کرتا ہے اس سے اس کی ترقی نہیں ہوتی۔ اخلاقی و روحانی ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ اعمال کا صدور شعور کی سطح پر ہو۔ آدمی اگر اعلیٰ و ارفع چیزوں کے مقابلے میں چھوٹی اور حقیر چیزوں کو اپنا مقصد قرار دے کر زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو وہ کبھی بھی اعلیٰ مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اس صورتِ حال کا وہ خود ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اعلیٰ مقام کے حصول کا انحصار تو اس کے اپنے فیصلے اور ارادے پر ہے۔ آدمی کے کسی عمل کے پیچھے اگر اصل محرک خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کی تعمیل ہے تو یقیناً یہ اعلیٰ مقام کی طرف اس کی ایک پیش قدمی ہے۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے اس کی نگاہ بے گانہ نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام و ارشادات ہی سے ہمیں اپنی اصل فلاح اور کامرانی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ خدا اور رسولؐ کے حکم کی تعمیل میں نہ صرف یہ کہ ہماری زندگی، زندگی کے اعلیٰ مفہوم و مقاصد سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے بلکہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہی ہے۔

یہ حدیث ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے طرزِ عمل میں ہمیشہ اپنے ارادوں اور نیتوں کا جائزہ لیتے رہیں تا کہ کسی وقت بھی ہماری زندگی حقیقت سے بے گانہ ہو کر نہ رہے۔

〈۲〉 وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيمَا يَرْوِي عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ وَّ

مَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهٗ سَيِّئَةً وَّاحِدَةً۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ اپنے رب عزّ وجل کے متعلق روایت فرماتے ہیں کہ اللہ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں پھر اسے واضح کر دیا ہے۔ چناں چہ جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے پاس ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے۔ اور اگر اس نے ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے پاس دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک بلکہ اور بھی زیادہ لکھ لیتا ہے۔ اس کے برخلاف جس کسی نے کسی برائی کا ارادہ کیا اور وہ اس کا مرتکب نہیں ہوا تو اللہ اس کے لیے اپنے پاس پوری ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور اگر وہ اس کا ارادہ کر کے اس کا مرتکب بھی ہو گیا تو اللہ اس کے حق میں محض ایک برائی لکھتا ہے۔''

تشریح: نیکی کیا ہے؟ اور برائی کسے کہتے ہیں؟ یہ کوئی معمہ نہیں ہے۔ خدا کے یہاں یہ چیز مبہم یا غیر متعین نہیں ہے۔ دائمی قدروں سے جو چیزیں مناسبت رکھتی ہیں حقیقت کی نگاہ میں وہی نیکیاں ہیں۔ برائیاں وہ ہیں جن کا مستقل اور اعلیٰ اقدار سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے بالتفصیل بتا بھی دیا ہے کہ کون سے افعال واعمال دائمی اور اعلیٰ اقدار سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے افعال واعمال ایسے ہیں جو دائمی وآفاقی قدروں سے متصادم ہیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ خدا کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ قرآن میں بھی ہے: قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (الاعراف:۱۵۶) ''فرمایا: اپنے عذاب میں تو میں اسی کو مبتلا کرتا ہوں جسے چاہتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔'' خدا کے یہاں ظلم و بے انصافی نہیں پائی جاتی۔ وہ فیاض اور کریم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی فیاضی اور کرم اندھے کی بانٹ نہیں ہے۔ نیکی اگر نیکی ہے خواہ وہ بہ ظاہر کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہو خدا اسے ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وہ نیکی بھی آدمی کے کسی نہ کسی کردار واخلاق کی مظہر ہوتی ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: ضَمَّنِي النَّبِيُّ ﷺ اِلٰى صَدْرِهٖ وَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا: ''اے اللہ! اسے حکمت عطا فرما۔''

تشریح: حکمت کیا ہے؟ اس کے بارے میں اسلاف کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں جو دراصل حکمت ہی کے کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت کرتے ہیں۔ اپنی اصل کے لحاظ سے حکمت ایک ایسی روشنی، بصیرت یا کیف ہے جس سے حسن و قبح یا خیر و شر دونوں ہی پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ حکمت کوئی اکتسابی چیز نہیں ہوتی۔ یہ ادراک و بصیرت یکسر بہ توفیقِ ربانی حاصل ہوتی ہے۔ یہ حقیقت میں ایک طرح کا الہامی ادراک ہے۔ اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے آدمی کسی لذیذ شے کو چکھے اور اس کی لذت کو اپنی نازک ترین حسیات سے پہچانے اور اس سے پورے طور پر لذت اندوز ہو۔ مالک اور ابورزین کے قول سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حکمت تفقہ فی الدین (دین میں گہری سمجھ) اور اس وجدان کا نام ہے جس کو طمانینت اور نورِ ربّانی کہا جا سکتا ہے۔ اس حکمت کا ظہور جب آدمی کے اقوال و اعمال اور اس کے علمی دائرے میں بھی ہوتا ہے تو اسے مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ مثلاً وعظ و نصیحت، شکر، سخاوت، عدل، حلم، پاک بازی وغیرہ۔ مثال کے طور پر دیکھیں۔ قرآن کی سورۂ لقمان میں ہے: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (لقمان:۱۲) ''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ خدا کا شکر گزار ہو۔'' اس سورہ میں آگے اس شکر و حکمت کے تحت توحید، ایمان بالآخرت، نماز، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مصائب میں صبر اور تکبر اور لوگوں سے بے رخی اختیار کرنے سے اجتناب، چال اور رفتار میں میانہ روی اور گفتگو میں لینت، ان دس امور کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ جن میں سے دوؔ کا تعلق عقائد سے ہے۔ باقی آٹھ امور میں سے چار عزائم اور مصائب میں صبر و استقلال سے کام لینے سے متعلق ہیں۔ اور باقی چار کا تعلق اخلاق سے ہے۔

دراصل شکر ایمان کی اساس اور حکمت کا خاص مظہر ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حکمت پوری زندگی میں حکمراں ہوتی ہے۔ قرآن کا یہ ارشاد کس درجہ حقیقت پر مبنی ہے: وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرۃ:۲۶۹) ''اور جس کسی کو حکمت عطا ہوئی اسے تو خیر کثیر ہاتھ آ گیا۔'' اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہو سکتی۔

(۴) وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ ؓ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَنِ الْقِتَالِ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَقَالَ الرَّجُلُ یُقَاتِلُ غَضَبًا وَّ یُقَاتِلُ حَمِیَّۃً قَالَ فَرَفَعَ رَأْسَہٗ اِلَیْہِ وَمَا رَفَعَ رَأْسَہٗ اِلَیْہِ اِلَّا اَنَّہٗ کَانَ قَائِمًا فَقَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسولِ خدا ﷺ سے راہِ خدا میں جنگ کے بارے میں دریافت کیا۔ کہا کہ ”آدمی غصہ میں لڑتا ہے اور حمیت قومی کی وجہ سے (یا حمیت جاہلیت کے سبب) جنگ کرتا ہے۔“ راوی کہتے ہیں کہ آپؐ نے سر اٹھایا۔ یہ اس لیے کہ وہ شخص کھڑا تھا (اور آپؐ بیٹھے ہوئے تھے)، پھر آپؐ نے فرمایا: ”جو شخص اس لیے لڑے کہ خدا ہی کا بول اونچا رہے تو وہ جنگ راہِ خدا میں ہے۔“

تشریح: نیت کی درستی اور اخلاص کی اہمیت کے علاوہ یہ حدیث اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اسلام میں جنگ یا قتال کا مقصد کس قدر پاک اور بلند ہے۔ ذاتی بغض وعناد اور قومی یا جاہلی حمیت وتعصب جیسی چیزیں اسلام میں ہرگز جنگ کے لیے جواز فراہم نہیں کرتی ہیں۔ اسلام میں جنگ کی اصل غرض وغایت کلمۂ حق کی سربلندی اور نظامِ عدل کا قیام ہے۔ جس جنگ کا حاصل ظلم وفساد ہو اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَآءَ ہٗ وَ مَنْ کَرِہَ لِقَآءَ اللّٰہِ کَرِہَ لِقَآءَ ہٗ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”جو کوئی اللہ سے ملنے کو پسند کرتا ہے تو اللہ بھی اس سے ملنے کو پسند فرماتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔“

تشریح: اپنے رب سے ملاقات ہو یہ مومن کے دل کی اصل مراد ہے۔ یہی خواہش اور امید اس کے دل کو زندہ رکھتی اور اسے ہر قسم کی تاریکیوں سے دور رکھتی ہے۔ جو شخص خدا سے ملنے کا آرزومند ہو اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے دل میں کسی ایسی چیز کو جگہ دے گا جو قابلِ نفرت ہو، پسند اور ناپسند کا تعلق درحقیقت آدمی کے اپنے دل سے ہوتا ہے۔ اگر خدا سے ملاقات کی چاہت اور رغبت اس کے اندر نہیں پائی جاتی تو خدا کی ذات تو بے نیاز ہے۔ خدا کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایسے قدر ناشناس کا قدرداں ہو۔

〈۶〉 وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ یُقْضٰی عَلَیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ رَجُلٌ اِسْتُشْھِدَ فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعْمَتَہٗ فَعَرَفَھَا قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِیْھَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِیْکَ حَتّٰی اسْتُشْھِدْتُّ۔ قَالَ کَذَبْتَ وَ لٰکِنَّکَ قَاتَلْتَ لِاَنْ یُّقَالَ جَرِیْءٌ فَقَدْ قِیْلَ، ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ۔ وَ رَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَ عَلَّمَہٗ وَ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعَمَہٗ فَعَرَفَھَا۔ قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِیْھَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَ عَلَّمْتُہٗ وَ قَرَأْتُ فِیْکَ الْقُرْاٰنَ۔ قَالَ: کَذَبْتَ وَ لٰکِنَّکَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِیُقَالَ عَالِمٌ وَّ قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ لِیُقَالَ ھُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِیْلَ، ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ۔ وَ رَجُلٌ وَّسَّعَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اَعْطَاہُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ کُلِّہٖ فَاُتِیَ بِہٖ فَعَرَّفَہٗ نِعَمَہٗ فَعَرَفَھَا۔ قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِیْھَا؟ قَالَ: مَا تَرَکْتُ مِنْ سَبِیْلٍ تُحِبُّ اَنْ یُّنْفَقَ فِیْھَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِیْھَا لَکَ۔ قَالَ: کَذَبْتَ وَ لٰکِنَّکَ فَعَلْتَ لِیُقَالَ ھُوَ جَوَادٌ فَقَدْ قِیْلَ، ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ ثُمَّ اُلْقِیَ فِی النَّارِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ سے سنا آپؐ فرماتے تھے کہ ”قیامت کے دن سب سے پہلے جس کے خلاف فیصلہ سنایا جائے گا وہ شخص ہوگا جس نے جامِ شہادت نوش کیا ہوگا۔ وہ خدا کے حضور حاضر کیا جائے گا تو خدا اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ انھیں تسلیم کرے گا۔ خدا دریافت فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے تیرے لیے جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوگیا۔ خدا فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا، حقیقت یہ ہے کہ جنگ تو نے اس لیے کی کہ لوگ تیرے بارے میں کہیں کہ ”وہ بہادر ہے۔“ تو تجھے بہادر کہا جاچکا۔ پھر خدا کے حکم کے مطابق اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جاکر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

”اور ایک وہ شخص ہوگا جو عالم و معلم اور قرآن کا پڑھنے والا ہوگا۔ وہ خدا کے حضور پیش ہوگا تو خدا اسے بھی اپنی نعمتیں یاد دلائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ خدا فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور اسے دوسروں کو بھی سکھایا اور تیرے

لیے قرآن پڑھا۔ خدا فرمائے گا کہ تو نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ تو نے علم محض اس لیے حاصل کیا کہ لوگ تیرے بارے میں کہیں کہ ''وہ عالم ہے۔'' اور قرآن تو نے اس لیے پڑھا کہ لوگ تیرے بارے میں کہیں کہ ''وہ قاری ہے۔'' تو تجھے یہ سب کہا جا چکا۔ پھر خدا کے حکم کے مطابق اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جا کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

''اور ایک وہ شخص ہوگا جسے اللہ نے کشادگی اور فراخی بخشی تھی اور ہر قسم کی دولت سے اسے نوازا تھا۔ اسے حاضر کیا جائے گا اور اسے بھی خدا اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ ان کا اقرار کرے گا۔ پھر خدا پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے کوئی بھی ایسا راستہ جس میں خرچ کرنا تو پسند کرتا تھا نہیں چھوڑا کہ اس میں تیری خاطر خرچ نہ کیا ہو۔ خدا فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو نے محض اس لیے خرچ کیا کہ لوگ تیرے متعلق کہہ سکیں کہ ''وہ سخی اور فیاض ہے۔'' تو یہ لقب تجھے مل چکا۔ پھر خدا کے حکم کے مطابق اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جا کر جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔''

تشریح: اس حدیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا کارنامۂ حیات بھی خدا کی نگاہ میں ہیچ ہے اگر اس کے پیچھے خدا کی خوشنودی کی طلب کام نہ کر رہی ہو۔ خدا اپنے بندے کو چاہتا ہے بہ شرطے کہ بندہ بھی خدا کو چاہے۔ آدمی وہیں ہوتا ہے جہاں اس کی نیت یا ارادہ ہوتا ہے۔ اصل میں آدمی اپنی نیت میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس کی پہچان اس کی نیت ہی سے ہو سکتی ہے۔ نیت اگر طلب غیر کی ہے تو یہ ایسا سنگین جرم ہے جس کا ارتکاب بندے کو نہ صرف یہ کہ جنت سے محروم کر دیتا ہے بلکہ اسے جہنم کا سزاوار بھی بنا دیتا ہے۔ نیت اگر درست نہیں ہے تو اس صورت میں آدمی بہ ظاہر نیک عمل کر رہا ہوتا ہے لیکن حقیقت کی نگاہ میں وہ ایک ناقابلِ معافی جرم کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِّمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِّنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِىْ رِيْحَهَا۔ ''جس نے اللہ کی رضامندی کے علم کو دنیا کی غرض سے سیکھا قیامت کے دن اسے جنت کی بو بھی نہ مل سکے گی۔''

ایک اور حدیث ہے: عَنْ اَبِىْ مُوْسٰىؓ اَنَّ اَعْرَابِيًّا جَآءَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

فَقَالَ: اِنَّ الرَّجُلَ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَ یُقَاتِلُ لِیُحْمَدَ وَ یُقَاتِلُ لِیَغْنَمَ وَ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانَہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ قَاتَلَ حَتّٰی تَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ اَعْلٰی فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ (ابوداؤد) ”حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ ایک شخص اپنے ذکر کے لیے لڑتا ہے، ایک لڑتا ہے اپنی تعریف اور ناموری کی غرض سے، ایک لڑتا ہے کہ مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آئے اور ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اس کا مرتبہ ظاہر ہو (کہ شجاعت اور بہادری میں اسے مقام بلند حاصل ہے)، اس پر رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو (خدا کا بول بالا ہو) اسی کی جنگ اللہ عزوجل کی راہ میں محسوب ہوگی۔“

〈۷〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ طَلَبَ الشَّھَادَۃَ صَادِقًا اُعْطِیَھَا وَ لَوْلَمْ تَصِبْہُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص سچے دل سے شہادت کا طالب ہو اسے درجۂ شہادت حاصل ہو جائے گا گو اس کی نوبت نہ آئے کہ وہ شہید ہو۔“

تشریح: اسی طرح کی ایک اور حدیث ہے: مَنْ سَأَلَ اللّٰہَ الشَّھَادَۃَ بِصِدْقٍ بَلَّغَہُ اللّٰہُ مَنَازِلَ الشُّھَدَآءِ وَ اِنْ مَّاتَ عَلٰی فِرَاشِہٖ۔ (مسلم۔عن سہل بن حنیف) ”جو شخص سچے دل سے شہادت طلب کرتا ہے خدا اسے شہیدوں کی منزلوں تک پہنچا دیتا ہے اگرچہ اس کی موت اس کے اپنے بستر ہی پر کیوں نہ واقع ہو۔“

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ دین میں صحتِ نیت اصلاً مطلوب ہے۔ نیت کے مقابلے میں اعمال کی حیثیت ثانوی قرار پاتی ہے۔ کسی عذر کی بنا پر اگر کوئی شخص اعمال میں قاصر رہا تو اس سے خدا کے ساتھ اس کی وفاداری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بندہ اگر اللہ کے لیے اپنے کو انتہائی طور پر پیش کر دینا چاہتا ہے تو وہ کامیاب ہے۔ بندہ اگر خدا کے دین کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہے تو وہ خدا کا وفادار ہے خواہ عملاً اس کی نوبت نہ بھی آئے۔

〈۸〉 وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ غَزَاۃٍ فَقَالَ: اِنَّ بِالْمَدِیْنَۃِ لَرِجَالاً مَّا سِرْتُمْ مَسِیْرًا وَّلَا قَطَعْتُمْ وَادِیًا اِلَّا کَانُوْا مَعَکُمْ حَبَسَھُمُ الْمَرَضُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک لڑائی میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے تو آپؐ نے فرمایا: ”مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم جب بھی چلتے ہو یا کوئی وادی طے کرتے ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتے ہیں۔ مرض نے انھیں وہاں روک لیا ہے۔“

تشریح: یعنی خدا کی راہ میں نکلنے کا انھیں بھی اجر و ثواب حاصل ہوگا اس لیے کہ معقول عذر کی وجہ سے انھیں گھر پر رکنا پڑا۔ وہ کوئی جان چرانے والے لوگ نہیں ہیں۔ ان کا شمار خدا کے ہاں دین کی خدمت انجام دینے والے لوگوں ہی میں ہوگا کیوں کہ اگر چہ وہ اپنے ہاتھ پیر سے کام نہ کر سکے لیکن دل سے وہ ہر خدمت کے لیے تیار رہے۔

﴿۹﴾ وَ عَنْ سَلْمَانَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: رِبَاطُ يَوْمٍ وَّ لَيْلَةٍ خَيْرٌ مِّنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَّ قِيَامِهٖ وَ اِنْ مَّاتَ جَرٰى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِىْ كَانَ يَعْمَلُهٗ وَ اُجْرِىَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ وَ اَمِنَ الْفُتَّانَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت سلمانؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ”راہِ خدا میں ایک شب و روز پہرہ چوکی دینا مہینہ بھر روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ جو مرے گا تو اس کا یہ عمل برابر جاری رہے گا، اس کا رزق بھی جاری ہو جائے گا اور وہ قبر کے فتنے سے بے خوف ہوگا۔“

تشریح: انسان کے اعمال کا سلسلہ اس کی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے۔ حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ صدقۂ جاریہ، علم نافع اور اولاد صالح کے علاوہ آدمی کے دیگر اعمال کا سلسلہ موت کے بعد منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلامی سرحد وغیرہ کی حفاظت و نگہبانی کا کام بھی ایسی اہمیت اور دور رس نتائج کا حامل ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کا اجر و ثواب اسی طرح ملتا رہے گا جس طرح زندگی میں عمل کے وقت ملتا ہے۔ ایسا شخص اس رزق خاص کا بھی مستحق قرار پاتا ہے جو شہیدوں کے لیے مقدّر ہے۔ مزید برآں قبر کی منزل بھی اس کے لیے آسان کر دی جاتی ہے۔

﴿۱۰﴾ وَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَمْوَالِكُمْ وَ لٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر تمھارے دلوں اور تمھارے اعمال پر ہوتی ہے۔"

تشریح: بعض روایات میں یہ الفاظ ملتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَنْظُرُ اِلٰی اَجْسَادِکُمْ وَلاَ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ وَ لٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ۔ (جمع الفوائد، جلد دوم) "خدا تمھارے جسموں، تمھاری صورتوں اور تمھارے اعمال (ظاہری) کو نہیں دیکھتا بلکہ (اصلاً) وہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے۔"

دلوں کو دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نظر حقیقت میں اس پر ہوتی ہے کہ تمھارے جذبات اور تمھارے نفس کی کیفیات کیا ہیں۔ تمھارے اندر اخلاص اور للّٰہیت ہے یا نہیں۔ جذبۂ ایمان سے تمھارے قلوب معمور ہو سکے ہیں یا نہیں۔ دل میں اگر ایمان کی جگہ کفر، پاکیزہ جذبات اور اخلاص کی جگہ عدم اخلاص اور گندے قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں تو اچھی صورتوں اور ظاہری اعمال کی خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔

﴿۱۱﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَآءِ عَنِ الشِّرْکِ فَمَنْ عَمِلَ عَمَلاً اَشْرَکَ فِیْہِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُہٗ وَ شِرْکَہٗ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ فَاَنَا مِنْہُ بَرِیٓءٌ ھُوَ لِلَّذِیْ عَمِلَہٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں شرکاء کے شرک سے بے نیاز ہوں۔ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ دوسرے کو شریک کیا تو میں اس کو اور اس کے شرک دونوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔" اور ایک روایت میں ہے کہ "میں اس سے بری ہوں وہ اسی کے لیے ہے عمل میں اس نے جس کو میرے ساتھ شریک کیا۔"

تشریح: دین میں مطلوب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہمارے اعمال خدا کے لیے ہوں بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہمارے اعمال خدا ہی کے لیے ہوں۔ کسی اور کی خوش نودی ہمارے پیش نظر نہ ہو۔ اگر ہمارے اعمال ایسے نہیں ہیں تو وہ کبھی بھی خدا کے یہاں شرف قبولیت حاصل نہ کر سکیں گے۔ ہمارا خدا غیور ہے، وہ شرک کا روادار ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ایک حدیث میں ہے: مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَ مَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ

اَشْرَکَ وَ مَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ (احمد) ''جس کسی نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کی خاطر روزہ رکھا وہ شرک کا مرتکب ہوا اور جس کسی نے دکھانے کے لیے صدقہ دیا اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔''

〈۱۲〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَجُلاً قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَتٰی السَّاعَۃُ؟ قَالَ: وَیْلَکَ وَمَا اَعْدَدْتَّ لَھَا؟ قَالَ: مَا اَعْدَدْتُّ لَھَا اِلَّا اَنِّیْ اُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ قَالَ: اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ۔ قَالَ اَنَسٌؓ فَمَا رَأَیْتُ الْمُسْلِمِیْنَ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَرْحَھُمْ بِھَا۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! قیامت کب واقع ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ''افسوس ہے تجھ پر، اس کے لیے تو نے کیا تیاری کی ہے؟'' اس نے عرض کیا کہ میں نے تیاری تو کوئی نہیں کی ہے البتہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہے۔''

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ اسلام کے بعد مسلمانوں کو کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا آپؐ کے اس ارشاد سے وہ خوش ہوئے تھے۔''

تشریح: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا کہ قیامت کب ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو نے اس کے لیے کیا سامان کیا ہے؟'' اس نے عرض کیا کہ نماز، روزے وغیرہ کی کثرت تو میرے پاس نہیں ہے البتہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ (بخاری و مسلم) ''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے۔''

اخلاص کی اصل روح محبت ہی ہے۔ محبت ہی ہے جو آدمی کو کسی کے لیے ہر پہلو سے یکسو کر دیتی ہے ۔

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

محبت، اخلاص کی اصل روح ہے۔ اس لیے بندے کی زندگی اور اس کی عاقبت کے سلسلے میں اسے فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کی اصل روح و غایت بھی محبتِ الٰہی ہی ہے۔ چناں چہ امام ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے کہ خدا کی محبت ہی اصلِ دین

ہے۔ اسی محبت کے کمال پر دین کے کمال کا تمام تر انحصار ہے۔ اس محبت میں کسی قسم کی کمی نقصِ دین کے مرادف ہے۔ (دیکھیں فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ، جلد ۱۰، صفحہ ۵۷)

صحابۂ کرامؓ کے لیے حضورؐ کا یہ ارشاد کہ "تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت رکھتا ہے" ایک خوش خبری تھی۔ وہ اپنے اعمال کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے کہ اس سلسلے میں ان سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہوگی لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے دل خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت سے معمور ہیں۔ خدا اور رسولؐ کی محبت ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن چکی تھی۔ اس لیے حضورؐ کی زبان سے یہ سن کر کہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہے انھیں یقین ہو گیا کہ خدا انھیں اپنی قربت اور اپنے رسولؐ کی معیت سے محروم نہیں کرے گا۔ آدمی کے حق میں اصل فیصلہ کن چیز وہ محبت و الفت ہے جو وہ کسی کے ساتھ رکھتا ہے۔

﴿۱۳﴾ وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ یَبْلُغُ بِهِ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَتٰی فِرَاشَهٗ وَ هُوَ یَنْوِیْ اَنْ یَّقُوْمَ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ فَغَلَبَتْهُ عَیْنَاهُ حَتّٰی اَصْبَحَ، کُتِبَ لَهٗ مَا نَوٰی، وَ کَانَ نَوْمُهٗ صَدَقَةً عَلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ۔ (نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اپنے بستر پر اس نیت و ارادہ سے لیٹا کہ وہ نماز تہجد کے لیے اٹھے گا، لیکن نیند کا اس پر ایسا غلبہ ہوا کہ وہ صبح کو ہی اٹھ سکا۔ تو جس چیز کا اس نے ارادہ کیا وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔ اور اس کی نیند اس کے اپنے رب کی جانب سے اس کے لیے ایک فضل و انعام ہے۔"

تشریح: یعنی اپنی نیت کی وجہ سے اسے تہجد کا اجر و ثواب مل گیا۔ وہ شب میں بسترِ استراحت پر آرام کرتا رہا لیکن حقیقت کی نگاہ میں وہ شب بیدار قرار پایا۔ یہ آرام و سکونِ خواب اس کے لیے خدائے بزرگ و برتر کا ایک صدقہ و انعام ہے۔

انسان کی نیت اور اس کا ارادہ ہی اصل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا ہے: اِنَّمَا یُبْعَثُ النَّاسُ عَلٰی نِیَّاتِهِمْ۔ (ابن ماجہ) "لوگ قیامت کے دن اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے۔" یعنی جیسی ان کی نیتیں ہوں گی ان ہی کے لحاظ سے وہ اچھے یا برے انجام سے دوچار ہوں گے۔

﴿۱۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ

يُرِيدُ اَدَاءَ هَا اَدَّى اللّٰهُ عَنهُ، وَ مَنْ اَخذَ يُرِيدُ اِتلَافَهَا اَتلَفَهُ اللّٰهُ عَلَيهِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے لوگوں کا مال بہ طور قرض لیا اس ارادے سے کہ اسے ادا کردے گا (اور کسی مجبوری سے ادا نہ کرسکا) تو اللہ اس کی طرف سے ادا کردے گا اور جس کسی نے قرض لیا لیکن نیت اس کی اسے ادا کرنے کی نہیں ہے تو اللہ اس کی اس بدنیتی کی وجہ سے اسے برباد کرکے رہے گا۔''

تشریح: یعنی نیت اگر درست ہے تو قرض ادا نہ ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مجرم نہیں ٹھہرے گا۔ قرض بھی خدا اس کی جانب سے ادا کردے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا ہی میں ادا کرنے کا سامان کردے۔ لیکن اگر نیت اس کی خراب ہے تو نیت کی یہ خرابی اسے لے ڈوبے گی، وہ ہلاکت سے ہرگز نہ بچ سکے گا۔ خدا ہم سبھی کو ہر طرح کی نفسانیت اور غلط رجحانات سے محفوظ رکھے۔ آمین!

اصل جرم و گناہ نیت کی خرابی ہے۔ عذر معقول اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے: اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَ مِنْ اُمْنِيَّتِهٖ اَنْ يَّفِيَ لَهٗ فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيْعَادِ فَلاَ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (ابوداؤد، ترمذی۔ عن زید بن ارقم) ''جب آدمی اپنے کسی بھائی سے کوئی وعدہ کرے اور اس کی یہ نیت ہو کہ وہ اس وعدہ کو پورا کرے گا لیکن کسی وجہ سے وہ اس کو پورا نہ کرسکے اور وہ وعدہ پر نہ آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' اللہ آدمی کی نیت اور اس کی مجبوریوں دونوں ہی سے بہ خوبی واقف ہوتا ہے۔ معذور کی گرفت کرنا اس کی شانِ رحمت اور عدل کے منافی ہے۔ ان واضح تصریحات کے بعد بھی کیا اسلام کے دینِ فطرت ہونے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے؟

﴿۱۵﴾ وَ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ اَعْطٰى لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے محبت کی تو اللہ کے لیے، نفرت و بیزاری اختیار کی تو اللہ کے لیے، دیا تو اللہ کے لیے اور اپنا ہاتھ روکا تو اللہ ہی کے لیے، یقیناً اس نے اپنے ایمان کو درجۂ کمال تک پہنچادیا۔''

تشریح: محبت، نفرت، دینا اور نہ دینا اسی کا نام زندگی ہے۔ انسان کی زندگی میں یہ سبھی چیزیں پیش آتی ہیں۔ ایمان اور کامل ایمان کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کسی اور جذبے کے تحت نہیں بلکہ محض خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے ہو۔ ایمان کے لحاظ سے کامل شخص وہی ہے جو محبت

اسی سے رکھتا ہے جس سے محبت کا رشتہ رکھنا اللہ کو محبوب ہے۔ جس شخص سے خدا بیزار ہے اس سے وہ بھی بیزار ہوگا۔ وہ خرچ وہاں کرے گا جہاں خدا نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہاں اس کا ہاتھ رک جائے گا جہاں خرچ کرنا خدا کو پسند نہیں۔

عِلم

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ: اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَّطْلُبُ فِیْهِ عِلْمًا سَلَکَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِیْقًا مِّنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ وَ اِنَّ الْمَلٰئِکَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا لِّطَالِبِ الْعِلْمِ وَ اِنَّ الْعَالِمَ لَیَسْتَغْفِرُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْحِیْتَانُ فِیْ جَوْفِ الْمَآءِ وَ اِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰی سَائِرِ الْکَوَاکِبِ وَ اِنَّ الْعُلَمَآءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَآءِ وَ اِنَّ الْاَنْبِیَآءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّ اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: ”جو کوئی حصولِ علم کی غرض سے راہ چلے تو خدا اس کے سبب سے اسے جنت کی ایک راہ چلاتا ہے۔ فرشتے طالب علم کی خوشی کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں اور یقیناً عالم کے لیے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں مغفرت طلب کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ مچھلیاں بھی جو پانی میں ہوتی ہیں۔ عابد پر عالم کو ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو تمام تاروں پر فضیلت حاصل ہے۔ بلاشبہ علماء ہی پیغمبروں کے وارث ہیں۔ پیغمبروں نے کسی کو دینار و درہم کا وارث نہیں بنایا۔ انھوں نے محض علم کی میراث چھوڑی۔ پس جس کسی نے علم حاصل کیا اس نے ہی حصہ کامل حاصل کیا۔“

تشریح: ابوامامہؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: **فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاکُمْ۔** (ترمذی) ”عالم کو عابد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی فضیلت مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص کے مقابلے میں حاصل ہے۔“

اس حدیث سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں علم کا کیا مقام ہے۔ علمِ دین ہی وہ دولت ہے جسے لے کر انبیاء علیہم السلام دنیا میں آئے اور اپنے پیچھے وہ اسی کو بہ شکل میراث

چھوڑ گئے۔ جو شخص اس سے فیض یاب نہ ہوا، اس سے بڑھ کر محروم کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اور جس شخص نے اس میراث کو حاصل کرلیا اس کے حصے میں کثیر دولت آگئی۔ اس نے کثیر کو قلیل پر اور وقیع کو غیر وقیع پر ترجیح دی۔

ذی علم محبوب خلائق ہوتا ہے۔ اس کی محبوبیت کی شان سارے عالم میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کو بھی ایسے شخص سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنْ رَّجُلٍ یَّسْلُکُ طَرِیْقًا یَّطْلُبُ فِیْهِ عِلْمًا اِلَّا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ بِهٖ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّةِ وَ مَنْ اَبْطَأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ یُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص بھی علم کی طلب میں راہ چلتا ہے لازماً اس کی وجہ سے اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ اور جس کا ساتھ دینے میں اس کے عمل نے دیر کی تو اس کے ساتھ اس کا نسب کچھ شتابی نہ کرے گا۔“

تشریح: علم کی طلب اپنے نتیجے کے لحاظ سے جنت کی طلب اور علم کا حصول اپنی حقیقت کے لحاظ سے جنت کا حصول ہے۔ علم کے بغیر آدمی اس راہ سے بے خبر ہی رہتا ہے جو جنت کی طرف نکلتی ہے۔ علم کے بغیر کسی عمل اور خاص طور سے ایسے عمل کی توقع نہیں کی جاسکتی جس کے پیچھے صحیح فہم و شعور اور بہترین قسم کے جذبات پائے جاسکیں۔ علم سے محروم شخص مطلوب اعمال و کردار کا حامل نہیں ہوسکتا۔ ایسا شخص خواہ کتنے اعلیٰ نسب اور اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو، عمل کے لحاظ سے اس کی زندگی میں جو خلا باقی رہتا ہے اس کے نسب سے اس کی تلافی ممکن نہیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ مُعَاوِیَةَ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ ؓ ذَکَرَ حَدِیْثًا رَّوَاهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص کے ساتھ خدا بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرماتا ہے۔“

تشریح: کسی کو دین میں سمجھ اور بصیرت حاصل ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے پیش نظر

اس کے حق میں خیر اور بھلائی ہے۔ وہ خاسر اور ناکام نہ ہوگا۔ دین میں سمجھ اور بصیرت حاصل نہ ہوتو آدمی دین کے تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ دین کے مطالبات کو صحیح انداز میں پورا کرے گا۔ دین میں سمجھ حاصل ہونے کے بعد ہی ہم کسی سے یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ دین کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرے گا اور نادانی میں کوئی ایسی روش اختیار نہیں کرے گا جو دین یا اس کی اپنی شخصیت کے لحاظ سے مہلک اور تباہ کن ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے: اَلاَ لاَ خَیرَ فِیۡ عِبادَۃٍ لَّیسَ فِیۡھَا تَفَقُّہٌ وَّلاَ عِلۡمٍ لَیسَ فِیۡہِ تفَھُّمٌ وَّلاَ قِرأَۃٍ لَّیسَ فِیۡھَا تَدَبُّرٌ۔ ''سن رکھو، اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تفقہ نہیں ہے، اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اور اس قرآن خوانی میں بھی بھلائی نہیں جس میں تدبّر نہیں ہے۔''

اسی طرح ایک اور حدیث ہے: اَفۡضَلُ النَّاسِ اَفۡضَلُھُمۡ عَمَلاً اِذَا فَقِھُوۡا دِیۡنَھُمۡ۔ ''لوگوں میں سب سے اچھے وہ ہیں جو ان میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں جب کہ وہ اپنے دین میں سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔''

کون شخص سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں حدیث میں ایک مثال بیان ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ طُوۡلَ الصَّلٰوۃِ الرَّجُلِ وَ قِصَرَ خُطۡبَتِہٖ مَئِنَّۃٌ مِّنۡ فِقۡھِہٖ۔ (مسلم) ''کسی شخص کا نماز کو طویل اور اپنے خطبہ کو مختصر کرنا اس کے فقیہ یعنی سمجھ دار ہونے کی علامت ہے۔''

نماز اور خطبہ ہی میں نہیں دوسرے امور میں بھی فقیہ اور غیر فقیہ میں آپ فرق پائیں گے۔ فقیہ (سمجھ دار) کی توجہ اصل مقصد کی طرف سے نہیں ہٹ سکتی جب کہ غیر فقیہ دوسری چیزوں کی طرف زیادہ مائل دکھائی دے گا۔ اس سلسلے میں ایک بہترین مثال اس حدیث میں پیش کی گئی ہے۔ غیر فقیہ طول طویل خطبہ دے گا یہاں تک کہ وہ نماز کو مختصر کردے گا لیکن خطبہ کو مختصر نہیں کرسکتا۔ لیکن فقیہ شخص ایسا نہیں کرسکتا۔ خطبہ نصیحت ہے اور نماز بہ ذات خود عبادت ہے۔ جس نے نماز مختصر کی اور خطبہ لمبا دیا وہ فقیہ نہیں کیوں کہ وہ خطبہ میں پابندیِ شرع اور عبادت کی تلقین کرتا ہے اور خود اپنے عمل سے اس کی تردید کرتا ہے کہ نماز جیسی عبادت کو مختصر کرتا ہے۔ عمل سے بے گانگی علم کے نقص کی دلیل ہے۔ حقیقی علم تو وہی ہے جو عمل میں ظاہر ہو۔

〈۴〉 وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ الرَّجُلَ لَیَکُوْنُ مِنْ اَھْلِ الصَّلٰوۃِ وَالصَّوْمِ وَالزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَالْعُمْرَۃِ حَتّٰی ذَکَرَ سِھَامَ الْخَیْرِ کُلَّھَا، وَمَا یُجْزٰی یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِلَّا بِقَدْرِ عَقْلِہٖ۔ (بیہقی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص نماز اور روزے کا پابند، زکوٰۃ ادا کرنے والا اور حج اور عمرہ کرنے والا ہوتا ہے___یہاں تک کہ آپؐ نے تمام نیکیوں کا ذکر فرمایا___ مگر قیامت کے روز اسے اس کی عقل کے مطابق ہی صلہ ملے گا۔''

تشریح: یہ ایک نہایت اہم حدیث ہے۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دینِ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کی ساری قدریں فطرت کے مطالبات کے عین مطابق ہیں۔ دین میں اصل اہمیت اگر عقل وفہم کو حاصل ہے تو اس کی وجہ ہے۔ ظاہری اعمال کے پیچھے آدمی کے کیسے جذبات اور محرکات کام کرتے ہیں اس کا بڑا انحصار اس کی عقل وفہم پر ہوتا ہے۔ ہمارے اعمال کی اصل قدر وقیمت ہمارے جذبات اور احساسات ہی متعین کرتے ہیں۔ اس لیے اجر وثواب عطا کرنے میں اصلاً عقل وفہم کا لحاظ کرنا عدل وانصاف اور فطرت کے عین مطابق ہے۔

〈۵〉 وَ عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا اَمَرَھُمْ اَمَرَھُمْ مِّنَ الْاَعْمَالِ بِمَا یُطِیْقُوْنَ، قَالُوْا اِنَّا لَسْنَا کَھَیْئَتِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ قَدْ غَفَرَ لَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ فَیَغْضَبُ حَتّٰی یُعْرَفَ الْغَضَبُ فِیْ وَجْھِہٖ ثُمَّ یَقُوْلُ: اِنَّ اَتْقَاکُمْ وَ اَعْلَمَکُمْ بِاللّٰہِ اَنَا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ جب لوگوں کو حکم دیتے تو ان ہی اعمال (کو اختیار کرنے) کا حکم دیتے جن کی ان کے اندر طاقت ہوتی۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ کے مثل نہیں ہیں۔ اللہ نے تو آپؐ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردیے ہیں۔ اس پر آپؐ سخت خفا ہوئے یہاں تک کہ آپؐ کے چہرے سے خفگی ظاہر ہونے لگی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''تم سب سے زیادہ ڈر رکھنے والا اور اللہ کو جاننے والا میں ہوں۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے: فَوَ اللّٰہِ اِنِّیْ لَاَعْلَمُھُمْ بِاللّٰہِ وَ اَشَدُّھُمْ لَہٗ خَشْیَۃً۔ (بخاری) ''بخدا میں سب سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور سب سے بڑھ کر اس کا خوف رکھتا ہوں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین میں اصلاً مطلوب یہ نہیں ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشقتوں اور پریشانیوں میں ڈال لیں۔ بلکہ حقیقت میں تو یہ دین اس لیے آیا ہے کہ ان بندھنوں کو کاٹ دے جن میں لوگ جکڑے ہوئے ہوں اور اس بوجھ سے انھیں نجات بخشے جس سے ان کی کمریں جھکی جارہی ہوں۔ خدا کا دین تو لوگوں کو مشکلات میں ڈالنے کے بہ جائے ان کی مشکلات کو رفع کرنے کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے اس دین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے: اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ۔ (یقیناً یہ دین آسان ہے)۔'' ایک روایت میں ہے: اِنَّ خَیْرَ دِیْنِکُمْ اَیْسَرُہٗ۔ (''بہترین دین تمھارا وہ ہے جو آسان ہو)۔'' مشکل پسندی اور اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا کرنا دین نہیں ہے۔ دین حقیقت میں وہ چیز ہے جو ہماری زندگی میں شامل و داخل ہونے کا تقاضا کرے۔ غیر فطری شے کبھی بھی ہماری انفرادی یا اجتماعی شخصیت کا جزو لاینفک نہیں بن سکتی۔ دین وہی ہے جو زندگی بن سکے، نہ کہ زندگی کا بوجھ ہو۔

ایک دوسری حقیقت اس حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ دین کی اصل بنیاد علم باللہ ہے۔ اسی پر دین کی ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ خدا کو جانتا اور پہچانتا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی زندگی دین کے سانچے میں ڈھل سکے گی۔ قرآن میں ہے: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (''اللہ سے تو اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو جانتے اور سمجھتے ہیں)۔''

علم باللہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی خدا کی ذات کی کنہ کو پالے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی ہستی، اس کی عظمت اور برتری کا پورا یقین حاصل ہوجائے، وہ یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کائنات میں ایک عظیم ہستی کی کارفرمائی بین طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ آفاق وانفس میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں کی طرف سے غافل اور اندھا بن کر نہ رہے۔ وہ خدا کی صفات اور خُلق خداوندی سے بے خبر نہ ہو۔ دین سے وابستگی درحقیقت خدا سے وابستگی ہی کا دوسرا نام ہے۔ دین خدا کی مرضی اور منشائے خداوندی کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہے جو شخص خدا کو پہچانتا ہے اسے اس کی عظمت کا بھی احساس ہوگا، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دین کے پسندیدہ طریقے سے انحراف کرے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جب میں تم سب سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں تو پھر میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں دین کے مطلوب اور پسندیدہ تر طریقے کو نظر انداز کرسکوں۔ تمھارے لیے میرا طریقہ ہی اسوہ ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا حَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ: رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهٗ عَلٰی هَلَکَتِهٖ فِی الْحَقِّ وَ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَ یُعَلِّمُهَا. (بخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''حسد صرف دو آدمیوں کے معاملے میں جائز ہے: ایک تو وہ شخص ہے جسے خدا نے مال دیا پھر اسے راہِ حق میں لٹانے کی توفیق بھی عنایت کی۔ اور دوسرا وہ شخص ہے جسے خدا نے حکمت سے نوازا تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور (لوگوں کو) اس کی تعلیم دیتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں حسد رشک کے معنی میں سمجھیں۔ اس میں نہایت مبالغہ ہے کہ ان دونوں خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے۔

معلوم ہوا یہی دو شخص جن کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ جن کی زندگی اتنی کام یاب ہے کہ ان کے مقابلے میں کسی کو کام یاب ترین انسان نہیں کہا جاسکتا۔ اپنی زندگی میں کوئی اپنی ذات کے لیے کتنا ہی سامان عیش وعشرت فراہم کرلے لیکن حقیقت کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کسی کا قول ہے: ''اس دنیا میں ہم جو لیتے ہیں وہ نہیں بلکہ جو دیتے ہیں وہ ہمیں دولت مند بناتا ہے۔''

ان دو خوبیوں کے سوا جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اور کوئی خوبی نہیں جس کو وزن دیا جاسکے۔ اس لیے ان کے علاوہ کسی اور چیز پر رشک یا حسد صرف ہماری کوتاہ بینی اور سطحیت پسندی ہی کی علامت ہوسکتی ہے۔ حسد تو بدخُلقی ہے۔ اگر حسد جائز ہوتا تو دنیا میں دو ہی خوبیاں ایسی ہیں جن پر کوئی حسد کرسکتا تھا جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: لَوْ کُنْتُ اٰمُرُ اَحَدًا اَنْ یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ، لَاَمَرْتُ الْمَرْأَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا۔ (ترمذی) ''اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔''

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلٰثَةِ اَشْیَاءٍ: صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ اَوْ عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَّدْعُوْا لَهٗ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ البتہ تین چیزیں ایسی ہیں جو اس سے مستثنیٰ ہیں: صدقۂ جاریہ یا علم جس سے نفع حاصل کیا جائے یا اولاد صالح جو اس کے لیے دعا کرے۔''

تشریح: صدقۂ جاریہ جیسے اوقاف، مسجد کی تعمیر، کنواں وغیرہ۔ کسی کو تعلیم دی یا کوئی مفید کتاب لکھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس سے لوگوں کو نفع پہنچتا رہتا ہے۔

〈۸〉 وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ اِلْخُدْرِیِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَنْ یَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَیْرٍ یَّسْمَعُہٗ حَتّٰی یَکُوْنَ مُنْتَھٰہُ الْجَنَّۃَ۔ (ترمذی)

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مومن کا پیٹ بھلائی (علم وحکمت کی باتوں) سے کبھی بھرتا نہیں، وہ اسے سنتا رہتا ہے یہاں تک کہ بالآخر وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔''

تشریح: علم وہی ہے جس سے آدمی کی فلاح اور بھلائی کا کوئی نہ کوئی تعلق ہو۔ نیکی کی باتوں کے سننے سے مومن کو کبھی سیری حاصل نہیں ہوتی۔ وہ تو ایسی باتوں کے سننے اور جاننے کا حریص ہوتا ہے۔ جس طرح دنیا پرست دنیا کا حریص ہوتا ہے خواہ اس کے پاس کتنی ہی زیادہ دولت سمٹ کر آجائے لیکن وہ دولت سے اکتاتا نہیں۔ ٹھیک اسی طرح مومن علم وحکمت اور معرفت کا بھوکا ہوتا ہے۔ وہ علم سے فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ یہ چیز اس کے لیے تسکین کا باعث بھی ہوتی ہے اور عملی زندگی کے لیے سامان ہدایت بھی۔ ایسا شخص راہ راست پر قائم رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنے لیے کامل سکون وراحت کا سامان مہیا پاتا ہے۔

〈۹〉 وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ھَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا؟ قَالُوْا: اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ قَالَ: اَللّٰہُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِیْ اٰدَمَ وَ اَجْوَدُھُمْ مِنْۢ بَعْدِیْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَہٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَمِیْرًا وَّحْدَہٗ اَوْ قَالَ: اُمَّۃً وَّاحِدَۃً۔ (بیہقی)

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ سب سے بڑھ کر فیاض کون ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ

خوب جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ سب سے بڑھ کر فیاض ہے، پھر اولادِ آدم میں سب سے بڑھ کر میں فیاض ہوں۔ اور میرے بعد لوگوں میں سب سے بڑھ کر فیاض وہ شخص ہوگا جس نے علم حاصل کیا پھر اسے پھیلایا۔ وہ قیامت کے دن ایک امیر کی شکل میں آئے گا۔ یا آپؐ نے فرمایا کہ اس حیثیت سے آئے گا کہ وہ اپنی ذات سے ایک پوری امت ہوگا۔''

تشریح: فیاضی ایک لائقِ تحسین بنیادی وصف ہے۔ تمام اخلاقی محاسن کی اصل روح فیاضی ہی ہے۔ فیاضی دراصل حیات کی علامت بلکہ عین حیات ہے۔ مرے ہوئے آدمی سے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ درخت اسی وقت تک سایہ اور پھل دیتا ہے جب تک وہ زندہ ہے۔ سوکھ جانے کے بعد اس سے آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا چوں کہ سرچشمۂ حیات ہے اس لیے اس کی فیاضی اور جود و کرم کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس بنیادی وصف فیاضی میں جو جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہوگا خدا سے بھی وہ اتنا ہی زیادہ قریب ہوگا۔ نبی کو خدا سے خاص قرب حاصل ہوتا ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوتا اس لیے فیاضی میں وہ سب سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

اس حدیث سے اشاعتِ علم کی اہمیت اور فضیلت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ علم کی اشاعت خواہ وہ کسی شکل میں ہو اس کا رشتہ و تعلق کارِ نبوت سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی فضیلت میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ نبی یوں تو ہر لحاظ سے فیاض ہوتا ہے لیکن اس کی اصل فیاضی اس علم کی تبلیغ و اشاعت ہے جو خدا کی جانب سے اسے عطا ہوتا ہے۔ پھر اس کی اشاعت میں وہ ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتا ہے۔

یہ فیاضی کی انتہا ہے کہ آدمی کو جن لوگوں کی طرف سے ایذائیں اور تکالیف پہنچ رہی ہوں اور جو لوگ اس کے آگے مصائب کے پہاڑ کھڑے کر رہے ہوں وہ انھیں علم و دانش کی دولت سے مالا مال کردینے اور ان کی زندگیوں کو سنوارنے کی کوشش میں مصروفِ کار ہو۔

دنیا میں علمِ دین کی اشاعت کا کام جس نوعیت کا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی تنہا ایک گروہ پر بھاری ہو، اس کی حیثیت امام قوم کی ہوگی۔ اس کی عظمت و عزت کا کیا کہنا!

﴿۱۰﴾ وَ عَنْ یَزِیْدَ بْنِ سَلْمَةَؓ قَالَ: قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ سَمِعْتُ مِنْکَ حَدِیْثًا کَثِیْرًا اَخَافُ اَنْ یَنْسِیَنِیْ اَوَّلُهٗ وَ اٰخِرُهٗ فَحَدِّثْنِیْ بِکَلِمَةٍ تَکُوْنُ جِمَاعًا فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ فِیْمَا تَعْلَمُ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت یزید بن سلمہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں نے آپ سے بہت سی باتیں سنی ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ اس کا اوّل اور آخر مجھے یاد نہ رہے اس لیے آپؐ مجھے ایسی بات بتلا دیں جو جامع ہو۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔''

تشریح: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کا پس منظر بتاتا ہے کہ یہ ایک کلمہ جَماع ہے جو بہت سے کلمات اور نصائح کو جامع ہے۔ جس شخص نے اسے سمجھ کر اختیار کر لیا اس کے لیے خیر اور فلاح کی تمام راہیں کشادہ ہو جائیں گی۔

''جو کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔'' میں کئی باتوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جب تک خدا کا خوف ولحاظ نہ ہو اصلاح کے لیے محض علم کافی نہیں ہے۔ اس لیے علم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اپنے دل میں خدا کا تقویٰ اور خوف پیدا کرے۔ یہ علم کی محکم بنیاد بھی ہے پھر محرکاتِ عمل میں سب سے بڑا محرک خدا کا خوف ہے۔ جہاں خدا کا خوف نہ پایا جاتا ہو وہاں خواہ بہ ظاہر علم و دانش کا کتنا ہی بڑا ذخیرہ کیوں نہ موجود ہو یہ اطمینان نہیں ہوسکتا کہ آدمی اپنی زندگی میں علم کا پاس ولحاظ بھی رکھے گا۔ اخلاقیات کی بعض کتابوں میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ علم الاخلاق کے مطالعہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس سے آدمی لازماً با اخلاق بھی ہو جائے گا۔ اس ارشادِ رسولؐ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن شخص کے پاس جتنا کچھ علم ہے اگر وہ اس کا حق پہچانتا ہے اور اسے زندگی میں اپنا راہ نما بناتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر اس کا علم اور زیادہ ہوتا تو وہ اس کا بھی اپنی زندگی میں پاس و لحاظ رکھتا۔ اصل اعتبار اس کے اسی جذبہ اور اخلاص کا ہے۔ ہر مومن کے پاس اتنا علم ہوتا ہی ہے جو نجات کے لیے کافی ہے بہ شرطے کہ وہ اس علم کو اپنی بے عملی اور کوتاہی سے ضائع نہیں کرتا۔

رزین کی روایت میں اِتَّقِ اللّٰهَ فِیْمَا تَعْلَمُ کے علاوہ وَاعْمَلْ بِهٖ ''اور اس پر عمل کرو'' کے الفاظ بھی آئے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے ڈرنے کا تقاضا ہے کہ آدمی جو کچھ جانتا ہے اس پر عمل بھی کرے۔

〈۱۱〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ اَبُو الْقَاسِمِ صلی اللہ علیہ وسلم: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَّ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلاً۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابو القاسم ﷺ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو روتے زیادہ اور ہنستے کم ہی۔“

تشریح: آدمی کی پوزیشن دنیا میں اتنی زیادہ نازک ہے کہ اس کا اور آگے جو مراحل پیش آنے والے ہیں ان کا علم و احساس اگر پورے طور پر اسے ہو جائے تو زندگی کے اوقات میں اس کے پاس ہنسنے کے لیے کم اور رونے کے لیے زیادہ وقت ہوگا۔ خدا کی عظمت اور اس کے جلال کا خیال کبھی بھی اسے بے پرواہ نہیں ہونے دے گا۔ ہنسی آدمی کو بالعموم بے پروائی کی حالت میں آتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ سایۂ عرش میں جگہ پانے والوں میں وہ شخص بھی ہوگا جس نے تنہائی کی حالت میں خدا کو یاد کیا پس اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں (وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ۔ بخاری و مسلم)۔

﴿۱۲﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: كَانَ مِنْ دُعَآءِ النَّبِيِّ ﷺ: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَ مِنْ دُعَآءٍ لَّا يُسْمَعُ وَ مِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَ مِنْ نَّفْسٍ لَّا تَشْبَعُ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی ایک دعا یہ تھی: ”اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع بخش نہ ہو اور اس دعا سے جو سنی نہ جا سکے اور اس دل سے جو خشوع اختیار نہ کرے اور اس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو۔“

تشریح: آدمی کے لیے یہ صورتِ حال حد درجہ تشویش ناک ہے کہ وہ علم نافع سے محروم ہو، اس کی دعا غیر مسموع اور دل خشوع سے خالی ہو۔ اور اس کے نفس کو آسودگی حاصل نہ ہو۔ یہ کیفیت نہایت سنگین ہے۔ اس لیے آپؐ نے ان سبھی سے پناہ مانگی ہے۔ ہدایت یاب شخص تو وہ ہوتا ہے جس کا علم علمِ نافع ہو، خدا اس سے راضی ہو اور اس کی پکار سنی جاتی ہو۔ دل اس کا خشوع سے بھرا ہوا ہو اور نفس اس کا قانع ہو۔ اس کی حالت اس بھوکے جانور کی سی نہ ہو جو ہر ایک ہرے چارے پر منہ مارتا پھرتا ہو پھر بھی سیر نہ ہوتا ہو۔ ایسا شخص ہدایت سے دور ہوتا ہے۔ اس کے راہِ راست پر آنے کی توقع کرنی مشکل ہے۔

ان چاروں چیزوں پر الگ الگ غور کیجیے جن سے آپؐ نے اپنے رب سے پناہ مانگی ہے۔ آپؐ نے اس علم سے جو نفع بخش نہ ہو پناہ مانگی ہے۔ وہ علم غیر نافع ہے جس سے نہ ایمان کو تازگی

حاصل ہوتی ہو اور نہ وہ آدمی کی دنیوی زندگی کے لیے ہی کارآمد ہو۔ ایسا علم صحیح بھی جس سے آدمی نہ خود فائدہ اٹھائے اور نہ دوسروں کو اس کے ذریعہ سے فائدہ پہنچائے غیر نافع علم کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم علم حاصل کریں۔ کتاب وسنت کے مطالعہ سے اپنے علم میں اضافہ ہی نہ کریں بلکہ ہماری کوشش یہ ہو کہ یہ علم نفع بخش ثابت ہو۔ وہ ہماری زندگی میں اتر جائے۔ عمل کے بغیر علم صحیح معنی میں علم نہیں ہوتا۔ آدمی دین کی بہت سی باتیں جانتا ہے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے لیکن حقیقت میں اس نے بس وہی جانا جتنا اس نے اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ حکماء کے نزدیک وہ علم معتبر نہیں جو عمل سے بے گانہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی ہماری یہ کوشش بھی ہو کہ ہمارے علم سے دوسرے بندگانِ خدا کو بھی نفع پہنچے اور نفع رسانی کا یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔ ہمارے علم سے اہلِ ایمان کو بھی نفع حاصل ہو اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی رہ نما بن سکے جو ایمان کی دولت سے یکسر محروم ہیں۔

دوسری چیز جس سے آپؐ پناہ مانگتے تھے وہ غیر مقبول دعا ہے۔ دعا وہی مقبول نہیں ہوتی جس کے پیچھے اخلاص نہ ہو۔ آدمی حرام کمائی سے اپنا پیٹ بھرنے میں لگا ہو، اس کے جسم پر حرام کمائی کا لباس ہو، رزقِ حلال کی اسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔ ایسا شخص خواہ کتنا ہی گڑگڑا کر دعائیں کرے خدا اس کی دعاؤں کو کیسے سن سکتا ہے۔ جو شخص خدا سے بے تعلق ہو، زندگی میں خدا کے مقابلے میں باغیانہ روش اختیار کر رکھی ہو، خدا کی مرضی اور اس کی پسند کو بالائے طاق رکھا ہو، وہ آخر کس منہ سے خدا کو آواز دیتا اور اسے پکارتا ہے۔ اس کی دعا کا خدا کی نگاہ میں کیا وزن ہو سکتا ہے۔ روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب برائیاں عام ہو جائیں یہاں تک کہ برائیوں کی تبلیغ ہونے لگے اور بھلائیوں کا راستہ روکا جانے لگے اس وقت خدا دعا سننے سے انکار کر دیتا ہے اور ایسے مصائب اور مشکلات میں لوگوں کو ڈال دیتا ہے کہ بڑے بڑے معاملہ شناس لوگ بھی حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ نجات کی کیا شکل اختیار کی جائے۔

تیسری چیز جس سے آپؐ نے پناہ طلب کی ہے وہ ایسا قلب ہے جو خشوع سے ناآشنا ہو۔ جس دل میں خشوع نہ ہو وہ دل بے روح اور مردہ ہے۔ مردہ قلب بے صلاحیت ہوتا ہے۔ وہ اس زمین کے مثل ہوتا ہے جو کاشت کے قابل نہ ہو۔ خشوع کی حقیقت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے اس کے معانی پر غور کرنا ضروری ہے۔ خشوع کے معنی سکون، اظہارِ عاجزی اور پستی اختیار

کرنے کے ہیں۔ دیوار جو گر کر زمین سے آلگتی ہے اسے جدارٌ خاشعٌ کہتے ہیں۔ مکانٌ خاشعٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جس کا راستہ نہ مل سکے۔ اسی طرح بلدۃٌ خاشعۃٌ اس شہر کو کہتے ہیں جس میں اترنے کی کوئی جگہ نہ ہو۔ پتے کے مرجھا جانے، زمین کے خشک ہو جانے اور آواز کے پست ہو جانے کو بھی اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح قلب خاشع کی حقیقت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے مراد وہ قلب ہے جس کے اندر عاجزی و تذلّل ہو، وہ خدا کے آگے جھکا ہوا اور اس کے سامنے پست ہو۔ خدا کی عظمت کے احساس سے وہ پگھلا ہوا ہو۔ غیر اللہ کے اس کے اندر در آنے کی مطلق گنجائش باقی نہ ہو۔ وہ خدا کی عظمت کے آگے پست اور خیال غیر سے بالکل پاک ہو۔ اور ہر پہلو سے خدا کے لیے یکسو ہو چکا ہو۔ خشوع کا کامل اظہار نماز میں ہوتا ہے جب کہ بندہ ہر طرف سے خدا کے لیے یکسو ہو جاتا ہے اور پورے سکون کے ساتھ خدا کے آگے سراپا عجز و نیاز بن جاتا ہے۔ خدا سے کچھ پانے اور دین و ایمان کی فیض یابیوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے خشوع اسی طرح ضروری ہے جس طرح پانی کو بہنے کے لیے اس سمت کی ضرورت پیش آتی ہے جدھر نشیب ہو۔ خشوع کے بغیر قلب سخت ہو جاتا ہے اور خدا سے سب سے دور قلب قاسی ہی ہوتا ہے۔

چوتھی چیز جس سے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پناہ مانگی ہے وہ آسودہ نہ ہونے والا نفس ہے۔ نفس کی آسودگی ایمان سے وابستہ ہے۔ ایمان کے بغیر نفس کی بھوک کبھی نہیں مٹتی۔ دنیا پرست لوگوں کو دیکھیے۔ ان کی دولت انھیں آسودگی بخشنے سے قاصر ہے۔ بلکہ ان کی دولت ان کی بھوک میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ اس طرح گو ہر مقصود حاصل کرنے میں وہ ہمیشہ ناکام نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف اہلِ ایمان فقر میں مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے کہ انھیں ایک ایسی چیز حاصل ہوتی ہے جس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی ہیچ نظر آتی ہے۔

〈۱۳〉 وَ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَقُوْلُ فِيْ دُبُرِ الْفَجْرِ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّ عَمَلاً مُّتَقَبَّلاً وَّ رِزْقًا طَيِّبًا۔ (احمد، ابن ماجہ والبیہقی فی دعوات الکبیر)

ترجمہ: حضرت امّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے بعد کہا کرتے تھے: ”اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع عمل مقبول اور پاک رزق کی درخواست کرتا ہوں۔“

تشریح: علم نافع سے مراد وہ علم ہے جو کارآمد ہو، بے کار اور بے مقصد نہ ہو۔ وہی علم علم نافع ہے: جس سے ایمان کو قوت حاصل ہو، جس سے دین کے فہم میں اضافہ ہو، جس کی وجہ سے راہِ حق

پر چلنا آسان ہو سکے، جس کے ذریعہ سے اپنے دین کی حفاظت ممکن ہو، جو عزتِ نفس کی محافظت کا سبب ہو، جس کے ذریعہ سے دین حق کی خدمت انجام پا سکے اور جس کے ذریعہ سے بندگانِ خدا کی خدمت کا کام بھی انجام دیا جا سکے۔ انسان کو ذہن و دماغ اس لیے نہیں بخشا گیا ہے کہ اسے فضول اور لغو چیزوں سے بھرا جائے۔ انسان کا دل نظر گاہِ رب ہے، اسے نہ تو کوڑا گھر بننے دینا چاہیے اور نہ اسٹور روم۔ یہ نہایت بد ذوقی کی بات ہوگی۔ اس سے یہ بات بھی بہ خوبی سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ بغض و حسد، کینہ، حرص اور ہوس کو اپنے اندر جگہ دیتے ہیں وہ اپنے اوپر ظلم روا رکھتے ہیں اور اخلاقی لحاظ سے حد درجہ گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چغلی، غیبت، تجسّس، تہمت طرازی جیسی اخلاقی بیماریوں میں گرفتار ہو کر اپنے اوقات کو ضائع کرتے اور سماج میں فتنہ و فساد کا باعث بنتے ہیں۔

اس روایت میں عمل مطلوب کی تعریف یہ فرمائی گئی ہے کہ وہ عمل مقبول ہو۔ عمل اور فعل میں فرق پایا جاتا ہے۔ عمل میں قصد و ارادہ کو دخل ہوتا ہے جب کہ فعل عام ہے۔ عمل استمرار و دوام چاہتا ہے اس لیے کہ وہ آدمی کے اخلاق و کردار کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عمل کا صدور ہمیشہ کسی غرض و غایت کے پیش نظر ہوتا ہے۔ جو عمل مقبول ہوگا وہ ظاہر کے اعتبار سے بھی مہذب ہوگا اور اپنی روح کے لحاظ سے بھی پاکیزگی کا حامل ہوگا۔ عمل مقبول کا تصور ہمیں ہمارے خالق سے وابستہ کرتا ہے۔ ہمارے سامنے عمل کی اصل غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کر سکے۔

بھٹکے ہوئے لوگوں کی زندگی کی باگ ڈور ان کے اپنے نفس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ نفس کے دھکّے کھاتے پھرتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل ایمان کی زندگی ان کے اپنے رب کے حکم اور اس کی رضا کے تابع ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی اعلیٰ و ارفع درجہ کی ہوتی ہے جسے حیات طیبہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ جو اپنے ظاہر کے لحاظ سے پاکیزہ اور باطن کے اعتبار سے بہترین کیفیات کی حامل ہوتی ہے۔ اہل ایمان کی زندگی تعبُّد کی زندگی ہوتی ہے جو انسان کے لیے بہترین متاع ہے۔ آشنائے رب اور بندۂ ہوائے نفس کے درمیان جو عظیم فرق ہوتا ہے اسے ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ شخص ہے جو گندگی کا کیڑا بنا ہوا ہے۔ گندگی میں رینگتے رہنا ہی جس کی منتہا ہے۔ دوسری طرف ایک شاعرِ فطرت ہے جو ادبی محاسن سے آشنا ہے۔ جس کے

قلب میں گداز و سوز اور روح میں تابانی و بے قراری ہوتی ہے، جس کے تصورات نہایت اعلیٰ و ارفع قسم کے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اسے آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

تعبُّد اور جذبۂ پرستش دل کی اعلیٰ کیفیت اور وجد آفریں امنگ ہے۔ یہ وہ لطافت احساس ہے جس پر سارے جہاں کی رعنائیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ اہل ایمان کا ہر سجدہ اس بات کا مظہر ہوتا ہے کہ اس کی وابستگی اصلاً نفس سے نہیں خدا کی ذات سے ہے۔ انسان کے لیے یہ کوئی خسارے کی بات نہیں کہ خدا سینۂ حیات میں اس کا دل بن جائے۔ لیکن دنیا میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی دکھائی دیتی ہے جو خدا کی پسند کے مقابلے میں اپنے سستے جذبات اور خواہشاتِ نفسانی ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انھیں خبر نہیں کہ ان جذبات اور خواہشات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہمارا ''اپنا'' وہ ہے جسے خدا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پاک و طیب رزق انسان کی تیسری ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رزق ہماری ایک ضرورت ہے۔ رزق ہمارے جسم کو بھی درکار ہے اور ہماری جان کو بھی۔ انسان کو جس رزق کا طالب ہونا چاہیے وہ رزق طیب ہے۔ عربی زبان میں رزق محض خوراک ہی کو نہیں کہتے بلکہ یہ عطا، بخشش اور نصیب کے معنی میں عام ہے۔ خدا کی طرف سے ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ سب ہمارا رزق ہے۔ حتیٰ کہ اولاد تک رزق میں شامل ہے۔ چناں چہ بہت سے راویوں کے نام رزق، رزق اللہ اور رُزَیق ملتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ محض خوراک ہی نہیں، علم و حکمت، دانائی، خدا کی ہدایت اور رہ نمائی سبھی چیزیں رزق میں داخل و شامل ہیں۔

آدمی کو حلال اور پاکیزہ غذا سے اپنے جسم کی پرورش کا سامان کرنا چاہیے۔ ظلم و ستم سے حاصل کیا ہوا یا غصب کردہ مال کھانا اخلاق و کردار کی موت ہے۔ جس طرح ہمیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے رزق ہی نہیں پاک رزق کی ضرورت ہے ٹھیک اسی طرح دل و دماغ اور دل کی آسودگی کے لیے بھی طیب اور پاک رزق درکار ہے۔ اس دوسری قسم کے رزق کا سامان بھی خدا نے بہتر طریقے سے کیا ہے۔ اس کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی۔ اسی کے لیے آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔ خدا کی طاعت و بندگی اور اس کی پرستش کی حیثیت بھی رزق طیب کی ہے۔ نماز روح کے لیے بہترین رزق ہے۔ ذکر، تلاوت یا سماع کلامِ رب روح کی بہترین غذا ہے۔ اسی

سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی آتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جو دعا سکھائی تھی اس کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے:

''ہماری روز کی روٹی ہمیں روز دیا کر۔'' (لوقا ۱۱:۳)

مطلب یہ ہے کہ ہمیں وہ چیز عنایت فرما جو ہماری حیات کا ذریعہ ہو۔ یعنی وہ روحِ ہدایت عطا کر جس سے صراطِ مستقیم کی طرف رہ نمائی حاصل ہو۔ اس مفہوم کی تصدیق حضرت مسیحؑ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ ''آدمی صرف روٹی ہی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔''

ہمارا ہر سجدہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم اپنے خدا کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اپنے وابستگان کو دور نہیں رکھ سکتا۔ اس وابستگی کو کردار و عمل کی قوت سے قوی تر اور مستحکم بنانے کے لیے ہمیں دنیا میں میدانِ عمل مہیا کیا گیا ہے۔ جس طرح سجدہ میں اس حقیقت کی تجدید ہوتی ہے کہ ہم خدا کی طرف پلٹنے والے ہیں اسی طرح ہر نیک عمل کے ذریعہ سے بھی اسی حقیقت کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ ایک فردائے منتظَر کا تصور زندگی کا عظیم سرمایہ ہے۔ یہی تصور ہمیں میدانِ عمل میں متحرک رکھ سکتا ہے اور ہمیں اونچا اٹھا سکتا ہے کہ ہم بے لوث ہو کر بندگانِ خدا کو دنیا و آخرت کے خسران سے بچا سکیں اور خود بھی ہر طرح کے خسارے سے محفوظ رہ سکیں۔

فہم و فراست

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ قَالَ: لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَیْنِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔''

تشریح: یعنی مومن تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگر ایک بار وہ کسی سوراخ سے ڈسا گیا تو دوبارہ وہ اس میں ہاتھ یا انگلی نہیں ڈال سکتا۔ اگر کسی نے اسے ایک بار دھوکا دیا تو وہ دوبارہ اس شخص سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ وہ شخص دوبارہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ یہ تقاضائے ایمان ہے کہ آدمی عقل و تجربے سے فائدہ اٹھائے

اور اپنے کو ہر طرح کے دھوکے اور نقصان سے بچائے۔ کسی کو ایک بار پرکھ لیا تو پھر کبھی اس کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہو۔ سمجھ داری اور ہوشیاری سے کام لینا مومن کا فرض ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے جن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے عام لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مومن کو ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

ابن ہشام نے تہذیبِ سیرت میں لکھا ہے کہ یہ فقرہ کہ ''مومن دو بار ایک سوراخ سے ڈسا نہیں جاتا'' سب سے پہلے آپؐ ہی کی زبان سے نکلا تھا پھر تو یہ ضرب المثل بن گیا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ: اِنِّیْ لَاَعْرِفُ اَصْوَاتَ رُفْقَةِ الْاَشْعَرِیِّیْنَ بِالْقُرْاٰنِ حِیْنَ یَدْخُلُوْنَ بِاللَّیْلِ وَ اَعْرِفُ مَنَازِلَھُمْ مِّنْ اَصْوَاتِھِمْ بِالْقُرْاٰنِ بِاللَّیْلِ وَ اِنْ کُنْتُ لَمْ اَرَ مَنَازِلَھُمْ حِیْنَ نَزَلُوْا بِالنَّھَارِ وَ مِنْھُمْ حَکِیْمٌ اِذَا لَقِیَ الْخَیْلَ اَوْ قَالَ الْعَدُوَّ قَالَ لَھُمْ اِنَّ اَصْحَابِیْ یَاْمُرُوْنَکُمْ اَنْ تَنْظُرُوْا ھُمْ۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''میں اشعریوں کی جماعت کی آوازوں کو (ان کے) قرآن پڑھنے میں پہچان لیتا ہوں رات میں بھی جب وہ آتے ہیں۔ اور قرآن پڑھنے سے رات کو ان کی آوازوں کے ذریعہ سے ان کے ٹھکانوں کو بھی پہچان لیتا ہوں، اگرچہ جب وہ دن کو اپنے ٹھکانوں پر اترتے ہوں میں نے ان کے ٹھکانوں کو دیکھا نہ ہو۔ ان میں ایسا حکیم شخص بھی ہے کہ جب (اہلِ کفر کے) سواروں سے یا فرمایا کہ دشمنوں سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ان سے کہتا ہے کہ ہمارے ساتھی تم سے کہتے ہیں کہ تھوڑا ان کا انتظار کرو۔''

تشریح: حضور (ﷺ) نے اشعریوں کی تعریف فرمائی کہ وہ اپنے ٹھکانوں پر پہنچ کر رات میں قرآن کی تلاوت میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کی تلاوت کی آوازیں ان کے ٹھکانوں کا پتہ دیتی ہیں۔

دانا شخص اپنی دانائی سے اپنے کو دشمن کے شر سے بچا لیتا ہے۔ وہ دشمن سواروں سے اس انداز میں گفتگو کرتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔ اس لیے اس پر حملہ کرنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ دانا یا حکیم شخص کا جملہ بھی ایسا ہوتا ہے جو غلط اور جھوٹا بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اہل ایمان دین کے دشمنوں سے لڑنے سے کبھی بھاگتے نہیں۔ جنگ ناگزیر ہو تو اس میں حصہ لینا ان کے نزدیک ایک دینی فریضہ ہی نہیں ہے بلکہ اسے وہ اپنے لیے باعثِ سعادت تصور کرتے ہیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَةِ کَمَانِعِھَا۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”زکوٰۃ لینے میں زیادتی کرنے والا زکوٰۃ روکنے والے کے مانند ہے۔“

تشریح: زیادتی کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً قدرِ واجب سے زیادہ وصول کرے، یا اچھا مال چن چن کر لے لے۔ یا زکوٰۃ کی وصولی میں بے جا سختی سے کام لے۔ روایات میں ایسی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں کہ حضور (ﷺ) کے عامل زکوٰۃ وصول کرتے وقت ڈرتے تھے اور دینے پر بھی اچھا مال قبول کرنے سے گریز کرتے تھے یہاں تک کہ اس کی نوبت آجاتی تھی کہ معاملہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ نبی (ﷺ) کی تعلیم تھی: اِیَّاکَ وَ کَرَائِمَ اَمْوَالِھِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّھَا لَیْسَ بَیْنَھَا وَ بَیْنَ اللّٰہِ حِجَابٌ۔ (ابوداؤد) ”خبردار ان کے عمدہ مالوں کو نہ لینا اور مظلوم کی بددعا سے ڈرنا کیوں کہ مظلوم کی پکار اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب اور روک نہیں ہے۔“ زکوٰۃ میں اوسط درجے کا مال لینا ہی پسند فرمایا گیا ہے۔

زکوٰۃ لینے میں زیادتی کرنے والا شخص نظامِ زکوٰۃ میں خلل ڈالنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ گویا وہ چاہتا ہے کہ نہ خود زکوٰۃ دے اور نہ دوسروں کو دینے دے۔ کوئی بھی نظام کامیابی کے ساتھ اسی وقت تک چل سکتا ہے جب تک سماج کے کسی طبقے میں بے دلی، بے اطمینانی اور شکایت پیدا نہ ہو۔ سبھی ایک دوسرے کے ہم درد و بہی خواہ ہوں۔ ایسی صورت میں کسی کے ساتھ ایسی روش اختیار نہیں کی جاسکتی جو اسے ناگوارِ خاطر ہو۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مال سے فائدہ اٹھانے کا حق سب سے پہلے صاحبِ مال ہی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے اس پر کسی طرح کی زیادتی روا نہیں ہوسکتی۔

کوئی نظم کامیابی کے ساتھ چل سکے اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو اس نظم کے ساتھ جذباتی لگاؤ ہو۔ اس لگاؤ کو قائم رکھنے کے لیے لازم ہے کہ شرعی احکام کی روح اور اس کے

اصل منشاء کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کیا جائے، شرعی احکام وقوانین پر عمل اس طور پر ہو جس میں آدمی کی نفسیات اور اس کے جذبات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ملحوظ رہ سکے۔

شعور و حس

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: اَلَا اِنَّ الدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ وَّ مَلْعُوْنٌ مَا فِیْهَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰهِ تَعَالٰی وَمَا وَالَاهُ وَ عَالِمًا وَّ مُتَعَلِّمًا۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خبردار، دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس چیز کے جسے وہ پسند کرتا ہے اور سوائے عالم اور علم حاصل کرنے والے کے۔''

تشریح: ملعون ہے یعنی حقیر اور قابلِ رد ہے۔ یعنی دنیا اور دنیا کی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ کوئی ان پر فریفتہ ہو اور ان ہی کو زندگی کا ماحصل تصور کرنے لگ جائے۔ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ انسان کی فطری آرزوؤں اور اس کے حوصلوں سے کم تر ہے۔ اسے پا کر مطمئن ہو جانا سب سے بڑی گم راہی اور جہل ہے۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۝ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۝ (سورۂ یونس: ۷-۸) ''وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا ہی کی زندگی پر راضی ہو کر رہ گئے ہیں اور اسی پر وہ مطمئن ہو گئے اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا اس کے بدلہ میں جو وہ کماتے رہے ہیں آگ ہے۔''

دنیا میں اگر کوئی قابلِ قدر چیز ہے اور سب سے بڑھ کر قابلِ قدر چیز ہے تو وہ ہے خدا کی یاد اور اس کا ذکر۔ وہ شخص مردہ اور بے حس ہے جسے دنیا کی زندگی میں سب کچھ یاد آیا اگر یاد نہ آیا تو وہ خدا جس نے اسے پیدا ہی نہیں کیا، بل کہ اس کی تمام ضروریات کا خیال بھی رکھا اور اسے ضروریاتِ زندگی کے سارے سامان عطا کیے۔ جو انسان کی طلب اس کے دل میں انگڑائیاں لینے والی تمناؤں اور اس کے شوق وذوق کا تنہا جواب ہے۔ جسے پا کر کچھ پانا باقی نہیں رہتا اور جسے نہ

پا کرانسان محروم ہی رہتا ہے خواہ بہ ظاہر وہ دنیا کا سب سے دولت مند شخص ہی کیوں نہ ہو۔

جس کا (وَمَا وَالاہُ کا) ترجمہ ''اور اس چیز کے جسے وہ پسند کرتا ہے'' کیا گیا ہے۔اس کے دو اور ترجمے بھی کیے جا سکتے ہیں:

(۱) ''اور اس چیز کے جو اللہ سے قریب کرنے والی ہو۔'' (۲) ''اور اس چیز کے جو اس کے تابع ہو (یعنی اس کے لوازمات اور مقتضیات میں سے ہو)۔'' 'والاہُ ولی سے ہے جس کے معنی محبت کے ہیں اور اس میں قرب اور موالات (بمعنی تبعیت) کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

عالم اور متعلّم کا ذکر درحقیقت تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔بعض پہلوؤں سے عالم اور متعلم کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے سبھی واقف ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا قَاتَلَ اَحَدُكُمۡ فَلۡيَجۡتَنِبِ الۡوَجۡهَ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوۡرَتِهٖ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی جنگ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ چہرے سے اجتناب کرے (یعنی چہرے پر وار نہ کرے) کیوں کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔''

تشریح: حضور (ﷺ) نے منہ پر طمانچہ مارنے سے بھی روکا ہے۔(مسلم) اور مثلہ کرنے یعنی مقتول دشمن کے چہرے کو بگاڑنے، ناک، کان وغیرہ کے کاٹنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

جنگ وقتال کی حالت میں بھی نازک احساسات کو مجروح ہونے سے بچایا جائے اور ان کا لحاظ رکھا جائے۔یہ اسلام کی نہایت پاکیزہ تعلیم ہے۔''خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان پر اپنی صفات کا پرتو ڈالا ہے۔اسی لیے انسان خدا کی صفات وکمالات کا مظہر بن سکا۔انسان کا چہرہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔انسان کے چہرے کا احترام کرنے کا حکم درحقیقت خدا کی ان صفات کے احترام میں ہے جن کی عکاسی اس چہرے سے ہوتی ہے۔بائبل میں بھی یہ فقرہ ملتا ہے:

God created man in His own image, in the image of God
He created him. (Gen. 1:27)

''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔''

(پیدائش ۸:۲۷)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) سورۃ النساء کی آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا (النسآء: ۵۸) پڑھتے تو سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا پڑھتے وقت انگوٹھے کو کان پر رکھتے اور کلمہ کی انگلی کو آنکھ پر رکھتے تھے (ابوداؤد)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمیں کان اور آنکھیں اس ذات خداوندی سے ملی ہیں جو خود سماعت اور بصارت کی صفت سے متصف ہے۔ اسی طرح دوسری صفات بھی جو انسان کو حاصل ہیں وہ بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس محض ہیں۔

〈۳〉 وَ عَنۡہُ سَمِعَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوۡلُ: اِنَّ الۡعَبۡدَ لَیَتَکَلَّمُ بِالۡکَلِمَۃِ مِنۡ رِّضۡوَانِ اللّٰہِ لاَ یُلۡقِیۡ لَہَا بَالاً یَّرۡفَعُ اللّٰہُ بِہَا دَرَجَاتٍ وَّ اِنَّ الۡعَبۡدَ لَیَتَکَلَّمُ بِالۡکَلِمَۃِ مِنۡ سَخَطِ اللّٰہِ لاَ یُلۡقِیۡ لَہَا بَالاً یَّہۡوِیۡ بِہَا فِیۡ جَہَنَّمَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: ''بعض مرتبہ بندہ کوئی ایسی بات کہتا ہے جو خدا کی رضا اور خوش نودی کی ہوتی ہے اور اسے اس جانب توجہ بھی نہیں ہوتی لیکن خدا اس کے سبب سے اس کے درجات بلند فرماتا ہے۔ اور اسی طرح بعض اوقات بندہ کوئی ایسی بات کہتا ہے جو خدا کو ناراض کرنے والی ہوتی ہے اور اس شخص کو اس کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر جاتا ہے۔''

تشریح: ایک حدیث میں آتا ہے: اِنَّ الۡعَبۡدَ یَتَکَلَّمُ بِالۡکَلِمَۃِ مَا یَتَبَیَّنُ فِیۡہَا یَزِلُّ بِہَا فِی النَّارِ اَبۡعَدَ مِمَّا بَیۡنَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ۔ (بخاری، عن ابی ہریرہؓ) ''بندہ بعض اوقات ایسی بات منہ سے نکالتا ہے اور وہ اس میں غور و تامّل سے کام نہیں لیتا اور اس کے سبب سے وہ پھسل کر دوزخ میں جا پڑتا ہے حالاں کہ وہ اس سے اتنی دور ہوتا ہے جتنی دوری مشرق و مغرب کے درمیان ہوتی ہے۔''

اس طرح کی احادیث میں جو بات کہی گئی ہے آدمی کا شعور اور اس کی حس اگر بیدار ہو تو وہ اس کے رمز کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان جو رشتہ پایا جاتا ہے وہ حد درجہ نزاکت کا حامل ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ کسی بھی معاملے میں اور کسی بھی وقت اپنے کو غیر ذمّہ دار تصور نہ کرے۔ حقیقت آدمی کا مقام برابر متعین کرتی رہتی ہے۔ خواہ اس

سے اس کی عظمت ظاہر ہو یا اس سے اس کی پستی کا اظہار ہو۔ خواہ آدمی کو اس کا خیال ہو یا نہ ہو۔ آدمی کے منہ سے نکلی ہوئی بات محض ایک بات ہی نہیں ہوتی بل کہ اس سے اس کے مقام کا تعین بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ آدمی کے اعمال و کردار کے عوامل میں زیادہ بل کہ اصل دخل ان عوامل کا ہوتا ہے جن کا تعلق اس کے شعور سے زیادہ اس کے لاشعور سے ہوتا ہے۔ آدمی کا لاشعور ہی اس کے اعمال و کردار کا اصل منبع ہوتا ہے۔ آدمی ہر قدم نہ سوچ کر اٹھاتا ہے نہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں اصل کنٹرول لاشعور ہی کا ہوتا ہے۔ لاشعور کی تعمیر و ترتیب میں ماحول کا اور خاص طور سے انسان کا اپنا حصہ ہوتا ہے۔ دانا شخص وہی ہے جسے اپنے لاشعور کی خبر ہو۔ وہ اس کی طرف سے بے پروانہ ہو بل کہ اسے درست اور صحیح رکھنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہو۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ بِلاَلِ بْنِ الْحَارِثِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الْخَيْرِ مَالَمْ يَعْلَمْ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا رِضْوَانَهٗ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَالَمْ يَعْلَمْ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْهِ سَخَطَهٗ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ۔ (شرح السنہ، مالک، ترمذی)

ترجمہ: حضرت بلال بن حارثؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’آدمی کوئی کلمۂ خیر اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اسے اس کی قدر و منزلت کا علم نہیں ہوتا لیکن خدا اس کے سبب سے اس کے لیے اپنی رضا اور خوش نودی اس دن تک کے لیے لازم کر دیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملاقات کرے گا۔ اور اسی طرح آدمی کلمۂ شر اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور اسے اس کی حقیقت کا اور اس کے انجام کو علم نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ خدا اس کے سبب سے اس پر اپنے غیظ و غضب کو اس دن تک کے لیے لازم کر دیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملے گا۔‘‘

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خدا کی یہ رضا مندی اور خوش نودی وقتی اور عارضی نہیں ہوتی، قیامت کے دن یعنی یومِ آخر تک کے لیے ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس پر خدا کی جو عنایتیں اور رحمتیں ہوں گی ان کا کیا کہنا! ان سے تو وہ براہِ راست بہرہ مند ہوگا۔ یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ جس سے خدا راضی ہوتا ہے اس کے لیے اس کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے کہ اسے دنیا میں اعمال نیک کی توفیق ملتی رہے جو خدا کی خوش نودی کا موجب ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ شخص جس کی زبان سے نکلی ہوئی بات خدا کے غصے کو بھڑکا دیتی ہے،

اس پر بھی خدا کا غصّہ اور اس کا غضب وقتی اور عارضی نہیں ہوتا۔ خدا قیامت تک اس پر غضب ناک ہی رہتا ہے۔ بعد کا کیا ذکر۔ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے لیے کافی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا میں توبہ کر کے کوئی اپنی اصلاح کر لے۔ اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ بدل جاتا ہے۔ وہ اس کی خطاؤں کو معاف کر کے اپنا مقرب بندہ بنا سکتا ہے۔ توبہ کا دروازہ بہ ہر حال ہر ایک کے لیے وا ہے۔

ابلیس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وَ اِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْٓ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِo (سورۂ صٓ) ''اور تیرے اوپر یوم الجزاء تک میری لعنت ہے۔'' اس کا مفہوم بھی یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ یوم الجزاء کے بعد ابلیس لعنت کی گرفتاری سے چھوٹ جائے گا۔ یوم الجزاء تک تو اس پر لعنت اور خدا کی پھٹکار ہے۔ آگے اس لعنت کے ساتھ عذاب جہنم کا اضافہ بھی ہو جائے گا۔ جسے ابلیس، اس کے پرستار اور دوسرے بندگانِ خدا خود دیکھ لیں گے۔

ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے: اِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَۃِ مِنْ رِّضْوَانِ اللّٰہِ مَا یَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ فَیَکْتُبُ اللّٰہُ لَہٗ بِھَا رِضْوَانَہٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاہُ وَ اِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَۃِ مِنْ سَخَطِ اللّٰہِ مَا یَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ فَیَکْتُبُ اللّٰہُ عَلَیْہِ بِھَا سَخَطَہٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاہُ۔ ''تم میں سے کوئی شخص اللہ کی خوش نودی کی کوئی ایسی بات کہہ جاتا ہے اور اسے گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ اسے اس مرتبے تک پہنچائے گی جس تک وہ اسے پہنچاتی ہے۔ پس اللہ اس کلام کی وجہ سے اس کے لیے اپنی رضامندی اس دن تک کے لیے لکھ دیتا ہے جب وہ اس سے ملاقات کرے گا۔ اور تم میں سے کوئی شخص اللہ کی ناراضی کی کوئی ایسی بات کہہ جاتا ہے اور اسے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ اسے اس ذلت تک پہنچائے گی جس تک وہ اسے پہنچاتی ہے۔ پس اللہ اس کلام کی وجہ سے اس کے لیے اس دن تک ناراضی اور غضب لکھ دیتا ہے جب وہ اس سے ملاقات کرے گا۔''

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَفْضَلُ الصَّدَقَۃِ اَنْ تُشْبِعَ کَبِدًا جَائِعًا۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''افضل صدقہ یہ ہے کہ تو بھوکے جگر کو آسودہ کر دے۔''

تشریح: ایک اور طویل حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: فِیْ کُلِّ کَبِدٍ رَّطْبَۃٍ اَجْرٌ۔ (مسلم)

''ہر تر جگر میں اجر ہے۔'' حس وحیات کی رعایت دین کی اصل بنیاد ہے۔ دین کے سارے ہی مطالبات کا تعلق حیات وحس سے ہی ہے۔ ''افضل صدقہ یہ ہے کہ تو بھوکے جگر کو شکم سیر کر دے'' یا ''ہر ترو تازہ جگر میں اجر ہے۔'' یہ کوئی سرسری سے فقرے نہیں ہیں بل کہ دین کی روح اور اس کے مزاج کی بہترین عکاسی ان فقروں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے کَبِدُ الرَّطْبَةِ ''تر جگر'' کہہ کر جان وحس کو مرئی شکل دے دی کہ آدمی اسے محسوس کرنے لگتا ہے۔ کَبِدًا جَائِعًا ''بھوکا جگر فرما کر آپؐ نے آدمی کے اندر پوشیدہ رحم، غم خواری اور درد کے جذبے کو ابھار دیا ہے۔

رحم وہم دردی دین کا جوہر ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق لطافتِ احساس سے ہے جو دین کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں کہیں حیات وحس ہے اس کی رعایت ضروری ہے۔ درد وسوز سے ناآشنا شخص درحقیقت دینی جذبہ سے محروم ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر شعور وحس بیدار ہو۔ وہ دنیا میں بے حسی کے ساتھ زندگی گزارنے پر قانع نہ ہو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: اَصَابَنَا ــــ وَ نَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ــــ مَطَرٌ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَحَسَرَ ثَوْبَهُ عَنْهُ حَتّٰى اَصَابَهُ فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا؟ قَالَ: لِاَنَّهُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهٖ. (ابوداؤد، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ تھے کہ بارش ہونے لگی۔ رسول اللہ ﷺ باہر نکلے اور اپنا بدن کھول دیا یہاں تک کہ مینہ آپؐ کے اوپر گرا۔ اس پر ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس لیے کہ یہ ابھی تازہ دم اپنے رب کے پاس سے آیا ہے۔''

تشریح: خدا کی عنایتوں اور رحمتوں کے پورے شعور واحساس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔ خدا کی کسی تازہ ترین رحمت کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہوتا ہے کہ ہم اسے پورے طور پر محسوس کریں۔ خدا کے رسول (ﷺ) نے بارش کے پانی سے اپنے جسم اطہر کو بھگو کر اپنی عبدیت اور خدا سے اپنے غیر معمولی تعلق کا اظہار فرمایا۔ خدائی منصوبے کے تحت پانی کا جو قطرہ مینہ کی شکل میں گرتا ہے خدا اور اس کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا۔ اس کا بہ راہ راست تعلق خدا سے ہوتا ہے۔ وہ قطرہ قطرۂ معصوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی فطری پاکیزگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نہایت ہی قابلِ قدر اور باعثِ خیر وبرکت اور ہمارے ایمان ویقین کو تازگی بخشنے والا ہوتا ہے۔

حکمت ومعرفت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَ اَبِیْ خَلّادٍ رَّضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِذَا رَأَیْتُمُ الْعَبْدَ یُعْطٰی زُهْدًا فِی الدُّنْیَا وَ قِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ یُلَقَّی الْحِکْمَةَ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ اور ابوخلّاد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اسے دنیا میں زُہد اور کم گوئی عطا ہوئی ہے تو اس کی قربت اختیار کرو کیوں کہ اسے حکمت القا ہوتی ہے۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حکمت ایک بڑی نعمت ہے جس سے بہرہ مند ہونے کی خواہش ہر ایک مومن کے اندر ہونی چاہیے۔ حکمت کسی ذہنی کاوش کی پیداوار ہرگز نہیں ہوتی، بل کہ وہ من جانب اللہ اس بندۂ حق کی طرف القاء کی جاتی ہے، دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی اور خاموشی جس کا شعار ہوتا ہے۔ زُہد اور کم گوئی اختیار کر کے بندہ اپنے کو اس پوزیشن میں لاتا ہے کہ وہ غیب کا مخاطب بن سکے اور حق اس کی طرف متوجہ ہو۔ ایسے شخص سے فیض یاب ہو کر آدمی اپنے ذوق ورجحان کی اصلاح کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کی قربت اور ہم نشینی جسے حکمت بخشی گئی ہوا کسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

حکمت اپنی حقیقت کے لحاظ سے ایک نور اور الہامی ادراک ہے۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ حکمت دلوں میں عرفان وایمان اور ذہنوں میں فہم وبصیرت کی صورت میں اپنی جگہ بناتی ہے اور زندگیوں میں اس کا اظہار شرافت و پاکیزگی، فیاضی، احسان شناسی اور اعلیٰ کردار کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ قرآن میں ہے: وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرہ: آیت ۲۶۹) ''اور جس کو حکمت ملی اسے خیر کثیر ہاتھ آیا۔'' حکمت تمام ہی بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ خدا کا ناشکرا وہی ہو سکتا ہے جو حقیقی علم وحکمت سے محروم ہے۔ جیسا کہ خدا نے خود فرمایا ہے: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰهِ۔ (سورۂ لقمٰن: آیت ۱۲) ''یقیناً ہم نے لقمانؑ کو حکمت عطا کی کہ اللہ کے شکر گزار رہو۔'' شکر گزاری کی طرح نیکی اور راست گفتاری وغیرہ کا تعلق بھی حکمت سے ہے۔

جس شخص کو حکمت کی دولت عطا ہوئی ہے اس کی ہم نشینی اور صحبت اختیار کرنے والا محروم نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی اس سے بہت کچھ فیض یاب ہوسکتا ہے۔ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ خدا کی صحبت اختیار کرو اور اگر تم میں اس کی طاقت نہ ہو تو پھر اس شخص کی ہم نشینی اختیار کرو جو خدا کی صحبت اختیار کیے رہتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَا مِنْ مُّسْلِمٍ یَّنْظُرُ اِلٰی مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ یَغُضُّ بَصَرَہٗ اِلَّا اَحْدَثَ اللّٰہُ لَہٗ عِبَادَةً یَّجِدُ حَلَاوَتَھَا۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جب کسی مسلمان کی نظر کسی عورت کے حسن و جمال پر پہلی بار پڑ جائے پھر وہ فوراً اپنی نگاہ کو اس سے پھیر لے تو لازماً خدا اس کے لیے ایسی عبادت پیدا فرمائے گا جس کا لطف اسے حاصل ہوگا۔''

تشریح: ایک دوسری حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَکَ الْاُوْلٰی وَ لَیْسَتْ لَکَ الْاٰخِرَةُ۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی) ''نظر کے پیچھے نظر نہ ڈال (کسی عورت پر نگاہ پڑ جانے کے بعد دوبارہ اس پر نگاہ نہ ڈال) کیوں کہ پہلی نظر (جو اتفاقاً پڑ گئی) تیرے لیے (جائز) ہے، دوسری تیرے لیے جائز نہیں۔''

اس میں شبہ نہیں کہ اتفاقاً نظر پڑ جانے کے بعد جو شخص دوبارہ سہ بارہ کسی نامحرم عورت کے حسن پر نظر نہیں ڈالتا خدا اسے محروم نہیں رکھ سکتا۔ ایسا شخص صرف یہی نہیں کہ حسنِ ظاہر کے فتنوں سے محفوظ رہے گا بل کہ اس کے اس عمل نیک کے صلہ میں خدا اسے اس حسنِ ظاہر سے آگے کی چیز عطا کرے گا جو اس سے کہیں بڑھ کر حلاوت بخش اور لطف انگیز و کیف آور ہوگی۔ اس چیز کو حدیث میں ''عبادۃ'' سے تعبیر فرمایا گیا۔ عبادت سے مراد معرفت یا عرفانِ حقیقت ہے۔ عبادۃ کا یہ لفظ صحیح مسلم کی ایک روایت میں بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک خاص جگہ اپنے ایک صحابیؓ کو حاکم مقرر کر کے بھیجتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو رسولِ خداؐ کا نمائندہ کس طرح خدا کے دین کی طرف دعوت دے گا، اس سلسلے میں ہدایات دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: فَلْیَکُنْ اَوَّلُ مَا تَدْعُوْھُمْ اِلَیْہِ عِبَادَةَ اللّٰہِ فَاِذَا عَرَفُوْا اللّٰہَ فَاَخْبِرْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ خَمْسَ صَلَوٰتٍ فِیْ یَوْمِھِمْ وَ لَیْلِھِمْ۔ (مسلم) ''پس چاہیے کہ سب سے پہلے جس چیز کی طرف تم انھیں بلاؤ وہ اللہ کی عبادت ہے۔ تو جب وہ اللہ کو پہچان لیں تو انھیں اس سے باخبر کرنا

کہ اللہ عز وجل نے ان کے شب وروز میں ان پر پانچ (وقت کی) نمازیں فرض کی ہیں۔''

اس کے بعد آپؐ نے دوسرے فرائض زکوٰۃ وغیرہ کے بارے میں بتایا کہ کس طرح ان سے وہ لوگوں کو باخبر کریں۔

حدیث کا جو حصہ میں نے یہاں نقل کا ہے اس میں ہے کہ ''انھیں عبادۃ اللہ کی طرف بلاؤ پھر جب وہ اللہ کو پہچان لیں۔'' صاف ظاہر ہے کہ عبادۃ اللہ کی طرف بلانے سے مراد یہاں خدا کی پہچان اور اس کی معرفت کی دعوت دینا ہے۔ عبادت سے مراد اس حدیث میں نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض نہیں اسی لیے ان کا ذکر اس حدیث میں عبادت سے الگ کیا گیا ہے۔

شکر و احسان شناسی

﴿۱﴾ عَنِ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَؓ یَقُوْلُ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یُصَلِّی حَتّٰی تَرِمَ اَوْ تَنْتَفِخَ قَدَمَاهُ فَیُقَالُ لَهٗ فَیَقُوْلُ: اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نماز پڑھتے یہاں تک کہ آپؐ کے قدم ورم کر آتے یا پھول جاتے۔ اس کے متعلق آپؐ سے گزارش کی جاتی تو آپؐ فرماتے کہ ''کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

تشریح: یعنی آپؐ سے کہا جاتا کہ آپؐ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ اتنی زیادہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت بہ ظاہر نہ بھی ہو جب بھی آدمی کے اندر اگر جذبۂ شکر باقی ہے تو وہ اسے کیسے چین لینے دے سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تو آدمی چاہے گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خدا کے حضور میں قیام وسجود کے ذریعہ سے اس کے بے پایاں احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کرے۔ خدا کا بہترین بندہ وہی ہے جو اس کا شکر گزار ہو۔ ناشکرا بن کر رہنا درحقیقت روح کی موت ہے۔

ایمان کا انسان کے محض فکر ونظر ہی سے تعلق نہیں ہے بل کہ اس کا خصوصی رشتہ وتعلق اس کے جذبۂ شکر سے ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے: مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ط (النساء: آیت ۱۴۷) ''اللہ کو تمھیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے اگر تم شکر گزار رہو اور (اور اس کے نتیجے میں) ایمان لاؤ۔'' معلوم ہوا کہ ایمان لانے سے انکار احسان ناشناسی اور ناشکری ہے۔ پھر

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان کوئی خشک نظریہ ہرگز نہیں ہے بل کہ ایمان کا معاملہ انسان کے جذبات کا معاملہ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ انسان اگر جذبات سے عاری ہو تو وہ صحیح معنی میں انسان ہی نہیں ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَؓ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتُسْئَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِیْمِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمُ الْجُوْعُ ثُمَّ لَمْ تَرْجِعُوْا حَتّٰی اَصَابَکُمْ هٰذَا النَّعِیْمِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم سے لازماً اس نعمت کے بارے میں قیامت کے روز سوال ہوگا۔ تمھیں بھوک نے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا پھر تم لوٹے نہیں کہ یہ نعمت تمھیں حاصل ہوئی۔“

تشریح: اس حدیث کا ایک خاص پس منظر ہے۔ بھوک سے بے تاب ہو کر یہ حضرات اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ پھر حضور (ﷺ) کے ساتھ ایک صحابیؓ کے یہاں پہنچے۔ انھوں نے خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان کے یہاں سے کھا پی کر جب واپس ہوئے تو اس وقت حضورؐ نے وہ بات کہی جو اس حدیث میں نقل ہوئی ہے۔

”قیامت کے روز اس نعمت کے بارے میں سوال ہوگا“ کا مطلب یہ ہے کہ خدا یہ پوچھے گا کہ اس نعمت کا شکریہ تم نے کہاں تک ادا کیا۔ اس نعمت کو پا کر جس بہترین ردِّ عمل کا اظہار تمھاری طرف سے ہونا چاہیے وہ ہوا یا اس کے پیش کرنے میں تم قاصر رہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَجَبٌ لِّلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَهٗ خَیْرٌ حَمِدَ اللّٰهَ وَ شَکَرَ، وَ اِنْ اَصَابَتْهُ حَمِدَ اللّٰهَ وَ صَبَرَ، فَالْمُؤْمِنُ یُؤْجَرُ فِیْ کُلِّ اَمْرِهٖ فِی اللُّقْمَةِ یَرْفَعُهَا اِلٰی فِیْ امْرَأَتِهٖ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: ”حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مومن کا عجب حال ہے۔ اگر اسے بھلائی حاصل ہوتی ہے تو وہ خدا کی تعریف کرتا اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اگر اسے کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ خدا کی تعریف کرتا اور صبر

اختیار کرتا ہے۔ پس مومن کو ہر ایک حالت میں اجر وثواب حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ جو لقمہ وہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دیتا ہے اس میں بھی اس کو اجر ملتا ہے۔"

تشریح: صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ سے اسی مضمون کی حدیث مروی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَّ لَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ۔ "یعنی مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کا سارا ہی معاملہ اس کے لیے خیر ہی ہوتا ہے۔ اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے کوئی کشادگی اور آرام پہنچے تو شکر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اور اگر اسے تنگی اور رنج پہنچے تو وہ سراپا صبر بن جاتا ہے، تو یہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے (یعنی دونوں ہی حالتیں اس کے لیے بھلائی اور خیر کا سبب ثابت ہوتی ہیں)۔"

زندگی میں آدمی کو تکلیف یا راحت دو ہی صورتوں سے سابقہ پیش آسکتا ہے اور دونوں ہی صورتوں میں مومن شخص اس اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرتا ہے جو اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔ اس طرح وہ خدا کی نگاہ میں پسندیدہ بندہ قرار پاتا ہے۔ مومن ہر حالت میں خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے میں کام یاب ہوتا ہے جو زندگی کا اصل مقصود ہے۔ اس کے برخلاف غیر مومن شخص تکلیف و رنج کی حالت میں بالعموم شاکی ہوتا ہے اور عیش و راحت میں متکبر اور خدا کا ناشکرا ثابت ہوتا ہے۔

تکلیف میں صبر اور خوشی و راحت میں شکر در حقیقت ایمان کی واضح دلیل ہے۔ صبر و شکر میں کمی اصل میں ضعفِ ایمان کی علامت ہے۔ اور یہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ضعف ایمان اہلِ نظر کی نگاہ میں ہمیشہ باعثِ تشویش رہا ہے۔

(۴) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَا یَشْكُرُ اللّٰهَ مَنْ لَّا یَشْكُرُ النَّاسَ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "وہ خدا کا بھی شکر گزار نہیں جو انسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔"

تشریح: احسان شناسی ایک اعلیٰ کردار ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص خدا کا تو شکر گزار ہو اور لوگوں نے جو اس پر احسانات کیے ہوں ان کا اسے احساس نہ ہو۔ اخلاق و کردار ایک ایسا وصف

ہے جس کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔ احسان شناس شخص خدا کے احسانات کے ساتھ دوسروں کی خدمات کا بھی اعتراف کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ بے کردار شخص ہے۔ اس کا وہ اظہارِ شکر بھی بے وزن ہے جو بہ ظاہر وہ خدا کے آگے کرتا ہے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ اُعْطِیَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْیُجِزْ بِهٖ وَ مَنْ لَّمْ یَجِدْ فَلْیُثْنِ فَاِنَّ مَنْ اَثْنٰی فَقَدْ شَکَرَ وَ مَنْ کَتَمَ فَقَدْ کَفَرَ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص کو کوئی چیز دی جائے اور اسے مقدور ہو تو وہ ضرور اس کا بدلہ دے اور جس کسی کو بدلہ دینے کی مقدرت نہ ہو تو تعریف کرے۔ اس لیے کہ جس نے اس کی تعریف کی اس نے اس کا شکر ادا کر دیا اور جس نے اس احسان کو چھپایا اس نے ناشکری کی۔“

تشریح: احسان کا بدلہ احسان ہی کی شکل میں چکانا چاہیے۔ اگر کوئی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ احسان کا بدلہ ادا کر سکے تو وہ زبان سے اپنے محسن کی تعریف ہی کر دے۔ اگر وہ اتنا بھی کرنے کا روادار نہیں ہوتا تو اسے احسان فراموش ہی کہیں گے۔ احسان فراموشی انسان کے دامنِ کردار پر ایسا بدنما داغ ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

﴿۶﴾ وَ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ اُبْلِیَ بَلَاءً فَذَکَرَهٗ فَقَدْ شَکَرَهٗ وَ اِنْ کَتَمَهٗ فَقَدْ کَفَرَهٗ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”جس کسی کو کوئی نعمت ملے اور وہ اس کا ذکر کرے تو اس نے اظہارِ شکر کیا اور جس نے اسے چھپایا وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا۔“

تشریح: کسی نعمت کے حصول کا اثر اظہارِ شکر کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیے۔ وہ شخص بے حس ہے جسے کوئی نعمت ملی لیکن اس کے اندر شکر کا جذبہ نہ ابھر سکا۔ اور اس نے اس نعمت کا اعتراف نہ کیا۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ الْمُهَاجِرِیْنَ قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ذَهَبَتِ الْاَنْصَارُ بِالْاَجْرِ کُلِّهٖ۔ قَالَ: لَا مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَاَثْنَیْتُمْ عَلَیْهِمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ مہاجرین نے عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسولؐ!

انصار ہر ایک اجر و ثواب لوٹ لے گئے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، جب تک تم خدا سے ان کے لیے دعا کرتے رہو گے اور ان کی تعریف کرتے رہو گے۔''

تشریح: انصار نے اپنے بھائی مہاجرین کے لیے غیر معمولی ایثار سے کام لیا تھا جو تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس پر مہاجرین کو خیال ہوا کہ شاید وہ ایسے اجر و ثواب کے مستحق ہو گئے جس کے مستحق ہم نہیں ہو سکتے۔ اس پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر تم ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہو اور ان کے لیے دست بہ دعا رہتے ہو تو تم محروم نہ ہو گے۔ بہ صورت دیگر تمھارا احساس صحیح ہو سکتا ہے۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ كَالصَّائِمِ الصَّابِرِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''شکر گزار غیر روزہ دار، صابر روزہ دار جیسا ہے۔''

تشریح: روزہ دار شخص روزے کی حالت میں خدا کے لیے صبر اختیار کرتا اور کھانے پینے وغیرہ سے باز رہتا اور بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرتا ہے۔ غیر روزہ دار کھاتا پیتا اور اپنی جنسی خواہشات وغیرہ پوری کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکر گزار ہے تو اس میں اور صابر روزے دار میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ صبر اور شکر دونوں ہی اعلیٰ اخلاق و کردار کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں۔ البتہ یہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی زندگی کو صبر اور شکر دونوں ہی کا موقعہ ملنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کے بغیر شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں۔ اسی لیے اہلِ ایمان پر رمضان کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ حقیقت میں شاکر بھی وہی شخص ہے جو وقت پڑنے پر صبر و ثبات کا بھی ثبوت دے سکے۔

خوش حالی میں جو شیخی بگھارتا اور اتراتا ہے لیکن تنگی اور مصیبت آنے پر مایوسی اس طرح اسے گھیر لیتی ہے کہ وہ بالکل بجھ کر رہ جاتا ہے، اس کی روح صبر سے نا آشنا ہے۔ اسی لیے وہ چھچھورے پن کا ثبوت دیتا ہے۔ صبر یہ بھی ہے کہ آدمی سطحیت اور چھچھورے پن سے اپنے کو دور رکھے۔ قرآن میں چھچھورے پن کی ایک تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے: وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ

لَیَقُوْلَنَّ ذَھَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ ط اِنَّہٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ o اِلاَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط اُولٰٓئِکَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ o (سورۂ ہود: ۹-۱۱) ”اگر ہم انسان کو اپنی رحمت کا ذائقہ چکھا کر پھر اس کو اس سے چھین لیں، تو وہ مایوس ناشکرا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے بعد کہ اسے تکلیف پہنچی ہو اسے نعمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں، تو وہ کہنے لگتا ہے ’میرے تو سارے دکھ دلدّر دور ہوگئے‘؛ وہ تو پھولا نہیں سماتا، ڈینگیں مارنے لگتا ہے۔ ان لوگوں کی بات دوسری ہے جنھوں نے صبر اور نیک کام کیے؛ وہی ہیں جن کے لیے بخشش اور بڑا اجر ہے۔“

معلوم ہوا کہ صبر کے بغیر عاجلہ پسندی اور چھچھورے پن سے آدمی کبھی نجات نہیں پا سکتا۔

﴿۹﴾ وَ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ ھُوَ اَسْفَلُ مِنْکُمْ وَلاَ تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ ھُوَ فَوْقَکُمْ فَھُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”تم ان کی طرف دیکھو جو (مال و دولت اور مرتبہ میں) تم سے فروتر ہیں، ان لوگوں کی طرف نہ دیکھو جو (دنیوی پہلو سے) تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ یہ طرزِ عمل اس بات کے حصول کے لیے زیادہ مناسب ہے کہ تم پر اللہ کی جو نعمت ہے وہ تمھاری نگاہ میں حقیر نہ ہو۔“

تشریح: دنیا میں جس کسی کو بہت کم ملا ہے اسے بھی اتنا ملا ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرنا آسان نہیں۔ دولت مندوں اور صاحبِ ثروت لوگوں کی دولت و ثروت پر اگر کوئی نگاہ جماتا ہے تو اندیشہ ہے کہ خود اسے خدا نے اپنی رحمت سے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اسے نہایت کم تر اور حقیر نظر آنے لگے اور شکر ادا کرنے کے بہ جائے اس کے نتیجے میں اس کا دل شکایتوں سے بھر جائے۔ اور یہ چیز ایک مومن کے لیے کسی ہلاکت سے کم نہیں۔ وہ چیز جو خدا کے احسانات کا احساس ہم سے چھین لے اس سے اجتناب نہایت ضروری ہے۔

﴿۱۰﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: خَصْلَتَانِ مَنْ کَانَتَا فِیْہِ کَتَبَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی شَاکِرًا صَابِرًا وَّ مَنْ لَّمْ تَکُوْنَا فِیْہِ لَمْ یَکْتُبْہُ اللّٰہُ تَعَالٰی شَاکِرًا وَّلاَ صَابِرًا مَّنْ نَّظَرَ فِیْ دِیْنِہٖ اِلٰی مَنْ ھُوَ فَوْقَہٗ فَاقْتَدٰی بِہٖ وَ نَظَرَ فِیْ دُنْیَاہُ اِلٰی مَنْ ھُوَ دُوْنَہٗ فَحَمِدَ اللّٰہَ تَعَالٰی عَلٰی فَضْلِہٖ بِہٖ عَلَیْہِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”دو خصلتیں ہیں جس شخص میں وہ پائی جائیں گی اللہ تعالیٰ اس کو شاکر صابر لکھے گا۔ اور جس کے اندر وہ نہ پائی جائیں گی اسے اللہ تعالیٰ نہ شاکر لکھے گا اور نہ صابر۔ جو اپنے دین کے معاملے میں اس شخص کو دیکھے جسے اس سلسلے میں اس پر فوقیت حاصل ہو پس اس کی پیروی اختیار کرے۔ اور اپنی دنیا کے معاملے میں اس شخص کو دیکھے جو اس سلسلے میں اس سے کم تر ہو پس اس فضیلت پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے جو اس نے اسے اس شخص پر عطا کی ہے۔“

تشریح: آپؐ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کے شاکر و صابر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دین کے معاملے میں وہ اپنے سے برتر کو دیکھے تاکہ اسے اپنے اعمال قلیل محسوس ہوں اور وہ اپنے سے فائق تر کی پیروی کرنے کی کوشش میں لگ سکے۔ لیکن دنیوی ساز و سامان کے سلسلے میں اپنے سے کم تر پر نظر رکھے تاکہ خدا کا شکر ادا کرنے میں اس سے قصور سرزد نہ ہو۔ ہمارے پاس جو نعمتیں ہیں ان کے نعمت ہونے کا احساس اس وقت بہت بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے بندگانِ خدا ان نعمتوں سے محروم ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اسی طرح کی ایک حدیث مروی ہے کہ حضور (ﷺ) نے فرمایا: اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلُ مِنْهُ۔ ”تم میں سے جب کوئی کسی ایسے شخص کو دیکھے جو مال و دولت اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر ہو تو اس کو چاہیے کہ کسی ایسے شخص کو دیکھ لے جو ان چیزوں میں اس سے کم تر ہو (تاکہ حرص و طمع کے بجائے اس کے اندر صبر و شکر کا جذبہ پیدا ہو)۔“

(۱۱) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اَوَّلَ مَا یُسْأَلُ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنَ النَّعِیْمِ اَنْ یُّقَالَ لَهٗ اَلَمْ نُصِحَّ جِسْمَکَ وَ نُرَوِّکَ مِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ۔

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے روز بندے سے نعمتوں کے متعلق جو پہلا سوال ہوگا وہ یہ کہ اس سے کہا جائے گا: ”کیا ہم نے تیرے جسم کو صحت عطا نہیں کی تھی اور تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا؟“

تشریح: اس حدیث میں دو ظاہری نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کا نعمت ہونا ہر شخص پر بہ خوبی

واضح ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں سب سے پہلے سوال ہوگا۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان سے یہ پوچھا جائے گا کہ جس خدا نے تجھے ان نعمتوں سے بہرہ مند کیا تھا، تو نے اس کا شکر بھی ادا کیا یا نہیں۔ خدا نے انسان کو حیات وحس اور شعور بخشا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کے جواب میں بہترین ردّعمل پیش کرے یعنی اس کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہو۔

زندگی کی نعمتوں کو پاکر ہمارا اوّلین فرض یہ ہے کہ ہم اپنے محسن کو پہچانیں اور اس کی مرضیات کا علم حاصل کریں۔ انسان کو دنیا میں جو نعمتیں حاصل ہیں وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ان نعمتوں کا بخشنے والا خدا رحمتوں اور برکتوں والا ہے۔ اس نے یہ نعمتیں عطا کر کے انسانوں سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار فرمایا ہے۔ ہمارا تعلق جتنا اپنے جسم اور جان سے ہے اس سے کہیں زیادہ اس بابرکت ہستی سے ہے جو ہمارے وجود وحیات کا اصل سبب ہے۔ وہ اگر ہم سے اپنا تعلق منقطع کر لے تو ہم فنا کے گھاٹ اتر جائیں۔ خدا اپنے بندوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں چھوڑتا۔ ان پر اس کے دامنِ رحمت اور عنایت کا سایہ ہمیشہ پڑتا رہتا ہے۔ اس کا یہ فیض عام ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو پا کر ہم نے یہ جاننے کی زحمت گوارا کی کہ ان نعمتوں کا دینے والا کون ہے؟ کیا اس کی بخششوں اور عنایتوں کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ ہم دل وجان سے اس سے اپنا رشتہ قائم کریں اور اس کے لیے سراپا شکر و نیاز ہو جائیں۔ نعمتوں کے بارے میں پوچھے جانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے بعد ہماری طرف سے سرکشی، بے وفائی اور بے حسی کا مظاہرہ ہوا یا ہم اس کے شاکر اور اطاعت گزار بندے بن کر رہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۝ (التکاثر:۸)

''پھر لازماً تم سے اس دن عیش ونعمت کے بارے میں پرسش ہونی ہے۔''

﴿۱۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يُصْبِحُ عَلٰى كُلِّ سُلَامٰى مِنْ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ فَكُلُّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ وَّ كُلُّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ وَّ كُلُّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ وَّ كُلُّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ وَ اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَّ نَهْیٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَّ يُجْزِئُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا الْعَبْدُ مِنَ الضُّحٰى۔ (مسلم، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''صبح

ہوتی ہے تو تم میں ہر شخص کے ہر جوڑ و بند پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ پس ہر تسبیح ایک صدقہ ہے اور ہر تحمید ایک صدقہ ہے اور ہر تہلیل ایک صدقہ ہے اور ہر تکبیر ایک صدقہ ہے، بھلائی کا حکم دینا ایک صدقہ ہے اور برائی سے روکنا ایک صدقہ ہے اور ان سب کے بدلے میں وہ دو ۲ رکعتیں کافی ثابت ہوتی ہیں جن کو بندہ بہ وقتِ چاشت ادا کر لیتا ہے۔''

تشریح: ہر جوڑ بند کے لیے لفظ سُلامیٰ آیا ہے۔ سُلامیٰ جوڑ دار چھوٹی ہڈیوں کو کہتے ہیں جیسے انگلیوں کی ہڈیاں۔ اس کی جمع سُلامیات آتی ہے۔ پھر توسعاً ہر ہڈی کو سُلامیٰ کہنے لگے۔ اور ہڈی کے جوڑوں پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔ تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کا مطلب ہے سُبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ، لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ اور اللّٰہ اکبر کہنا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی کو ہر روز خدا کی طرف سے ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ گزرے ہوئے کل کی طرح اسے پھر ایک دن میسر ہوتا ہے۔ یہ زندگی خدا کی بے انتہا مہربانیوں اور عنایتوں کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ اس حدیث میں بہ طور مثال انسانی جسم کی ہر ہڈی اور جوڑ کا ایک نعمت کی حیثیت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ خدا کی ہر نعمت اور بخشش انسان سے اظہار شکر کی طالب ہوتی ہے۔ چاہیے تو یہ کہ بندہ انفاق اور صدقے کے ذریعہ سے خدا کے ہر احسان پر شکر ادا کرے۔ کیوں کہ یہ اپنے جذبے میں صادق ہونے کا بیّن ثبوت قرار پاتا ہے لیکن خدا کا یہ خاص کرم ہے کہ اس نے تسبیح اور تحمید وغیرہ کے کلمات اور نیک اعمال کو صدقہ قرار دیا ہے۔ اس طرح بندے کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ خدا کے احسانات کا شکر ادا کرنے کی پوزیشن میں ہو سکے۔

پھر ہم جانتے ہیں کہ چاشت کی نماز کوئی فرض نہیں ہے۔ اس نماز کی رکعتیں بتاتی ہیں کہ بندہ محض فرائض پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ خدا سے تعلق خاص رکھنے کی وجہ سے تسکین پانے کے لیے وہ نوافل کا سہارا لیتا ہے۔ خدا سے اس طرح کے تعلق کے اظہار میں اگر دکھاوا نہیں سچائی ہے تو وہ سارے ہی صدقات کا بدل ہے۔ صدقہ خدا سے تعلقِ خاطر ہی کا مظہر ہے اور یہ چیز یہاں بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص کو سارے صدقات ادا کر کے خدا کے انعامات و احسانات کا شکریہ ادا کرنے کا موقعہ نہ مل سکا تو چاشت کی رکعتیں ہی ان سارے صدقات کے بدلے میں کافی ثابت ہوں گی۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اسی طرح کی ایک حدیث مروی ہے کہ رسولِ خدا (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: كُلُّ سُلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ

فِيهِ الشَّمْسُ يَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ وَّ يُعِيْنُ الرَّجُلَ عَلٰى دَابَّتِهٖ فَيَحْمِلُ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ اَوْ يَرْفَعُ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ وَّالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ وَّ كُلُّ خُطْوَةٍ يَّخْطُوْهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ وَّ يُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ۔ (متفق علیہ) ”ہر روز سورج نکلتا ہے تو انسان کے جسم میں جتنے جوڑ بند ہیں ان میں ہر ایک کی طرف سے ایک صدقہ واجب ہوتا ہے۔ (یہ صدقہ اس طرح ادا ہوسکتا ہے کہ) دو آدمیوں کے بیچ کسی معاملے میں فیصلہ کرادیا یہ بھی ایک صدقہ ہے، کسی شخص کی اس کی اپنی سواری پر سوار ہونے کے سلسلے میں مدد کردی اور اسے اس پر سوار کرادیا یہ بھی ایک صدقہ ہے یا اس کا سامان اٹھا کر اوپر رکھوادیا یہ بھی ایک صدقہ ہے۔ پاک اور بھلی بات بھی ایک صدقہ ہے۔ اور ہر قدم جو نماز کے لیے جانے کو اٹھایا جاے ایک صدقہ ہے۔ اور راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹادیا تو یہ بھی ایک صدقہ ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تسبیح وتحمید اور نماز ہی نہیں بل کہ ہر نیک کام جو انسان کرسکتا ہے وہ صدقہ قرار پاتا ہے بہ شرطے کہ اس کا وہ نیک کام خدا کے یہاں شرف قبولیت حاصل کرلے۔

کسی چھوٹے سے چھوٹے بھلے اور اچھے کام کو حقیر نہ سمجھنے کے کئی وجوہ ہوسکتے ہیں:

(۱) نیکی خواہ بہ ظاہر چھوٹی اور ہلکی کیوں نہ ہو اگر اس کے پیچھے صحیح ایمانی جذبہ موجود ہے تو وہ قابلِ قدر ہے۔ اس کی تحقیر درحقیقت ایمانی جذبہ کی تحقیر ہے۔

(۲) کوئی بھی نیک کام ہو اس سے اس کا سراغ لگتا ہے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ بہ قول شخصے چٹکی بھر دھول کی کیا حقیقت لیکن اس سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ہوا کا رُخ کیا ہے۔

(۳) ہر ایک کی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی اور نہ دنیا میں کام کرنے کے سب کو یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی صلاحیت اور موقع کے لحاظ سے آدمی جو کام بھی کرتا ہے وہ خدا کے نزدیک قابلِ قدر قرار پاتا ہے۔ یہاں تک کہ صدقہ میں کھجور کا ایک ٹکڑا دینا بھی کسی کے لیے جہنم کی آنچ سے بچانے کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

(۴) چھوٹی نیکی کی قدر شناسی اگر ہم میں ہوگی تو ہم خدا سے اچھی امید قائم کرسکتے ہیں۔ اور اخلاقیات کے پہلو سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم صرف بڑے کام ہی کو کام سمجھتے ہیں تو مایوسی کا شکار ہونے سے ہم اپنے آپ کو نہیں بچاسکتے۔

(۵) پھول خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے وہ پھول ہیں، نگاہوں کو بھلے لگتے ہیں۔ کسی بھی پھول کی تحقیر پوری جنسِ گُل کی اہانت ہے۔

(۶) حضورؐ کی اس تعلیم کو جس کا ذکر اس حدیث میں ہوا ہے اختیار کرنے کے بعد ہماری نگاہ میں ہر وہ شخص قابلِ قدر ٹھہرے گا جو اپنی صلاحیت کے لحاظ سے کوئی نیک کام کر رہا ہو خواہ وہ کام بہ ظاہر چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۷) زندگی کو حسین بنانے والے اور اسے درست رکھنے والے اور لوگوں کے لیے کشش و جاذبیت کا باعث بننے والے کام بالعموم ایسے ہی ہوتے ہیں جو بہ ظاہر چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ معاشرت اور اسلامی تہذیب کی جان ہوتے ہیں۔

(۸) آدمی کی صحیح پہچان ان ہی کاموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو بہ ظاہر غیر اہم اور چھوٹے نظر آتے ہیں۔ کوئی آدمی کیسا ہے، یہ جاننے کے لیے اس کے منہ سے نکلی ہوئی ایک چھوٹی اور مختصر سی بات ہی کافی ہوسکتی ہے۔ آدمی کی زبان پر آئی ہوئی ایک بات یا اس کا چھوٹا سا عمل بھی ایسا ہوتا ہے جو اس کی پوری شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح ایک چھوٹا سا جملہ یا عمل یا تو اس کی عظمت کا مظہر ہوتا ہے یا پھر اس کی پستی اور نکبت کی غمازی کرتا ہے۔ خوب صورت چہرے سے اگر ذرا بھی نقاب ہٹ جائے تو اس کی خوب صورتی عیاں ہو جاتی ہے ٹھیک اسی طرح بھلے آدمی کا ایک چھوٹا عمل بھی اس کی شخصی خوبیوں کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اعمال جہاں ہماری شخصیت کو اور ہمارے کردار کو ظاہر کرتے ہیں وہیں ان کے ذریعہ سے ہماری اپنی شخصیت کی تعمیر بھی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چھوٹی سی چھوٹی نیکی بھی اپنا رول ادا کرتی ہے۔

قدر شناسی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَیْئًا وَّ لَوْ اَنْ تَلْقٰی اَخَاکَ بِوَجْہٍ طَلْقٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ”کسی بھی اچھے کام کو حقیر مت سمجھو اگرچہ وہ کام یہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے کشادہ پیشانی کے ساتھ ملو۔“

صدق

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ الصِّدْقَ یَھْدِیْٓ اِلَی الْبِرِّ وَ اِنَّ الْبِرَّ یَھْدِیْٓ اِلَی الْجَنَّةِ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقُ حَتّٰی یَکُوْنَ صِدِّیْقًا، وَّ اِنَّ

الْكَذِبَ يَهْدِيْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَ اِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ اِلَى النَّارِ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبد اللہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''صدق (سچائی) نیکی کی راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت میں لے جاتی ہے۔ اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ صدیق ہو جاتا ہے۔ اور جھوٹ فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے اور فسق و فجور دوزخ میں لے جاتا ہے۔ اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے ہاں کذّاب (بڑا جھوٹا) لکھا جاتا ہے۔''

تشریح: مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے: اِنَّ الصِّدْقَ بِرٌّ وَّ اِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ۔ ''صدق (سچائی، سچ بولنا) نیکی و وفا شعاری ہے اور یقیناً نیکی و وفا شعاری جنت میں پہنچاتی ہے۔''

آدمی کے اندر اگر سچائی نہیں تو اس پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ قابلِ اعتماد نہیں رہا تو پھر کسی نیکی اور وفا کی اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ایسا شخص خدا کی اس جنت کا مستحق کیوں کر ہو سکتا ہے جو ان کی جائے قرار ہے جو نیک اور وفا شعار ہوتے ہیں۔

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے: وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَ يَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا۔ (آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ خدا کے یہاں وہ صدیق لکھ لیا جاتا ہے) اور وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَ يَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا (آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے اور تلاش کر کر کے جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ انجام کار خدا کے یہاں وہ کذّاب لکھ لیا جاتا ہے)۔

صدق پر قائم رہنے والا اور ہمیشہ سچ بولنے والا شخص خدا کے یہاں صدیق کا لقب پاتا ہے۔ قرآن مجید میں انبیاءؑ کے بعد صدیقین کا ذکر کیا گیا ہے (النساء: آیت ۶۹)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیق اخلاق و کردار کے نہایت بلند مقام پر فائز ہوتا ہے۔ صدق اور راستی جس کا شیوہ ہوا سے اس مقام بلند پر پہنچنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

وَابْنَ السَّبِيلِ لا وَالسَّآئِلِينَ وَ فِي الرِّقَابِ ج وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا ج وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (سورۃ البقرہ:۱۷۷) ”نیکی و وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم اپنے منہ پورب اور پچھم کی طرف کرلو۔ نیکی و وفاداری تو اس کی وفاداری ہے جو اللہ اور روزِ آخر، اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال اس کی محبت کے باوجود، رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور سائلوں کو دے اور گردنیں چھڑانے میں بھی اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور اپنے عہد کو ایسے لوگ پورا کرنے والے ہوں اور تنگی اور جسمانی تکالیف میں اور لڑائی کے اوقات میں ثابت قدم رہیں، وہی تو ہیں جو سچے ثابت ہوئے اور وہی لوگ اہلِ تقویٰ ہیں۔“

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں سچا وہ ہے جو ہر معاملہ میں اور ہر موقعہ پر سچا ثابت ہوسکے۔

جس طرح صدق نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے ٹھیک اسی طرح جھوٹ تمام قسم کے فسق و فجور کی جڑ اور بنیاد ہے۔ ایسا شخص جس نے جھوٹ کو اپنا شعار بنا رکھا ہوتا ہے برائی کے کاموں میں اسے کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ بالآخر وہ جہنم میں جا پڑتا ہے اور خدا کے یہاں اس کا شمار جھوٹوں اور بڑے کاذبوں میں ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنے کردار و اعمال کے لحاظ سے کذّاب ہوتا ہے اور خدا کے یہاں سے بھی اسے یہی لقب ملتا ہے۔

(۲) وَ عَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا فَاِنْ صَدَقَا وَ بَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَ اِنْ كَتَمَا وَ كَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”خرید و فروخت کرنے والے دونوں اختیار رکھتے ہیں جب تک باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ اگر دونوں سچ بولیں اور چیز کی حقیقت بیان کردیں تو ان کے لیے ان کی بیع میں برکت عطا کی جاتی ہے، لیکن اگر وہ چھپائیں اور کذبِ بیانی سے کام لیں تو ان کی بیع کی برکت ختم کردی جاتی ہے۔“

تشریح: یعنی جب تک جدا نہ ہوں انھیں بیع کو فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے۔ جدا ہونے کے بعد بیع کو فسخ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا الا یہ کہ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان ایسی کوئی بات طے پا گئی ہو جس کی رو سے دونوں کے الگ ہونے کے بعد بھی بیع کے فسخ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہو۔ اختیار کی کئی صورتیں اور قسمیں ہیں جن کا تعلق مدت سے ہے اور بعض فروخت ہونے والی اشیاء کی نوعیت سے متعلق ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں ان کی تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس حدیث سے بہ ظاہر خیارِ مجلس کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن جو لوگ خیارِ مجلس کے قائل نہیں ان کے نزدیک جدا ہونے کی بات از روئے قول کہی گئی ہے۔ یعنی جب تک گفتگو چل رہی ہے اور خرید و فروخت کا معاملہ ابھی پورے طور پر طے نہیں پاسکا ہے، ان کو اختیار ہے کہ وہ بیع کو فسخ کردیں۔ لیکن بات اگر مکمل ہوگئی۔ ایک نے کہا کہ میں نے فروخت کیا اور دوسرے نے کہا کہ میں نے خریدا تو بیع کو فسخ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہا۔ الّا یہ کہ مال میں کوئی ایسا عیب وغیرہ نکل آئے جس سے خریدار کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ اسے اس کی اطلاع نہ تھی۔

جدا ہونا از روئے قول اور عہد و پیمان کی مثال قرآن میں ملتی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَ اِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ (النساء: ۱۳۰) ”اگر دونوں (مرد و عورت) الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کردے گا۔“

یہاں الگ یا جدا ہونے سے مراد عورت کو طلاق دے دینا ہے۔ مجلس یا گھر سے جدا ہونا مراد نہیں ہے۔

بیع میں خیر و برکت دونوں ہی فریق کے لیے رکھی گئی ہے بہ شرطے کہ وہ معاملہ میں صدق اور سچائی اختیار کریں۔ بہ صورت دیگر وہ خیر و برکت سے محروم رہیں گے۔

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا یَنْبَغِیْ لِصِدِّیْقٍ اَنْ یَّكُوْنَ لَعَّانًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صدیق کے شایانِ شان نہیں کہ وہ بہت لعنت کرنے والا ہو۔“

تشریح: صدیق انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ نبی اکرم (ﷺ) کا اسوہ ہمیشہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسولِ خدا (ﷺ) نہ فحش گو تھے، نہ لعنت

کرنے والے اور نہ بدکلام تھے (بخاری)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! مشرکوں کے حق میں بددعا کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَّ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً۔ ''مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے بل کہ مجھے تو رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔''

صدیقین کے دلوں میں بھی بندگانِ خدا کے لیے خیر خواہی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ مخالفین کی طرف سے وہ تکالیف برداشت کرتے ہیں لیکن ان کی تمنا اور سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ لوگ راہِ راست پر آسکتے۔ ان کی یہ خو انبیاءؑ کے اخلاق سے ملتی جلتی ہے۔ جن کے قلوب کا یہ حال ہو کہ وہ اپنے دشمن کی بہی خواہی سے بھی باز نہ آتے ہوں، ان پاک باز ہستیوں کے لیے یہ کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ خلقِ خدا میں وہ اس کے لیے معروف ہوں کہ وہ لوگوں کو پھٹکارتے اور ان پر لعنتیں بھیجا کرتے ہیں۔

شرحِ صدر

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: تَلاَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ النُّوْرَ اِذَا دَخَلَ الصَّدْرَ انْفَسَحَ، فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰہِ هَلْ لِتِلْكَ مِنْ عَلَمٍ يُّعْرَفُ بِهٖ؟ قَالَ: نَعَمْ اَلتَّجَافِيْ مِنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ۔

(البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے تلاوت فرمایا: ''فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ'' (پس جس کسی کو اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ (الانعام: ۱۲۵) پھر فرمایا کہ ''جب نور سینے میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ فراخ و کشادہ ہو جاتا ہے۔'' دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کیا اس حالت کی ظاہر میں کوئی علامت بھی ہے جس سے اسے پہچانا جاسکے؟ فرمایا: ''ہاں، دھوکے کے گھر (دنیا) سے دور ہونا اور ہمیشگی کے گھر کی طرف رجوع کرنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیار رہنا۔''

تشریح: قرآن مجید میں بھی دنیا کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: فَلاَ تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وقفة (لقمان: ۳۳) ’’پس دنیا کی زندگی تمھیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے۔‘‘

دنیا اور آخرت کو حدیث میں دو سوکنوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اگر ان میں سے ایک خوش ہو تو دوسری اس سے ناخوش اور ناراض ہو جاتی ہو۔ ایک کی طرف میلان ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ دوسری سے کشیدگی اختیار کی جائے۔ دنیا سے جو دھوکے کا گھر ہے بے زاری اور آخرت کی طرف جھکاؤ اور توجہ کا تعلق درحقیقت قلبی کیفیات سے ہے۔ اسی لیے ان کو دخولِ نور کا نتیجہ اور علامت قرار دیا گیا ہے۔ نور بھی دراصل ایک کیفیت ہی کا نام ہے۔ یہ ظاہری علوم وعقائد سے آگے کی چیزیں ہیں۔ ان کے بغیر انسان کی تکمیل اور تزکیہ صحیح معنی میں نہیں ہو پاتا۔

یقین و ایمان

⟨۱⟩ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: اَوَّلُ صَلاَحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَ اَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْاَمَلُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اس امت کی اولین بھلائی یقین و زہد ہے اور پہلا فساد اور بگاڑ بخل اور (غلط قسم کی) امید و آرزو ہے۔‘‘

تشریح: یقین اور زہد لازم و ملزوم ہیں۔ یہ دونوں چیزیں تمام تر بھلائیوں اور صلاح و فلاح کا سرچشمہ ہیں۔ فرد ہی نہیں امت کی صلاح و فلاح بھی اسی سے وابستہ ہے۔ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہی ہے کہ اس منبعِ خیر سے امت کس حد تک فیض یاب ہو رہی ہے۔

امت کو جب تک خدا کی ذات پر یقین اور بھروسہ ہوگا کہ وہ اس کا کفیل اور نگہبان ہے، اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر وہ کام یابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے، وہ کبھی بھی غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ کوئی بھی جو دنیا پرستی سے اپنے کو دور رکھے گا اور دنیا کی حرص اور محبت کے بہ جائے آخرت کا طالب ہوگا اسے کوئی چیز راہِ راست سے بے گانہ نہیں بنا سکتی۔ اس اعتبار سے زہد کی بڑی اہمیت ہے۔ زہد دراصل بڑی حقیقت کے پیشِ نظر چھوٹی اور حقیر چیز کی بے وقعتی کے منکشف ہو جانے کا دوسرا نام ہے۔ دنیا آخرت کے مقابلے میں حقیر اور بے حقیقت ہے۔ دنیا کے حصول

کی خاطر اپنی آخرت سے بے پرواہونا بے یقینی، دنائت اور بے ذوقی کے سوا اور کچھ نہیں۔

بخل اور بے جا آرزوئیں اور امیدیں خرابیوں اور بگاڑ کی اوّلین مظہر ہیں۔ بخل اور دنیا طلبی کی خصلت کے ساتھ امت کے لیے اس راستے پر گامزن ہونا ممکن نہیں جو خیر امت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بخل اور دنیا کی امیدیں اور آرزوئیں اسے اس عظیم کام کے لائق نہیں رہنے دیتیں جو اسے دنیا میں انجام دینا ہے، جس کے لیے خدا نے اسے اس زمین میں برپا کیا ہے۔ بخل اور حرص و آز اور دنیا طلبی کے بطن سے بے پناہ برائیاں اور خرابیاں جنم لیتی ہیں جس کا عام حالات میں آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ امت میں جب آپ دیکھیں کہ بخل اور دنیا طلبی کی بیماری پیدا ہوگئی ہے تو سمجھ جائیے کہ اس کی تباہی و بربادی کی ابتدا ہو چکی۔ اگر وہ اپنی روش نہیں بدلتی تو برے انجام سے دوچار ہونے سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِنَّ الْحَیَا وَالْاِیْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ، فِیْ رِوَایَةِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُهُمَا تَبِعَهُ الْاٰخَرُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”حیا اور ایمان دونوں یکجا قریب رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے جب ایک اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھالیا جاتا ہے۔“ حصرت ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ”جب ان میں ایک سلب کرلیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اسی کا ساتھ دیتا ہے (یعنی سلب ہوجاتا ہے)۔“

تشریح: بعض نسخوں میں قُرَنَاءُ کے بہ جائے قُرِنَا صیغہ تثنیہ کی صورت میں آیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حیا اور ایمان میں باہم گہرا رشتہ اور تعلق پایا جاتا ہے۔ دونوں میں ایک دوسرے سے گہری وابستگی پائی جاتی ہے۔ مومن کو جس حقیقت کا یقین ہوتا ہے اور وہ جس پر ایمان رکھتا ہے اس کا تقاضا محض فکر اور ظاہری اعمال کی تصحیح نہیں ہے بل کہ اس سے آگے بڑھ کر وہ ہمارے جذبات و احساسات اور کیفیاتِ دل تک کی اصلاح کی متقاضی ہے۔ حیا کا مزاج حد درجہ نازک ہوتا ہے۔ یہ انسان کے لطیف ترین احساسات کا مظہر ہے۔ ”حیا ایمان کا ایک شعبہ یا شاخ ہے۔“ (بخاری، مسلم) پھر ایمان کو ایک خشک تصوّر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حدیث کا ماحصل یہ ہے

کہ اگر حیا نہیں تو ایمان کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ایمان چلا گیا یا سلب ہوگیا تو پھر ایسی صورت میں کسی شخص سے حیا اور شرم کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَ بَرَّهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے: ''بہت سے پراگندہ بال وغبار آلود لوگ جنھیں دروازوں سے دھکّے دے کر ہٹا دیا جاتا ہے ایسے ہیں کہ اگر وہ (کسی بات کے لیے) خدا کی قسم کھالیں تو لازماً خدا ان کی قسم پوری کر دے۔''

تشریح: ایک دوسری طویل روایت میں بھی یہ بات ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے: اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَّوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (بخاری، مسلم) ''خدا کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو لازماً خدا اسے پورا کرے۔'' یعنی ان کو ان کی قسم میں سچا کر دے۔ جس بات کی وہ قسم کھالیں وہ پوری ہو کر رہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جن کا یقین ایسا ہوتا ہے کہ خدا اسے سچا کر دکھاتا ہے۔ وہ اگر اپنے یقین واطمینان پر خدا کی قسم کھالیں تو وہ حانث نہیں ہوتے۔ وہ خدا ان کے یقین کی پاس داری فرماتا ہے جس پر ان کو بھروسہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ایسے لوگوں کو عام نگاہیں نہ پہچان سکیں اور وہ ان کو ذلیل نظر آئیں۔ اور امیر وکبیر لوگ اسے پسند نہ کریں کہ وہ ان کے دروازے پر آئیں۔ لیکن خدا کی نظر میں وہ ایسے عزیز و مقبول اور مرتبے والے ہوتے ہیں کہ خدا ان کے یقین اور گمان کو ردّ نہیں کرتا بلکہ ان کی قسموں کو پورا کر کے انھیں سچا ثابت کر دیتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ ؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: ثَلَاثٌ مَّنْ کُنَّ فِیْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِیْمَانِ: اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَ اَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَ اَنْ یَّکْرَهَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ کَمَا یَکْرَهُ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جس شخص کے اندر

تین باتیں موجود ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت پائے گا: اللہ اور اس کا رسولؐ اسے ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں، وہ کسی شخص سے محبت کرے تو محض خدا کے لیے محبت کرے، اسے کفر کی طرف واپس ہونا اس کے بعد کہ خدا نے اسے اس سے نجات بخشی ایسا ناگوار ہو جیسا کہ وہ آگ میں پھینک دیے جانے کو ناگوار سمجھتا ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں کامل ایمان و یقین کی پہچان بتا دی گئی ہے۔ کامل ایمان میں ایسی لذّت اور حلاوت ہوتی ہے کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ کامل ایمان اس شخص کا ہوتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے سب سے بڑھ کر محبت ہو۔ پھر کسی دوسرے سے اگر محبت کرتا بھی ہے تو وہ محض خدا کے لیے۔ یعنی اگر خدا کو پسند ہو کہ اس شخص سے محبت کا تعلق رکھا جائے جب ہی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ کفر کی طرف لوٹنے کو ایسا برا سمجھے گویا اسے آگ میں پھینکا جا رہا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان انسان کے گہرے سے گہرے جذبہ کو اپنے زیرِ اثر لاتا اور اسے نکھارتا ہے۔ ایمان اللہ اور اس کے رسولؐ کو صرف ماننے کا نام نہیں ہے بل کہ دراصل انھیں اپنا محبوب بنا لینے کا نام ہے۔ ایسے محبوب جن سے بڑھ کر کوئی بھی محبوب نہ ہو۔ ایمان کی زندگی سراپا محبت کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسی زندگی ہزار رعنائیوں کا ماحصل ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: ذَاقَ طُعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلاً۔ (مسلم) "ایمان کا لذّت شناس ہو گیا وہ شخص جو اللہ کے رب، اسلام کے دین اور حضرت محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی اور خوش ہو گیا۔"

تعظیمِ حق

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَجِلُّوا اللّٰہَ یَغْفِرْ لَکُمْ۔

(احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "خدا کی تعظیم کرو وہ تمھیں بخش دے گا۔"

تشریح: قرآن میں ہے: مَالَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ۝ (سورۂ نوح) "تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ

تم اللہ کے لیے کسی وقار و عظمت کی توقع نہیں رکھتے۔'' خدا کی عظمت اور اس کے وقار کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کی عظمتوں کے آگے پست کر دے اور اپنے آپ کو اس کی طاعت اور بندگی میں دے دے۔ اس کی عظمت اور بڑائی کا معترف ہو۔ اپنے خالق کی توقیر و تعظیم میں پاک بازی کی روش اختیار کرے اور اس کے بندوں بالخصوص اس کے فرماں بردار بندوں کے حقوق کو پہچانے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِيْ اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِيْ ظِلِّيْ، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّيْ۔ (مسلم) ''وہ لوگ کہاں ہیں جو میرے جلال کے پاس و لحاظ میں باہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟ آج میں انھیں اپنے سایہ میں جگہ دوں گا، میرے سایہ کے سوا آج اور کوئی سایہ نہیں۔''

خدا کے جلال اور اس کی عظمت کا پاس و لحاظ رکھنے والوں کو خدا بخش دے گا۔ خدا کوئی بے حس ذات نہیں ہے کہ بندہ تو اس کی عظمتوں کے آگے جھک جائے اور وہ اپنے اس بندے کی ضرورت کو جسے وہ پوری کر سکتا ہے نظر انداز کر دے۔ لازماً وہ ایسے بندوں کی بھول چوک کو معاف فرمائے گا اور اسے اپنی رحمتوں سے ڈھک لے گا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ اَلْیَوْمَ اُظِلُّهُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا: 'کہاں ہیں وہ لوگ جو میری عظمت اور جلال کی وجہ سے باہم ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے؟ آج جب کہ میرے سایے کے سوا کوئی سایہ نہیں، میں انھیں اپنے سایہ میں جگہ دوں گا۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ خدا کی عظمت کا احساس مجرد ایک احساس ہی نہیں ہے بلکہ یہ احساس انسان کی زندگی کو ایک نیا شعور بخشتا ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایسی گہرائی، ترفّع اور پاکیزگی آجاتی ہے اور زندگی ایک ایسی لذّت سے آشنا ہو جاتی ہے جس کا عام حالات میں کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ دنیا میں یوں تو لوگ ایک دوسرے سے تعلق و محبت رکھتے ہی ہیں لیکن اُس تعلق و محبت کی بات ہی اور ہے جس کے پیچھے خدا کی عظمت کا احساس کام کر رہا ہو، جو خدا کی بڑائی کا تقاضا بن کر سامنے آئے۔

خدا کے اس ارشاد سے کہ ''وہ لوگ کہاں ہیں جو باہم ایک دوسرے سے میری عظمت کی وجہ سے محبت رکھتے تھے'' مقصود درحقیقت ان کی عزت افزائی اور ان کی توقیر ہے۔

قیامت کے روز جن کو خدا کی رحمت اور عرش کا سایہ مل گیا وہ اپنی خوبیٔ قسمت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ اس روز جن کو خدا کا سایہ نہ مل سکا انھیں کوئی بھی سایہ میسر نہ ہوگا۔ کوئی نہ ہوگا جو ان کے لیے کوئی سایہ فراہم کر سکے۔ اس روز جھوٹے سہارے سب ختم ہو چکے ہوں گے۔ یہ ایسا دن ہوگا کہ باطل کا باطل ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا۔ جھوٹے معبودوں کے پرستاروں کے حصے میں اس دن خوف، حسرت و ندامت اور شرم ساری کے سوا اور کچھ نہ آ سکے گا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَا اَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِّلّٰہِ اِلاَّ اَکْرَمَ رَبَّہٗ عَزَّوَجَلَّ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس بندے نے اللہ کے لیے کسی بندے سے محبت کی تو لازماً اس نے اپنے رب عزوجل کی تعظیم و توقیر کی۔''

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ ہم خدا کی عظمت کا پاس و لحاظ نہیں رکھتے اگر ہم ان لوگوں سے کوئی تعلق خاطر نہیں رکھتے جو ہماری محبت کے مستحق ہیں۔ اہل ایمان کی کسی سے محبت محض محبت نہیں ہے بلکہ یہ رب کی تعظیم بھی ہے۔ خوشا وہ محبت جس کا رشتہ اور سلسلہ خدائے رب العزت سے ملتا ہو۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ مِنْ اِجْلاَلِ اللّٰہِ اِکْرَامُ ذِی الشَّیْبَةِ الْمُسْلِمِ وَ حَامِلِ الْقُرْاٰنِ غَیْرَ الْغَالِیْ فِیْہِ وَلاَ الْجَافِیْ عَنْہُ وَ اِکْرَامُ السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ۔ (ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی بوڑھے مسلمان کی تعظیم کرنی اور ایسے حامل قرآن کی جو اس میں افراط و تفریط سے نہ کام لیتا ہو درحقیقت اللہ ہی کی تعظیم کرنے میں شامل ہے۔ اسی طرح منصف سلطان کی تعظیم بھی۔''

تشریح: جو شخص قرآن کا حامل و حافظ ہو اور اس کے حقوق کو پہچانتا ہو وہ اکرام کا مستحق ہے۔ اسی طرح وہ حکمراں بھی جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو کبھی فراموش نہ کرتا ہو اس کی تعظیم و تکریم بھی

ہمارے لیے ضروری ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہونے کی وجہ سے تمام خوبیوں سے متصف ہے، عادل اور منصف حاکم کا عدل وانصاف خدا کی صفت عدل کا مظہر ہے اس لیے خدا کی تعظیم کا تقاضا ہے کہ حامل قرآن اور منصف سلطان دونوں ہی کی تکریم کی جائے۔

اسی طرح وہ مسلمان بھی ہمارے لیے محترم ہے جو طاعتِ خداوندی میں بڑھاپے کو پہنچ گیا۔ اس احترام کی وجہ محض بڑھاپا نہیں بل کہ وہ درازیِ عمر ہے جو مومنانہ بسر ہوئی ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایک مسلم کی نگاہ میں ہمیشہ خدا کی ذات ہی رہتی ہے، اسی سے وہ زندگی کے آداب اخذ کرتا ہے۔ وہ زندگی میں جو رویّہ بھی اختیار کرتا ہے خدا ہی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ یہی حقیقت میں وہ مرتبۂ احسان ہے، جس کو حاصل کرنے کی کوشش ہر ایک شخص کو کرنی چاہیے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلَا یَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ اِنْ شِئْتَ وَ لٰکِنْ لِّیَعْزِمْ وَلْیُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَتَعَاظَمُهٗ شَیْءٌ اَعْطَاهُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت فرما بلکہ موکّد طریقے سے اصرار کے ساتھ دعا کرے اور اپنی ہمت اور خواہش کو بلند رکھے کیوں کہ کوئی بھی چیز عطا کر دینی خدا کے ہاں کچھ بھاری نہیں۔''

تشریح: شرط کے ساتھ دعا مانگنی کہ خدایا! تو چاہے تو اسے قبول کر اور چاہے تو قبول نہ کر، کسی طرح بھی صحیح نہیں اس لیے کہ اس طرح سے دعا مانگنے میں بندے کی بے نیازی ظاہر ہوتی ہے جو خلافِ حقیقت اور جذبۂ عبودیت کے منافی ہے۔ اور اگر اپنے مخاطب خدا کی سہولت کے لیے وہ شرط کے ساتھ دعائیں مانگتا ہے تو بھی یہ بے معنی اور خدا کی شان میں ایک گستاخی ہے۔ خدا کے لیے تو کوئی کام بھی دشوار نہیں کہ اس کی سہولت کا خیال رکھا جائے۔ خدا کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کو جو چاہے عطا فرمائے، اس میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یُسْأَلُ بِوَجْهِ اللّٰهِ اِلَّا الْجَنَّةُ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے: ''خدا کے روئے انور کا واسطہ دے کر صرف جنت ہی طلب کی جاسکتی ہے۔''

تشریح: روئے خداوندی کا واسطہ دے کر یا اس کے طفیل میں کچھ طلب کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کہیں اس سے روئے حق کی اہانت نہ ہو رہی ہو۔ جس کے پیشِ نظر خدا کا روئے انور ہو اسے اس سے کم تر چیز کے طلب کرنے کا خیال کیوں کر آسکتا ہے۔ ہاں اس وجہ کریم کا واسطہ دے کر اگر کوئی چیز طلب کی جاسکتی ہے تو وہ صرف متاعِ جنت ہے۔ یہ اس لیے کہ جنت درحقیقت خدا کے دیدار اور اس کے قرب کا محل ہے ورنہ مخلوقات میں کوئی بھی شے ایسی نہیں ہے جسے اس وجہِ کریم کے طفیل میں کوئی طلب کر سکے۔

رضا

(۱) عَنْ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهٗ وَ مِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهٗ اِسْتِخَارَةَ اللّٰهِ وَ مِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهٗ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهٗ۔ (احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''یہ ابنِ آدمؑ کی خوش نصیبی میں سے ہے کہ خدا کی جانب سے اس کے لیے جو بھی فیصلہ ہو وہ اس پر راضی رہے اور یہ ابن آدمؑ کی بد نصیبی میں سے ہے کہ وہ خدا سے خیر اور بھلائی طلب کرنا ترک کردے اور ابنِ آدمؑ کی بدبختی یہ بھی ہے کہ خدا کا جو فیصلہ اس کے حق میں ہو اس پر وہ ناخوش ہو۔''

تشریح: آدمی نہیں جانتا کہ اس کے حق میں کیا بھلا ہے اور کیا برا۔ اس کو ہر حالت میں خدا کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔ یہی اس کے لیے سعادت مندی کی بات ہے۔ البتہ اس کے رب کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ اپنے رب سے ہمیشہ خیر طلب کرتا رہے۔ اس طرح اپنے رب سے اس کا تعلق و ربط بھی قائم رہے گا۔ یہ تعلق اور رشتہ غیر معمولی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ قرآن میں ہے وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْــٴًـا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۠ (البقرہ:۲۱۶) اور بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرو

اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو، جانتا اللہ ہے، تم نہیں جانتے۔"

وہ شخص بڑا بدبخت ہے جو خدا کے فیصلے پر راضی اور مطمئن نہ ہو بلکہ اس پر ناراض اور ناخوش ہو، اسے شکایت ہو کہ خدا نے اس کے لیے جو فیصلہ کیا ہے وہ اسے پسند نہیں۔ ایسے شخص کو اطمینان وسکون کی دولت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ خدا سے تعلق اور اس کی محبت اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے ہر چیز کی تلافی ہو جاتی ہے ؎

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ ؓ **قَالَ: دَخَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی اَبِیْ سَیْفِ الْقَیْنِ وَ کَانَ ظِئْرًا لِّاِبْرَاهِیْمَ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِبْرَاهِیْمَ فَقَبَّلَهٗ وَ شَمَّهٗ ثُمَّ دَخَلْنَا عَلَیْهِ بَعْدَ ذٰلِکَ وَ اِبْرَاهِیْمُ یَجُوْدُ بِنَفْسِهٖ فَجَعَلَتْ عَیْنَا رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ تَذْرِفَانِ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ** ؓ **وَّ اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ یَا ابْنَ عَوْفٍ اِنَّهَا رَحْمَةٌ ثُمَّ اَتْبَعَهَا بِاُخْرٰی فَقَالَ اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا وَ اِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاهِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ۔** (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ ابوسیف حداد کے یہاں گئے جو (رسول خدا ﷺ کے صاحب زادے) ابراہیم کی دایہ کے شوہر تھے۔ نبی ﷺ نے ابراہیم کو گود میں لیا پھر ان کا بوسہ لیا اور انھیں سونگھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہم پھر ان کے ہاں گئے، ابراہیم اس وقت حالتِ نزع میں تھے۔ یہ دیکھ کر رسولِ خدا ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ بھی روتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اے ابن عوف! یہ رحمت ہے۔ اس کے بعد آپؐ کی آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے اور آپؐ نے ارشاد فرمایا: "آنکھیں اشک بار ہیں اور دل غمگین ہے لیکن اس کے باوجود ہم وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی اور خوش ہو سکے اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔"

تشریح: ابو سیف کا نام براء تھا۔ ان کی بیوی خولہ بنت منذر انصاریہ تھیں جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بیٹے ابراہیم کی دایہ تھیں۔ حضرت ابراہیم کی سولہ یا سترہ مہینے کی عمر میں وفات ہوئی ہے۔

آپؐ نے پیار میں ابراہیم کے منہ پر اپنی ناک اور منہ کو اس طرح رکھا جیسے کوئی خوش بو سونگھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے بچہ کو خوب پیار کیا۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کا کہنا یہ تھا کہ کسی کی موت پر تو عام انسان ضرور رو دیتے ہیں مگر آپؐ تو خدا کے پیغمبر ہیں، آپؐ کی آنکھیں آنسو بہائیں، ہمیں اس پر بے حد تعجب ہو رہا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو جواب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ جو چیز تم دیکھ رہے ہو یہ رحمت ہے، یعنی یہ رونا جذبۂ رحمت کے سبب سے ہے۔ یہ آنسو رحمت و محبت کے سبب سے بہے ہیں۔ یہ شکایت کے آنسو ہرگز نہیں ہیں، خدا کے فیصلے پر راضی رہنا عین تقاضائے عبودیت ہے۔ ایسے موقع پر آنکھیں نم ناک نہ ہوں تو یہ دل کی سختی کی علامت ہے۔ سخت دلی پیغمبر تو کیا عام انسان کے لیے بھی بڑے عیب کی بات ہے۔

آپؐ کے ارشاد سے عیاں ہے کہ آپؐ کو حضرت ابراہیمؑ کی جدائی کا صدمہ اور غم بھی ہے، آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے ہیں، دل غمگین بھی ہے لیکن اس سب کے باوجود زبان پر کوئی حرفِ شکایت نہیں، یہاں کمالِ انسانیت اور کمالِ بندگی کا مظاہرہ ایک ساتھ ہو رہا ہے۔ یہی رضا کا مقام ہے جو سعادت کا اعلیٰ مقام ہے۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ یہ آدمی کی سعادت میں سے ہے کہ اللہ نے اس کے لیے جو فیصلہ کر دیا ہو وہ اس پر راضی ہو۔ (مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضٰى اللّٰهُ لَهٗ) (ترمذی، احمد)

وفا

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلَّا قَالَ: لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ. (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے خطبوں میں) ایسا کم ہی خطاب کیا ہوگا جس میں یہ نہ فرمایا ہو: ''اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں۔''

تشریح: ''ایک دوسری حدیث میں خیانت اور عہد شکنی کو نفاق کی خصلتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان اور دین کا آدمی کے کردار اور معاملات زندگی سے گہرا ربط و تعلق ہے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی امانت دار ہو اور دین آدمی کو عہد کا پابند بناتا ہے۔ اگر کسی شخص میں امانت داری نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایمان کے تقاضوں اور اس کے مطالبات سے بے خبر اور اس کا دل ایمان کی کیفیت سے نا آشنا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی سے کیے ہوئے عہد کی پابندی نہیں کرتا تو ابھی وہ دین کی حقیقی نفسیات کو نہیں سمجھتا۔ دین آدمی کو خدا کا بندہ اور اس کا اطاعت گزار بناتا ہے۔ اب اگر کوئی کسی انسان سے کیے ہوئے اپنے ایک عہد کا پاس و لحاظ رکھنے میں قاصر ہے تو پھر وہ اپنی پوری زندگی میں کیسے اس عظیم عہد کو نباہ سکتا ہے جو اس نے اپنے خدا سے کیا ہے۔

خوفِ خدا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَیْسَ شَیْءٌ اَحَبَّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ قَطْرَتَیْنِ وَ اَثَرَیْنِ قَطْرَةُ دُمُوْعٍ مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَ قَطْرَةُ دَمٍ تُهْرَاقُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اَمَّا الْاَثَرَانِ فَاَثَرٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اَثَرٌ فِیْ فَرِیْضَةٍ مِّنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی بھی چیز اللہ کو دو قطروں اور دو نشانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں۔ ایک قطرہ ان آنسوؤں کا ہے جو خدا کے خوف سے نکلیں اور دوسرا قطرہ اس خون کا ہے جو خدا کی راہ میں گرایا جائے۔ اور رہے دو نشان تو ان میں سے ایک نشان تو وہ ہے جو خدا کی راہ میں پڑے اور دوسرا نشان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فرائض میں سے کسی فریضہ کی ادائیگی میں لگے۔''

تشریح: آنسوؤں کے وہ قطرے جو خوفِ خدا سے گرتے ہیں خدا کو سب سے بڑھ کر محبوب ہوتے ہیں یا پھر خون کے وہ قطرے سب سے بڑھ کر محبوب ہوتے ہیں جو اس کی راہ میں لڑتے ہوئے زخمی یا شہید ہونے سے گرتے ہیں۔ خدا کے خوف سے گرے ہوئے آنسوؤں کے قطرے انسان کے اندرون کی پاکیزگی اور شرافت کا مظہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح راہِ خدا میں گرے ہوئے خون کے قطرے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ بندے نے دنیا میں جو زندگی اختیار کی تھی وہ

خدا طلبی کی زندگی تھی۔ خدا کی خوش نودی کے حصول کے لیے بندہ وہ سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا جو اسے حاصل تھا حتیٰ کہ اپنی جان عزیز کو بھی قربان کردینے سے اس نے گریز نہیں کیا۔ اس کامل فدائیت اور وفا شعاری پر اگر خدا کی رحمت نثار نہ ہوتی تو کس پر ہوتی۔

راہِ خدا میں پڑے نشان و اثر سے مراد قدموں یا زخموں وغیرہ کے نشان ہیں۔ اسی طرح فریضہ کی ادائے گی کے نشان و اثر سے مراد کئی چیزیں ہوسکتی ہیں مثلاً حج میں قدموں کا گرد آلود ہونا، روزہ کی وجہ سے جسم کی نقاہت اور منہ کی بو وغیرہ، نمازی کے چہرے کی رونق جو اپنے رب سے ہم کلام اور اس کے آگے سربسجود ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے سے نمایاں ہوتی ہے۔ قرآن میں بھی آیا ہے: سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ (الحجرات:۲۹) ''ان کا امتیاز ان کے چہروں سے سجدوں کے اثر سے ظاہر ہے۔''

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكٰی مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ حَتّٰی یَعُوْدَ اللَّبَنُ فِی الضَّرْعِ، وَلَا یَجْتَمِعُ غُبَارٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ دُخَانُ جَهَنَّمَ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کے خوف سے رو پڑنے والا دوزخ میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ (تھن سے نکالا ہوا) دودھ تھن میں واپس نہ ہوجائے اور اللہ کے راستے کا غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہ ہوں گے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح تھن سے نکلا ہوا دودھ تھن میں واپس نہیں ہوتا اسی طرح کسی ایسے شخص کا دوزخ میں داخل ہونا ناممکن ہے جو خوفِ خدا سے دنیا میں رو پڑا ہو، بہ شرطے کہ یہ رونا رسمی اور دکھاوے کا نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح جس شخص نے دنیا میں خدا کے راستے میں جدوجہد کی اور راہِ خدا میں اسے گردوغبار اور مختلف پریشانیوں سے سابقہ پیش آیا اسے آخرت میں جہنم کے دھوئیں سے سابقہ پیش نہیں آسکتا۔ خدا کی رحمت سے بعید ہے کہ جس نے دنیا میں راہِ حق کے گردوغبار اور پریشانیوں کا خیر مقدم کیا ہو اور جب وہ خدا کے پاس حاضر ہو تو وہاں اس کے حصے میں جہنم کا دھواں اور آگ و شعلے آئیں۔ دنیا کی پریشانیاں آخرت کی پریشانیوں سے مامون و محفوظ رہنے کی ضمانت ہیں۔

خدا کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ اس کا فیصلہ کسی کے حق میں یہ ہو کہ دنیا میں خدا کی راہ میں وہ کوشاں ہو اور راہ کی گرد اور اس کے غبار سے اسے سابقہ پیش آئے اور آخرت میں داخل ہو تو جہنم کا دھواں اس کی تقدیر بنے، یہ تو انتہائی بے مروتی اور بے حسی کی بات ہوگی۔

غبار اور دھوئیں میں مشابہت ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ راہِ خدا کا غبار اور جہنم کا دھواں دونوں جمع نہ ہوں گے یعنی کسی کے حصہ میں دونوں چیزیں نہیں آسکتیں۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم دونوں میں سے کس چیز کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ جہنم اور اس کے دھوئیں سے نجات مل سکے تو پھر ہم کو راہِ خدا کے گرد و غبار اور اس راہ میں پہنچنے والی تکالیف اور پریشانیوں کو اختیار کرنا ہوگا۔

یہ حدیث اس پہلو سے بھی بہت ہی اہم ہے کہ اس میں مومن کے دل کی دنیا اور اس کی ظاہری حیات دونوں ہی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ مومن کا دل خوفِ خدا کے احساس سے معمور ہوتا ہے اور اس کی عملی زندگی کا رُخ کیا ہے، اس کی خبر ان سرگرمیوں سے ملتی ہے جو خدا کے راستے میں وہ دکھا رہا ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: عَیْنَانِ لاَ تَمَسُّھُمَا النَّارُ عَیْنٌ بَکَتْ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ وَ عَیْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دو آنکھیں ایسی ہیں جن کو دوزخ کی آگ نہیں چھو سکتی: ایک وہ آنکھ جو خدا کے خوف سے رو پڑی ہو اور دوسری وہ آنکھ جس نے خدا کی راہ میں نگہبانی کرتے ہوئے رات گزاری ہو۔''

تشریح: انسان کو ایک عظیم خطرہ درپیش ہے۔ وہ خطرہ ہے عذاب جہنم کا۔ یہ خطرہ کس طرح ٹل سکتا ہے یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اسی کا جواب ہمیں اس حدیث میں ملتا ہے۔

آرام اور مصیبت دو جانی پہچانی حقیقتیں ہیں۔ طبیعت کے موافق جو چیزیں ہوتی ہیں وہ آرام کا سبب بنتی ہیں اور جو چیزیں ہماری طبیعت کے خلاف ہوتی ہیں وہ ہمارے لیے مصیبت اور عذاب کا باعث ہوتی ہیں۔ دنیا میں آدمی آرام اور تکلیف دونوں ہی سے دوچار ہوتا ہے۔ دنیا میں دونوں چیزیں ملی جلی سی ہیں لیکن درحقیقت یہ دونوں چیزیں دو جنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس

طرح سے ہر چیز کا معدن ومخرج ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح سے آرام وراحت کے مخرج ومنبع کو جنت سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور مصیبت وتکلیف کا اصل منبع جہنم کو قرار دیا گیا ہے۔ جس تکلیف و مصیبت کی کم تر شکلیں دنیا میں ہم دیکھتے ہیں اس کی عظیم تر شکل سے بھی انسان دو چار ہوسکتا ہے۔ اسی طرح آرام وراحت کی محدود شکلیں یہاں دکھائی دیتی ہیں، ان کی کامل شکل بھی سامنے آسکتی ہے۔ انسانی زندگی جن آثار سے گھری ہوئی ہے اگر آدمی ان میں غور وفکر سے کام لے تو اس بات کے سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہوگی کہ راحت ہو یا تکلیف سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خدا ایک زندہ باشعور ہستی ہے۔ اس کے اخلاق اور اس کی سنت کا مظاہرہ ہماری زندگیوں میں مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ خدا اگر اپنے بندوں کے لیے آرام وراحت کا سامان کرتا ہے تو وہ انھیں عذاب دینا بھی جانتا ہے۔

دنیا میں تکلیفوں سے بچنے کے لیے انسان مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے۔ مثلاً گرمی سے بچنے کے لیے سایہ فراہم کرتا ہے۔ ائر کنڈیشنڈ مکان کے اندر رہائش اختیار کرتا ہے۔ سردی سے محفوظ رہنے کے لیے وہ گرم ملبوسات کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس بڑی تکلیف سے بچنے کے لیے جو نار جہنم کی شکل میں پیش آئے گی کیا تدبیر ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک تدبیر کے سوا اس سلسلے میں ساری ہی تدبیریں ناکام ثابت ہوں گی۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ خدا کی عنایت کی نگاہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے اس حدیث میں دو چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

ایک خشیتِ الٰہی جس کی گواہی پُرنم آنکھوں نے دی ہو، دوسری بے دار آنکھیں جنھوں نے خدا کی راہ میں پہرہ داری کا فریضہ انجام دیا ہو۔ خدا کی شانِ رحمت سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسی آنکھ کو عذاب دے جس سے خوفِ خداوندی کے سبب سے آنسو رواں ہوئے ہوں یا جو راہِ خدا میں بے دار رہی ہو۔

ہر معاملے میں اخلاص کا مسئلہ اصل اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ آپ اسے بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ بندے کا اخلاص مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے کبھی ایک چیز کو بندے کی نجات کا سبب قرار دیا جاتا ہے تو کبھی کسی دوسری چیز کو اس کے نجات یافتہ ہونے کی دلیل ٹھہرائی جاتی ہے۔

ایک مومن جو راتوں میں خدا کے لیے پہرہ دیتا ہو اس سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ خائن اور غیر ذمہ دار ہوگا۔ اسی طرح خدا کے خوف سے رونے والے شخص سے اس کی توقع نہیں کی جائے گی کہ وہ ایک طرف تو خدا کے خوف سے آنسو بہائے گا لیکن دوسری طرف خدا اور اس کے بندوں کے حقوق تلف کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہوگا۔ اگر یہ بات ہے تو اس کی نہ یہ اشک باری معتبر ہے اور نہ شب بے داری۔ عمل کوئی بھی ہو وہ اسی وقت معتبر سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ بندے کے اصل کردار کا مظہر ہو نہ کہ اس کے پیچھے شہرت اور نام و نمود کی خواہش یا اسی طرح کا کوئی دوسرا جذبہ کام کر رہا ہو۔

یہ حدیث ہمیں اس بات کی ترغیب دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کو باکردار بنائیں۔ ہمارے اندر اخلاص ہو اور ہمارے اپنے اعمال ایسے ہوں کہ ان کے ساتھ جہنم میں جانا ممکن ہی نہ ہو سکے۔

‹۴› وَ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا **قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ** صلی اللہ علیہ وسلم **عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ، اَهُمُ الَّذِيْنَ يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ وَ يَسْرِقُوْنَ؟ قَالَ: لَايَا ابْنَةَ الصِّدِّيْقِ وَ لٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَ يُصَلُّوْنَ وَ يَتَصَدَّقُوْنَ وَ هُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَّا يُقْبَلَ مِنْهُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔** (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (اور جو لوگ دیتے ہیں جو کر کے دیتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ دل ان کے کانپ رہے ہوتے ہیں) کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”نہیں، اے صدیقؓ کی بیٹی! بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں اور اس کے باوجود ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے یہ اعمال قبول نہ ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں۔“

تشریح: پوری آیت اور اگلی آیت یہ ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ هُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ ○ (المومنون: ۶۰-۶۱)

”اور جو لوگ دیتے ہیں جو کر کے دیتے ہیں، اور حال یہ ہوتا ہے کہ دل ان کے کانپ

رہے ہوتے ہیں اس لیے کہ انھیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی ان کے لیے سبقت لے جانے والے ہیں۔''

''دیتے ہیں جو کر کے دیتے ہیں'' اصل میں یُؤْتُوْنَ لفظ آیا ہے۔ ''یُؤْتُوْنَ'' صرف ''مال دینے'' کے محدود معنی میں نہیں بل کہ طاعت بجالانے کے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خیال ہوا کہ ان کے لرزاں وترساں ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ برے کاموں میں ملوث ہوں، مثلاً شراب پیتے ہوں اور چوری کرتے ہوں۔ اگر وہ نیک کام کرتے ہوتے تو ان کے ڈرنے کی بہ ظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔

آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ لوگ کسی بدعملی کے شکار ہرگز نہیں ہیں، بلکہ وہ سارے نیک اعمال کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مقدور بھر کر کے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ معلوم نہیں ہمارے اعمال خدا کی نگاہ میں قابلِ قبول ٹھہریں گے بھی یا نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اعمال ہمارے رب کے ہاں ہماری مغفرت کے لیے کافی ثابت نہ ہوں۔ اور کہیں یہ نہ ہو کہ خدا کے یہاں ان میں کچھ قصور نکل آئے اور یہ نیکیاں رد کر دی جائیں۔ ڈرنے کی اصل وجہ گناہ کے کام نہیں بلکہ ان کی شریف النفسی اور وہ احساس ہے جو خدا کی عظمت اور اس کے حقوق کی اہمیت کے بارے میں وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آیت کا جو مطلب بیان فرمایا اس کی تائید میں نظم کلام سے دلیل بھی دے دی کہ ان ہی پاک بازوں کے بارے میں آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِکَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ ھُمْ لَھَا سٰبِقُوْنَ ''یہی لوگ ہیں جو بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی ان (بھلائیوں) کے لیے سبقت لے جانے والے ہیں۔'' ظاہر ہے بھلائیوں میں جلدی کرنے والے اور ان کے لیے سبقت لے جانے والے لوگ اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ کرنے والے نہیں ہو سکتے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَرٰی ذُنُوْبَہٗ کَاَنَّہٗ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ یَّخَافُ اَنْ یَّقَعَ عَلَیْہِ وَ اِنَّ الْفَاجِرَ یَرٰی ذُنُوْبَہٗ کَذُبَابٍ مَرَّ عَلٰی اَنْفِہٖ فَقَالَ بِہٖ ھٰکَذَا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''مومن اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور ڈر رہا ہو کہ کہیں وہ اس کے اوپر نہ گر پڑے۔ اور فاجر و بدکار شخص اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی مکھی ہو جو اس کی ناک پر سے گزرتی ہے۔'' کہا (راوی نے کہ) ''اور وہ ایسے کر دیتا ہے (اُڑا دیتا ہے)۔''

تشریح: ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی گناہوں کو ہلکا ہرگز تصوّر نہ کرے۔ اسے گناہوں سے ایسا ہی خائف ہونا چاہیے جیسے کوئی شخص کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور اسے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں پہاڑ اس کے سر پر نہ آ رہا ہو اور وہ ہلاک نہ ہو جائے، اس کے برخلاف فاجر و بدکار شخص کو گناہوں کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوگی۔ اس کے نزدیک گناہ کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کوئی مکھی ناک کے پاس سے گزرے جسے ہم بہ آسانی اڑا کر دور کر سکتے ہیں۔

اس حدیث میں جو تمثیل پیش کی گئی ہے وہ حد درجہ مؤثر ہے۔ اس تمثیل کے ذریعہ سے مومن اور فاجر دونوں کی جیتی جاگتی تصویر نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اس سے ہم بہ خوبی جان سکتے ہیں کہ خدا سے ڈرنے والوں کی قلبی کیفیت کیا ہوتی ہے اور ان لوگوں کی کیا نفسیات ہوتی ہے جن کے دلوں میں کسی قسم کا خوف باقی نہیں ہوتا۔ جو نہایت بے باکی کے ساتھ بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ورع

﴿۱﴾ عَنْ جَابِرٍؓ ذُكِرَ رَجُلٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِعِبَادَةٍ وَّ اِجْتِهَادٍ وَ ذُكِرَ اٰخَرُ بِرِعَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَا تَعْدِلْ بِالرِّعَةِ يَعْنِي الْوَرْعِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک شخص کی عبادت اور (اس سلسلے میں) اس کی کوشش و مشقّت کا ذکر کیا گیا اور ایک دوسرے شخص کی پرہیزگاری و پارسائی کا ذکر کیا گیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''اس (عبادت و مشقّت) کو پرہیزگاری کے مساوی نہ ٹھیرا۔'' رِعَۃِ کا مطلب ورع (پرہیزگاری) ہے۔

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ ظاہری عبادت و ریاضت میں کوئی کتنا ہی بڑھا ہوا کیوں نہ ہو وہ مرتبہ میں اس شخص کے مساوی نہیں ہو سکتا جو اپنی زندگی میں تورّع اور پرہیزگاری کا خاص خیال

رکھتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ زندگی کے معاملات میں تورّع کی روش وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جسے خدا کی عظمت اور بزرگی اور اس کے آگے اپنی جواب دہی کا پورا احساس ہو۔ دونوں شخصوں میں جوجوہری فرق پایا جاتا ہے اسے کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اصل میں لفظ رِعَۃ آیا ہے۔ کسی راوی نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد ورع و پرہیز گاری ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدِ اِلْحَسَنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍؓ قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلٰی مَالاَ یُرِیْبُکَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِیْنَۃٌ وَالْکِذْبَ رِیْبَۃٌ۔ (ترمذی، نسائی)

ترجمہ: حضرت ابو محمد حسن بن علی بن ابو طالبؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ سے سنی ہوئی مجھے یہ بات خوب یاد ہے کہ ”جو بات تمھیں شک میں ڈالے اسے چھوڑ کر وہ بات اختیار کرو جو تمھیں کسی شک میں نہ ڈالے۔ کیوں کہ سچائی سرتا سر اطمینان وسکون اور جھوٹ سراپا شک وتذبذب ہے۔“

تشریح: ایک دوسری حدیث میں ہے: اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَیْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَیْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی النَّفْسِ وَ تَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ۔ (احمد، دارمی) ”جس بات پر جی کو اطمینان ہو اور دل جس پر ٹھک جائے وہ نیکی ہے۔ اور جو جی میں کھٹکے اور دل میں خلش اور تردّد کا باعث ہو وہ گناہ ہے۔“

نیکی کی خاص صفت یہ ہے کہ اس سے دل کو سکون اور راحت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دل میں خار بن کر نہیں کھٹکتی اور نہ کسی قسم کے شک وریب میں مبتلا کرتی ہے۔ اس لیے ایسی باتوں سے اجتناب ضروری ہے جن کے اندر نیکی کی خاصیت نہ پائی جاتی ہو۔ مومن کا دل معیارِ حق ہوتا ہے۔ اس کا ذوق خود اسے مطلع کرتا رہتا ہے کہ اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ رہ ورسم پارسائی کا احترام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ذوقِ صحیح اور اپنے حاسۂ فطری کی قدر و قیمت کو پہچانتے ہیں اور اسے کسی مادی مفاد کی خاطر ہرگز قربان کرنے کو آمادہ نہیں ہو سکتے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ یَزِیْدَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لاَ یَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ حَتّٰی یَدَعَ مَالاَ بَأْسَ بِهٖ حَذْرًا لِّمَا بِهٖ بَأْسٌ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن یزیدؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی بندہ اہلِ تقویٰ میں شامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ گناہ میں پڑنے کے خوف سے اس چیز کو نہ چھوڑ دے جس میں کوئی گناہ نہیں۔''

تشریح: کسی جائز چیز سے محروم رہ جانے میں چنداں حرج نہیں لیکن اگر کوئی حرام کا مرتکب ہوگیا تو یہ اس کے لیے سنگین بات ہوگی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے سزا کے معاملہ میں ہم سب جانتے ہیں کہ مجرم سزا پانے سے بچ جائے تو یہ اتنا برا نہیں ہے جتنا کہ کسی بےقصور کو سزا دے دی جائے۔ اسی لیے شبہ کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو پہنچتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ ناجائز چیزوں سے وہ محفوظ رہے تو اسے انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑے گا، یہاں تک کہ اس احتیاط کے نتیجہ میں بعض جائز چیزیں بھی اس سے چھوٹ سکتی ہیں لیکن تقویٰ و ورع کے مقام کو پانے کے لیے اسے گوارا کرنا ہوگا۔ میمون بن مہران نے کہا کہ کوئی شخص حِل پر رک نہیں سکتا جب تک کہ حلال کے ایک حصے کو چھوڑ کر اپنے اور حرام کے درمیان اسے حائل نہ کیے رہے۔

البتہ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ شبہات کے بارے میں زیادہ باریکی اور دقیقہ رسی سے کام لینا اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو معلوم منکرات سے بچتا ہو لیکن وہ شخص جو کھلے طور پر محرمات کا مرتکب ہوتا ہوا سے یہ چیز زیب نہیں دیتی کہ وہ تورّع اور پرہیزگاری کی باریکیاں نکالتا پھرے۔ اسے تو مسیحؑ کے الفاظ میں یہی کہا جائے گا کہ مچھر چھانتا ہے لیکن اونٹ کو بےتکلف نگل جاتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ رَّضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ (ﷺ) یَقُوْلُ: اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَّ اِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ وَّ بَیْنَھُمَا اُمُوْرٌ مُّشْتَبِھَاتٌ لَّا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِہٖ وَ عِرْضِہٖ وَ مَنْ وَّقَعَ فِی الشُّبُھَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ کَالرَّاعِیْ حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ اَنْ یَّرْتَعَ فِیْہِ، اَلَا وَ اِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی اَلَا وَ اِنَّ حِمَی اللّٰہِ مَحَارِمُہٗ وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَ ھِیَ الْقَلْبُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوعبداللہ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”(دین میں) حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ البتہ ان دونوں کے درمیان کچھ باتیں مشتبہ ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو ان مشتبہ امور سے بچتا رہے اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کی طرف سے صفائی پیش کر دی اور جو مشتبہ امور میں مبتلا ہو گیا وہ حرام میں بھی مبتلا ہو کر رہے گا۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی چرواہا کسی ممنوعہ علاقے کے اردگرد اپنے جانوروں کو چراتا ہے تو قریب ہے کہ اس کے جانور اس کے اندر جا پڑیں۔ سن لو! ہر بادشاہ کا کوئی نہ کوئی ممنوعہ علاقہ ہوتا ہے اور خدا کا ممنوعہ و مخصوص علاقہ اس کے محرمات ہیں۔ سن لو! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے جب وہ ٹھیک ہوا تو پورا جسم ٹھیک ہو گیا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا۔ سن لو! وہ (گوشت کا لوتھڑا) دل ہے۔“

تشریح: ایسے امور میں جن کے ممنوع یا ناپسندیدہ ہونے کا احتمال ہو احتیاط ضروری ہے۔ اس کا امکان ہے کہ بعض امور مشتبہ کے بارے میں کسی صاحب علم کو تحقیق ہو کہ ان کا شرعی حکم کیا ہے۔ ایسے شخص کو اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن جن لوگوں کو ان کے بارے میں شرعی حکم معلوم نہیں ہے ان کو ان امور سے پرہیز کرنے ہی میں عافیت ہے۔ اگر وہ مشتبہ امور کے سلسلہ میں بے پروائی سے کام لیتے ہیں اور ان میں احتیاط نہیں کرتے تو اس کا امکان ہے کہ وہ کبھی حرام میں مبتلا ہو جائیں۔ حرام سے بچنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ مشتبہ امور میں بے پروائی سے کام نہ لیا جائے بلکہ حتی الامکان ان سے اپنے کو دور رکھا جائے۔ جن کے جانور ممنوعہ چراگاہ سے دور رہ کر چرتے ہیں وہ ممنوعہ چراگاہ میں نہیں گھس سکتے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اپنے جانوروں کو چرانے کے لیے ممنوعہ علاقے کے کنارے تک لے جاتے ہیں تو اس کا قوی اندیشہ پایا جاتا ہے کہ ان کے جانور کسی بھی وقت ممنوعہ چراگاہ کے اندر گھس جائیں۔ محرمات کی حیثیت ممنوعہ علاقے کی ہے۔ اس میں داخل ہونے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے قریب بھی نہ جائیں۔

اس معاملہ میں تورّع اور احتیاط سے کام وہی شخص لے سکتا ہے جسے قلبِ سلیم حاصل ہو اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ قلب کی صحت اور سلامتی پر جسمانی صحت و صلاح کا اصل دار و مدار ہے۔ ہمارے اعمال درست ہوں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلب کو درست رکھیں۔ دل

اگر ماسوا کا گرفتار نہیں ہے بلکہ وہ ایک خدا کا ہو گیا ہے تو لازماً انسان مشتبہات کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن اگر دل گرفتار ماسوا ہے۔ یک سوئی اور انابت الی اللہ کی کیفیت اس میں پیدا نہیں ہو سکی ہے تو اسے قلب سلیم نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صورت میں مشتبہات تو کیا انسان ممنوعات و محرمات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

قلب سلیم تمام بھلائیوں کا سرچشمہ اور بہ ذاتِ خود بڑی نعمت ہے۔ قرآن میں ہے: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَo اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍo (سورۃ الشعراء) ”جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد بجز اس کے کہ کوئی صحیح سالم دل لے کر خدا کے پاس آیا ہو۔“

صحتِ قلب کی پہچان کیا ہے؟ اس کے لیے قرآن کی یہ آیات دیکھیں: وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍo هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍo مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍo (سورۂ ق:۳۱-۳۳) ”اور جنت اہلِ تقویٰ کے قریب کر دی گئی، دراں حالاں کہ کچھ بھی دور نہ تھی، یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر رجوع رہنے والے، بڑی نگہداشت کرنے والے کے لیے، جو رحمٰن سے ڈرا غیب میں، اور آیا رجوع رہنے والا گرویدہ دل لے کر۔“

معلوم ہوا کہ قلب سلیم وہی ہو سکتا ہے جس کی حیثیت دلِ گرویدہ کی سی ہو، جو خدا کی جانب برابر رجوع رہتا ہو، ماسوا کا پرستار نہ ہو۔

﴿۵﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَیِّنٌ، وَ بَیْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَةٌ فَاِنْ تَرَكَ مَا یَشْتَبِهُ عَلَیْهِ مِنَ الْاِثْمِ كَانَ لِمَا اسْتَبَانَ اَتْرَكَ وَ مَنِ اجْتَرَءَ عَلٰی مَا یَشُكُّ فِیْهِ مِنَ الْاِثْمِ اَوْشَكَ اَنْ یُّوَاقِعَ مَا اسْتَبَانَ، وَالْمَعَاصِیْ حِمَی اللّٰهِ مَنْ یَّرْتَعْ حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِكُ اَنْ یُّوَاقِعَهٗ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ البتہ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں۔ پس جو شخص ان گناہوں سے جو اس پر مشتبہ ہیں بچے گا وہ کھلے گناہوں سے بہ درجۂ اولیٰ بچے گا اور جو شخص مشتبہ گناہوں کے ارتکاب میں جری ہوگا اس کا کھلے گناہوں میں مبتلا ہو جانا

زیادہ متوقع ہے۔ معصیتوں کی حیثیت ممنوعہ علاقے کی ہے اور جو ممنوعہ علاقے کے اردگرد چرتا ہے اس کے اس میں جاپڑنے کا بہت زیادہ امکان رہتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث کے الفاظ سے حدیث نمبر ۴ کا مفہوم بہ خوبی واضح ہوجاتا ہے۔

〈۶〉 وَ عَنْ عَائِشَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: یَا عَائِشَةُ، اِیَّاکِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰہِ طَالِبًا۔ (ابن ماجہ، دارمی، بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! حقیر اور معمولی گناہوں کے سلسلے میں بھی خبردار رہنا کیوں کہ خدا کی طرف سے ان کی بھی باز پرس ہونے والی ہے۔''

تشریح: صغیرہ گناہوں کو بالعموم لوگ ہلکا سمجھتے ہیں اور ان سے بچنے کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ وہ بھی گناہ ہیں اور ان کے ارتکاب سے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو آخرت کی باز پرس کا خیال دامن گیر ہوتا ہے وہ کبیرہ گناہوں سے ہی نہیں صغیرہ گناہوں سے بھی بچنے کی پوری فکر اور کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف اور اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے ان کی نگاہ میں چھوٹے گناہ بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتے۔ جو گناہ بھی خدا کی ناراضی کا باعث ہو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس سے احتراز ضروری ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے تھے۔ اِنَّكُمْ لَتَعْمَلُوْنَ اَعْمَالاً هِیَ اَدَقُّ فِیْ اَعْیُنِكُمْ مِنَ الشَّعْرِ كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ یَعْنِی الْمُهْلِكَاتِ۔ (بخاری) ''تم لوگ بہت سے ایسے اعمال کرتے ہو جو تمھاری نگاہ میں بال سے بھی زیادہ باریک (یعنی بہت ہی ہلکے اور خفیف) ہوتے ہیں۔ رسول اللہ (ﷺ) کے زمانے میں ہم ان کو مہلکات میں شمار کرتے تھے۔'' مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو بھی حد درجہ مہلک سمجھتے تھے اور ان سے بچنے کا پورا اہتمام کرتے تھے۔

جس طرح چھوٹے گناہوں کو ہلکا سمجھنا صحیح نہیں، اس لیے کہ داغ چھوٹا ہو یا بڑا وہ داغ ہی ہے اس سے اپنے دامن کو پاک رکھ کر ہی ہم اچھے اور ستھرے ذوق کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح چھوٹی نیکیوں کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے، ان سے گریز صحیح نہ ہوگا۔ بعض نیک

کام بہ ظاہر چھوٹے ہوتے ہیں لیکن وہ اخلاق و کردار کی عظمت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں، اس لیے ان کی طرف سے بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔ ایک بہتے ہوئے تنکے کی بھی اہمیت ہے۔ اس کے ذریعہ سے ہمیں دریا کے بہاؤ کا رُخ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور (ﷺ) کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

لاَ تُحَقِّرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَ اِنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ اَنْ تَلْقَ اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِقٍ وَ اَنْ تُفْرِغَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ اِنَـآءِ اَخِيْكَ۔ (ترمذی)

”تم نیکی اور بھلائی سے تعلق رکھنے والی کسی چیز کو بھی حقیر نہ سمجھو، اور یہ بھی نیکی ہے کہ تم اپنے بھائی سے شگفتہ روئی کے ساتھ ملو اور یہ کہ تم اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈال دو۔“

عفت

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَرْبَعٌ اِذَا كُنَّ فِيْكَ فَلاَ عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ الدُّنْيَا حِفْظُ اَمَانَةٍ وَّ صِدْقُ حَدِيْثٍ وَّ حُسْنُ خَلِيْقَةٍ وَّ عِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ۔ (احمد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب چار باتیں تمھارے اندر ہوں تو دنیا کے تم سے جانے رہنے میں تمھارے لیے کوئی نقصان نہیں: امانت کی حفاظت، گفتگو میں سچائی، حسن اخلاق اور کھانے میں احتیاط اور پرہیز گاری۔“

تشریح: امانت معنی کے لحاظ سے بہت ہی وسیع اصطلاح ہے۔ خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنا، عہد و پیمان کا پاس و لحاظ رکھنا، کسی کا راز معلوم ہو تو راز داری کا پورا خیال رکھنا۔ یہ سب چیزیں امانت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگر کسی کو دولت کی فراوانی، عیش و عشرت اور جاہ و منصب حاصل نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں بہ شرطے کہ اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ اس کو حاصل ہو۔ اگر مطلوب شے حاصل ہے تو پھر غم اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ زندگی میں اصل مطلوب شے کوئی خارجی شے نہیں ہے بل کہ آدمی خود ہے۔ اگر خود کو تباہ ہونے سے اس نے بچا لیا ہے تو دنیا

کے چھن جانے پر اسے کوئی غم اور افسوس نہ ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر اسے وہ سب کچھ مل جائے دنیا پرست انسان جس کی طلب رکھتا ہے لیکن خود تباہ و برباد ہو جائے تو یہ کوئی نفع کا سودا نہ ہوا۔ حضرت مسیحؑ کا قول ہے:

''آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کرے اور اپنی جان کا نقصان اٹھائے تو اسے کیا فائدہ ہوگا۔'' (مرقس ۸:۳۶)

انسان درحقیقت ایک اخلاقی وجود ہے۔ اگر اخلاقی اعتبار سے وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے تو اس کے لیے اس سے بڑھ کر کسی اور تباہی کا ہم تصوّر نہیں کر سکتے۔ ایسا شخص مردہ لاش ہے۔ اس کے دنیوی ساز و سامان کی وجہ سے اس پر رشک کرنا..... بے خبری کے سوا اور کچھ نہیں، اخلاقی اعتبار سے آدمی زندہ ہے یا مرا ہوا، اس کا اندازہ اس کی روز مرّہ کی زندگی کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ نے چار چیزوں کا ذکر کیا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اگر اپنی ذمّہ داریوں کا پورا احساس ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ زندہ ہے، اس کی اخلاقی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ اگر آدمی کو اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کا علم و احساس نہیں ہے تو اس سے کسی امانت کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔ امانت کا محافظ وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے حقوق پہچانتا اور ان کو ادا کرنے کی فکر رکھتا ہو۔ جس کی زبان ہمیشہ سچائی کے لیے کھلتی ہو، جو حسن اخلاق کا پیکر ہو۔ کھانے پینے کے معاملے میں جس میں بالعموم لوگ کوتاہی برتتے ہیں وہ حد درجہ محتاط ہو۔ حرام اور مشتبہ چیز کے قریب بھی نہ پھٹکتا ہو۔ کھانے میں حد ضرورت کا بھی اسے پورا لحاظ ہو، ایسا نہیں کہ وہ بندۂ شکم بن کر رہ گیا ہو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس مومن بندے سے محبت رکھتا ہے جو نادار ہونے کے باوجود باعفت ہو اگرچہ وہ عیال دار بھی کیوں نہ ہو۔''

تشریح: باعفت ہونے سے مراد یہ ہے کہ آدمی ناجائز طریقے سے مالی منفعت حاصل کرنے

کی کوشش نہ کرے اور کسی کے سامنے اپنی ضروریات ظاہر کرنے سے بھی پرہیز کرے۔ اگر کوئی مومن شخص نادار ہے اور اس کے بال بچے بھی ہیں پھر بھی اسے اپنی عفت اور خودداری کا پاس و لحاظ ہے تو یقیناً وہ خدا کا محبوب بندہ ہے۔ خدا اسے خاص محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اگر اس کو اس کا احساس ہو تو فقر و فاقہ کی تکالیف بھی اس کے لیے سامانِ راحت ولذّت محسوس ہوں گی۔

اسلام ایک طرف عفت اور خودداری پر زور دیتا ہے، دوسری طرف اس کی یہ تعلیم ہے کہ سماج کے ایسے لوگوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑا جائے بل کہ حتی الوسع احسن طریقے سے ان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن میں ہے: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۷۴) ”جو لوگ اپنے مال رات اور دن چھپے اور کھلے خرچ کریں ان کا اجر ان کے اپنے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم میں مبتلا ہوں گے۔“ رات اور دن کے مقابلہ میں چھپے اور کھلے کے ذکر میں جو ادبی خوبی پائی جاتی ہے وہ صاحبِ ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چھپے اور پوشیدہ طور پر خرچ کریں کہ ضرورت مند کی ضروریات پوری ہو جائیں اور کسی کو علم بھی نہ ہو۔ اس طرح حاجت مند کی عفت مجروح نہ ہوگی اور اس کی خودداری محفوظ رہے گی۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ دَعَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ هُوَ یَشْتَرِطُ عَلَیَّ اَنْ لَّا تَسْأَلَ النَّاسَ شَیْئًا، قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: وَلَا سَوْطَکَ اِنْ سَقَطَ مِنْکَ حَتّٰی تَنْزِلَ اِلَیْهِ فَتَأْخُذَهٗ. (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسولِ خدا ﷺ نے بلایا اور آپؐ نے مجھ پر یہ شرط لازم کی کہ کسی انسان سے کچھ بھی سوال نہ کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے قبول ہے۔ فرمایا: ”اور اپنا کوڑا بھی نہ مانگنا اگر وہ تم سے چھوٹ کر گر پڑے یہاں تک کہ خود ہی (سواری سے) اتر کر اٹھا لینا۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سوال خواہ کسی طرح کا ہو اس سے پرہیز کرنا ہی اولیٰ ہے۔ مانگنے اور سوال کرنے کی نہیں، نہ مانگنے اور سوال نہ کرنے کی خو اللہ کو پسند ہے۔ گھوڑے پر سے اتر کر اپنا گرا ہوا کوڑا لے لینا تمھارے لیے اس سے زیادہ آسان ہو کہ تم اس کے لیے کسی سے سوال کر کے اس کے احسان مند ہو۔

حزم واحتیاط

〈۱〉 عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: تُوُفِّیَ رَجُلٌ مِّنَ الصَّحَابَةِؓ فَقَالَ رَجُلٌ: اَبْشِرْ بِالْجَنَّةِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَوَلاَ تَدْرِیْ فَلَعَلَّهٗ تَکَلَّمَ فِیْمَا لاَ یَعْنِیْهِ اَوْ بَخِلَ بِمَا لاَ یَنْقُصُهٗ۔

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ میں سے ایک شخص نے وفات پائی تو ایک شخص نے کہا: تجھے جنت کی خوش خبری ہو۔ اس پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تو یہ بات کہتا ہے، شاید حقیقتِ حال سے تو واقف نہیں۔ ممکن ہے اس نے لایعنی گفتگو کی ہو، یا ایسی چیز میں بخل سے کام لیا ہو جس میں اس کے لیے نقصان اور کسی کمی کا اندیشہ نہ تھا۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی وفات پانے والے شخص کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ اس بات کا اظہار کرنا کہ وہ جنتی ہے احتیاط کے خلاف اور ایک طرح سے غیب دانی کا دعویٰ ہے، اس سے احتراز ضروری ہے۔ حقیقتِ حال کا علم خدا کے سوا کس کو ہو سکتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم، جنت کے داخلہ میں بعض ان اعمال کی وجہ سے بھی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے جن کو بالعموم لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مثال میں آپؐ نے دو باتوں کا ذکر فرمایا۔ آدمی میں اگر دوسری کوئی برائی نہ سہی لیکن اگر اس نے لایعنی گفتگو یعنی اپنی بات چیت میں ان باتوں سے پرہیز نہیں کیا جو نہ اس کے لیے ضروری تھیں اور نہ ان باتوں میں اس کا کوئی فائدہ ہی تھا۔۔ تو یہ چیز بھی اس کی شخصیت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے جس کی وجہ سے اس کے جنت کے داخلہ میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے، اسی طرح یہ چیز بھی جنت کے داخلہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے کہ کوئی بخل سے کام لیتا رہا ہو، حالاں کہ مومن کے لیے بخل سے کام لینے کی کوئی وجہِ جواز نہیں۔ مومن پر جو صدقات واجب ہیں ان کا ادا کرنا اس کے لیے باعثِ برکت ہے۔ نیک کاموں میں اپنا مال خرچ کر کے آدمی اپنے کو کسی نقصان کے حوالے ہرگز نہیں کرتا۔ قرآن میں ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ج وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ o (سبا:۳۹) ”اور تم جو کچھ خرچ کرو اس کی جگہ وہ تم کو اور دے گا۔ وہ بہترین رازق ہے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشادِ گرامی ہے: وَمَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ۔ (مسلم) ”اور صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔“

اب اگر کسی نے زندگی میں بخل کا مظاہرہ کیا تو یہ چیز بھی جنت کے داخلہ میں ایک رکاوٹ بن سکتی ہے۔ بعض لوگ ایسی چیزوں میں بھی بخیل ثابت ہوتے ہیں جن میں اگر وہ کشادہ دلی دکھائیں تو عام نگاہوں میں بھی اس میں ان کا کوئی نقصان نہیں مثلاً کسی ضرورت مند کو پانی یا نمک وغیرہ دے دینا یا کسی کو سلام کرنا وغیرہ۔ خدا کے یہاں اس بخل پر گرفت ہوسکتی ہے اور اس کی وجہ سے جنت کے داخلہ میں تاخیر یا رکاوٹ کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرَةَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ رَجُلاً اَثْنٰی عَلٰی رَجُلٍ عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ لَهٗ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِکَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ اِذَا مَدَحَ اَحَدُکُمْ صَاحِبَهٗ لاَ مُحَالَةَ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ اَحْسِبُهٗ کَمَا یُرِیْدُ اَنْ یَّقُوْلَ وَلاَ اُزَکِّیْهِ عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے سامنے ایک شخص کی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا: ”تو نے اس کی گردن کاٹی۔“ یہ آپؐ نے تین بار فرمایا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی بہ ضرورت اپنے ساتھی کی تعریف کرے تو اس سلسلے میں جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہو اس کے بارے میں یوں کہے کہ میں اسے ایسا سمجھتا ہوں لیکن اللہ کے نزدیک بھی وہ اچھا اور عمدہ شخص ہے، میں یہ نہیں کہتا۔“

تشریح: اس حدیث سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی بات چیت میں آدمی کو کس درجہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم جس کی تعریف کرتے ہیں ہماری تعریف اور مدح اس کے لیے مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کو آپؐ نے گردن کاٹنے سے تعبیر فرمایا۔ مدح اور تعریف سے اس کا قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس سے آدمی کے اندر خود پسندی اور غرور نہ پیدا ہوجائے۔ یہ چیز اس کے لیے کسی ہلاکت سے کم نہیں ہے۔ کسی کی تعریف کرنی ناگزیر ہو تو اس کے ساتھ اس کا بھی اظہار کردے کہ حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔ کون کیسا ہے اور کیسا نہیں، یہ وہی جان سکتا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ شَفَعَ لِاَخِیْهِ شَفَاعَةً فَاَهْدٰی لَهٗ هَدِیَّةً عَلَیْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰی بَابًا عَظِیْمًا مِّنْ اَبْوَابِ الرِّبَا۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”جو کوئی اپنے بھائی کی سفارش کرے پھر وہ اس کے بدلے میں اس کے یہاں ہدیہ بھیجے اور وہ اسے قبول کرلے تو یقیناً سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں وہ داخل ہوگیا۔“

تشریح: سود اپنی روح کے لحاظ سے یہی تو ہے کہ ہم ایسے طریقے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں جس سے انسانی ہم دردی اور خیر خواہی کا جذبہ مجروح ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کسی کی مجبوری کو ہم استحصال کا ذریعہ بنائیں۔ یہ روش صدقہ، جذبۂ انفاق و فیاضی کے سراسر منافی ہے۔ سفارش کے بدلہ میں ہدیہ قبول کرکے فائدہ اٹھاتے ہیں تو درحقیقت ہم اپنے اس عمل سے اس ذہن کی پرورش کرتے اور اسے تقویت پہنچاتے ہیں جو ذہن ایک سود خوار شخص کا ہوتا ہے۔ حضورؐ کے الفاظ میں ہم سود کے دروازوں میں سے ایک بڑا دروازہ کھولنے کے مرتکب ہورہے ہیں اور اس طرح اُس دروازے کو بند کررہے ہیں جو ایثار و قربانی اور خدمتِ خلق کا دروازہ ہے، حالاں کہ مومن کا فرض ہے کہ وہ ایسے تمام دروازوں کو بند کرنے کی کوشش کرے جس سے سوسائٹی میں کسی خرابی کے در آنے کا اندیشہ ہوتا ہو۔

(۴) وَ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَضٰی بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَقَالَ الْمَقْضِیُّ عَلَيْهِ لَمَّا اَدْبَرَ حَسْبِیَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ يَلُوْمُ عَلَی الْعَجْزِ وَ لٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَاِذَا غَلَبَكَ اَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: ”حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملے کا فیصلہ کیا تو جو شخص مقدمہ ہار گیا جب وہ پیٹھ پھیر کر لوٹا تو اس نے کہا کہ مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اس پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ عجز اور بے وقوفی پر ملامت کرتا ہے بل کہ تمھارے لیے ہوش مندی اور ہوشیاری لازم ہے۔ پھر اگر (کسی وجہ سے) تم ہار جاؤ تو کہو کہ مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔“

تشریح: معلوم ہوا کہ کسی بھی معاملے کے لیے ہوشیاری اور تدبیر ضروری ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ تھک کر بیٹھ رہے، تساہل سے کام لے اور عقل مندی اور ہوشیاری کے ساتھ اس کے لیے

کوشش نہ کرے پھر جب مصیبت سر پر آپڑے تو اپنے آپ کو بے جا تسلی دینے لگے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ زَیْنَبَ بِنْتِ اَبِیْ سَلَمَۃَ ؓ قَالَتْ سُمِّیْتُ بَرَّۃَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاَھْلِ الْبِرِّ مِنْکُمْ سَمُّوْھَا زَیْنَبَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت زینب بنت ابی سلمہ ؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرا نام برّہ (نیکوکار) رکھا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی تعریف وتوصیف نہ کرو۔ تم میں جو نیکوکار ہیں انھیں خدا بہ خوبی جانتا ہے۔ تم اس کا نام زینب رکھ دو۔''

تشریح: خود سے اپنی تعریف کرنی احتیاط کے خلاف ہے۔ صحیح علم خدا ہی کو ہے کہ کون شخص کیسا ہے۔ نبی اکرم (ﷺ) نے ایسے نام بھی بدل دیے ہیں جو انسانی وقار وعزت کے خلاف تھے، چنانچہ مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی ایک بیٹی کا نام عاصیہ (گنہ گار) تھا۔ آپ نے اس کا نام بدل کر جمیلہ رکھا۔ برے اور مشرکانہ نام آپؐ ہرگز باقی نہیں رہنے دیتے تھے۔ زینب ایک خوش بودار اور خوش منظر درخت کو کہتے ہیں۔

تقویٰ

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ لَہٗ اِنَّکَ لَسْتَ بِخَیْرٍ مِّنْ اَحْمَرَ وَلَا اَسْوَدَ اِلَّا اَنْ تَفْضُلَہٗ بِتَقْوٰی۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم اپنی ذات سے نہ کسی گورے کے مقابلے میں اچھے ہو اور نہ کسی کالے کے مقابلے میں، البتہ تقویٰ کی وجہ سے تمھیں کسی پر فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ فضیلت کا اصل معیار تقویٰ ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز۔ قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات: ۱۳) ''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔'' دل میں خوفِ خدا ہو اور زندگی کی تشکیل وتعمیر خوفِ خدا کے ذریعہ سے ہوئی ہو، بس یہی چیز آدمی کو مکرم بناتی اور اسے فضیلت عطا کرتی ہے۔ مال ودولت، رنگ ونسل یا زبان ووطن کی بنیاد پر کسی کو افضل سمجھنا ضلالت اور گمراہی

ہے۔ ضلالت نے دنیا میں جو فساد اور بگاڑ برپا کیے ہیں ان سے ہر صاحب نظر واقف ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ اَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ، قَالَ: اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ وَ سُئِلَ عَنْ اَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ۔ قَالَ: تَقْوَى اللّٰهِ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کس چیز کے سبب سے اکثر لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ''منہ اور شرم گاہ کے سبب سے۔'' آپؐ سے یہ بھی دریافت کیا گیا کہ کس چیز کے سبب سے اکثر لوگ جنت میں داخل ہوں گے؟ فرمایا: ''اللہ کا تقویٰ اور حسن خلق کے سبب سے۔''

تشریح: انسان کی زبان اور اس کی گفتگو اس کی غماز ہوتی ہے کہ وہ کس اخلاق و کردار کا حامل اور کس درجہ کا آدمی ہے۔ آدمی اگر پست ذہن کا ہے تو یہ پستی اس کی گفتگو سے ظاہر ہو کر رہے گی۔ اس کے برخلاف آدمی اگر بلند ہے تو لازماً اس کی زبان بھی اس کی بلندی کا پتہ دے گی۔

انسان کے اندر جنسی جذبہ بھی رکھا گیا ہے۔ انسان کی شخصیت مجروح نہ ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے جنسی جذبہ کو بے راہ روی کا شکار نہ ہونے دے۔

زبان اور جنسی جذبہ کو ہم انسان کی دو کم زوریوں کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان پر قابو پانا ضروری ہے۔ لیکن ان پر سیدھے قابو پانا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان صحیح ذوق و فکر کا حامل ہو اور اس کے پیش نظر زندگی کا کوئی اعلیٰ و ارفع مقصد ہو۔ اس صورت میں ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ وقتی جذبات و ہیجانات کی رَو میں بہنے سے باز رہ سکتا ہے۔

خواہشِ نفس اور زبان پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے یہی نہیں کہ آدمی اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے اور اس کی آخرت خراب ہو جاتی ہے بل کہ دنیا میں بھی انسانی معاشرہ کو انتشار، ظلم و تشدّد، اور گونا گوں مصائب سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اور امن و سکون انسانی معاشرہ سے بالکل ہی رخصت ہو جاتا ہے۔

تقویٰ اور حسن خلق میں گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ حسنِ خلق زندگی کا اصل سرمایہ اور زینتِ حیات ہے۔ تقویٰ یا خدا ترسی اور احساس ذمہ داری وہ قوت ہے جس سے آدمی کے اخلاق و کردار کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ اور حسن اخلاق دو ایسے بنیادی وصف ہیں جن سے خیر اور

بھلائی کے دروازے کھلتے اور نیکیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ اور حسنِ خلق کے ذریعہ سے وہ ساری خوبیاں آدمی کے اندر جمع ہو جاتی ہیں جو زندگی میں مطلوب ہیں۔ ایسے شخص کو خدا لازماً اس جنت میں داخل فرمائے گا جس کا اس نے اپنے نیک بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ سَمُرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْحَسَبُ الْمَالُ وَالْكَرَمُ التَّقْوٰی۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حسب ونسب کی حیثیت مال کی ہے اور بزرگی وشرافت تقویٰ ہے۔''

تشریح: محض مال ودولت کی وجہ سے کوئی معزز نہیں ہوسکتا۔ جو چیز کسی آدمی کو عزت بخشتی ہے وہ تقویٰ کی صفت ہے۔ اگر کسی کے اندر تقویٰ نہیں ہے تو محض حسب ونسب کے ذریعہ سے وہ شرافت کے مقام کو حاصل نہیں کرسکتا۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اُرِيْدُ اَنْ اُسَافِرَ فَاَوْصِنِیْ قَالَ عَلَيْكَ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَالتَّكْبِيْرِ عَلٰی كُلِّ شَرَفٍ، فَلَمَّا وَلَّی الرَّجُلُ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اَطْوِلَهُ الْبُعْدَ وَ هَوِّنْ عَلَيْهِ السَّفَرَ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسولِ خدا ﷺ سے عرض کیا کہ میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں، آپؐ مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اپنے اوپر اللہ کے تقویٰ کو لازم کرلو اور ہر بلند مقام پر تکبیر کو۔'' پھر جب وہ شخص واپس چلا تو آپؐ نے فرمایا: ''خدایا! درازیِ سفر کو اس کے لیے لپیٹ دے اور سفر کو اس کے لیے آسان فرمایا۔''

تشریح: تقویٰ درحقیقت ہوش مندی اور خدا ترسی کا نام ہے۔ خدا کا خوف ولحاظ تشکیلِ زندگی کی حقیقی بنیاد ہے۔ تعمیر زندگی کے لیے یہ بنیاد فراہم نہ ہوسکے تو زندگی بے مایہ، بے وقعت اور بے آبرو ہو کر رہ جائے گی۔ اور صرف یہی نہیں کہ زندگی وقار وعظمت سے محروم ہوگی بل کہ زندگی میں کچھ ایسے بگاڑ پیدا ہو جائیں گے جن کی قباحتوں کو ہر شخص محسوس کرے گا۔ بددیانتی، ظلم وستم، بے رحمی اور ناانصافی وغیرہ حقیقت میں ناخدا ترسی کے کڑوے کسیلے پھل ہیں جن کی بدمزگی اور کڑواہٹ کو سبھی لوگ محسوس کرتے ہیں۔

زندگی کو سنوارنے اور اسے بامعنی بنانے والی شے خدا کا تقویٰ ہے۔ ایک زرخیز زمین

بھی اس وقت تک بے کار محض ہے جب تک اس میں کاشت نہ کی جائے۔ زمین میں بیج پڑنے کے بعد ہی اس کی صلاحیت بہ روئے کار آتی ہے اور اس کی زرخیزی اور صلاحیت کو ہم ایک لہلہاتی، سرسبز وشاداب فصل کی شکل میں دیکھنے لگتے ہیں۔ خدا کا تقویٰ وہ بیج ہے جو زندگی کی فصل کے لیے درکار ہے۔ اس بیج کے مہیا نہ ہونے کی صورت میں جھاڑ جھنکاڑ کے سوا ہم کسی اچھی فصل کی امید نہیں رکھ سکتے۔

بلند مقام پر تکبیر یعنی اللہ اکبر (خدا سب سے بڑا ہے) کہو۔ بلندی اور اونچائی پر تمھیں خدا کی بڑائی کا خیال ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کے سفر میں مطلوب یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے مختلف انداز میں ہمیں خدا ہی کی یاد دلائے۔ کتنا دل کش ہے زندگی کا یہ سفر! اور کتنی وجد آفریں ہیں آں حضرت ﷺ کی تعلیمات!!

﴿۵﴾ وَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍؓ قَالَ: کَانَ اٰخِرُ کَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: اَلصَّلٰوةُ اَلصَّلٰوةُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ فِیْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی زندگی کے آخری کلمات یہ تھے: ''نماز نماز اور جو تمھارے دست نگر ہیں ان کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہنا۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ نبی ﷺ کو تا دمِ آخر اپنی داعیانہ و مصلحانہ ذمہ داریوں کا کس درجہ احساس تھا۔ دنیا سے رخصت ہوئے بھی آپؐ اپنے فرض کے ادا کرنے کی طرف سے غافل نہ ہوئے اور تاکید فرمائی کہ تم نہ خدا کے حق سے غافل ہونا اور نہ بندوں کے حقوق کی طرف سے غفلت برتنا۔ خدا کے بندوں میں مملوک اور لونڈی اور غلام زیر دست ہونے کی وجہ سے ہماری توجہ اور حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں اسی لیے ان کا ذکر فرمایا اور اس بات کی توجہ دلائی کہ جو تمھارے دست نگر ہوں تم ان کی جانب سے ہرگز بے اعتنائی نہ برتنا۔ اگر ان کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی اور ظلم ہوا تو اس پر خدا کی سخت گرفت ہوگی۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت کو ایک بلی کے سبب سے عذاب دیا گیا جس کو اس نے باندھ رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ بھوکی مرگئی۔ وہ نہ تو اسے کھانے کو دیتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی کہ وہ خود کچھ شکار کرکے کھاسکتی۔ جس خدا نے بلی کی مظلومیت اور اس کی تکلیف کو نظر انداز نہیں کیا اور اس عورت کو اپنے کیے کا مزہ چکھنا پڑا، وہ مظلوم انسانوں کی آہ کو کیسے نظر انداز کرسکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ زیر دستوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ اگر کسی انسان کی فطرت مسخ ہوگئی ہے اور اسے

مجبوروں اور بے کسوں کی تکلیف کا کچھ احساس نہیں ہوتا تو کم سے کم اسے اپنی اس تکلیف کا تو احساس کرنا چاہیے۔ جب خدا اس کے ظلم وستم کے بدلہ میں اسے سخت سزا دے گا اور اس کو اپنی رحمتوں سے محروم کردے گا۔

آپؐ نے اپنی آخری وصیت میں سب سے زیادہ نماز کی تاکید فرمائی۔ نماز کی اہمیت کے پیشِ نظر اس میں تکرار سے کام لیا۔ نماز خدا کا حق بھی ہے جو بندے پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے لیے نماز ایک بڑی نعمت اور اس کے لیے باعثِ شرف ومجد بھی ہے۔ نماز اتنی خصوصیات کی حامل عبادت ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ قرآن اور احادیث کی روشنی میں جتنا زیادہ آپ غور کریں گے نماز کی قدر وقیمت بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ ہم یہاں اس کے ایک پہلو کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ نماز آدمی میں یہ خاص وصف پیدا کرنا چاہتی ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر آن خدا کو اپنے سامنے محسوس کرنے لگ جائے۔ خدا کو اپنے سے قریب پانے اور محسوس کرنے سے بڑھ کر زندگی کی دوسری کوئی یافت نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے بڑھ کر انسانی زندگی کو باوقار اور بیش قیمت بنانے والی کوئی چیز ہوسکتی ہے۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جس کے سامنے دنیا کی تمام دولتیں ہیچ ہیں۔ یہ ایک ایسی لذیذ ترشے ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ساری ہی لذتیں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ اس نعمتِ عظمیٰ کو پانے کے بعد صرف یہی نہیں کہ انسان کے ذہن ودماغ اور قلب سنور جاتے ہیں بلکہ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نعمت کے بغیر تو زندگی ایک سنسان کھنڈر ہے جس میں وحشت کے سوا کچھ نہ ہو۔

نماز کا یہ پہلو کہ وہ ہمیں اس مقام پر دیکھنا چاہتی ہے کہ اپنے روبرو خدا کو پائیں بہت نمایاں ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند روایتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

ایک حدیث میں اس سے روکا گیا ہے کہ آدمی نماز میں سامنے تھوکے کیوں کہ اس کے سامنے خدا کا رُخ ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب تک نمازی نماز کی حالت میں ہے اور ادھر ادھر نہیں دیکھتا خدا کا رخ اس کے سامنے رہتا ہے اور جب وہ ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتا ہے تو خدا اپنا رخ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔ (لَا یَزَالُ اللّٰہُ تَعَالٰی مُقْبِلاً عَلَی الْعَبْدِ وَ ھُوَ فِیْ صَلٰوتِہٖ مَالَمْ یَلْتَفِتْ فَاِذَا الْتَفَتَ اَعْرَضَ عَنْہُ) اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آیا ہے کہ نماز کی حالت میں بندہ جو تحمید وتمجید اور درخواست کرتا ہے خدا اس کا جواب دیتا ہے۔

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز بندے کی اپنے خدا سے ملاقات ہے۔ ملاقات میں آدمی اس سے قریب ہوتا ہے جس سے وہ ملاقات کر رہا ہوتا ہے۔ ملاقات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف متوجہ اور باہم ہم کلام ہوتے ہیں۔ نماز میں ملاقات کی ساری ہی باتیں پائی جاتی ہیں۔ صرف ایک بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ ملاقات میں آدمی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جس سے وہ ملاقات کرتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ملاقات کے لیے دیکھنا ضروری نہیں ہے۔ ایک نابینا شخص بھی ملاقات کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ نابینا ہے ہم اس کی ملاقات کو غیر معتبر نہیں قرار دیتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مومن خدا کو بصر سے نہ سہی، بصیرت اور دل کی آنکھ سے تو دیکھتا ہی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (الانعام: ۱۰۳) ''نگاہیں اسے نہیں پاسکتیں، لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ لطیف باخبر ہے۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص صفت کا ذکر فرمایا ہے کہ اس کی ذات ان عام مدرکات کی طرح نہیں ہے جو آنکھوں کو دکھائی دیتی ہیں۔ درخت، مکان وغیرہ کو آنکھ دیکھتی ہے لیکن یہ درخت اور مکان آنکھ کو نہیں دیکھتے۔ ادراک کی صلاحیت ان میں نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح خدا کے مقابلے میں آنکھ اس بے جان پتھر کی مانند ہے جس کا کسی چیز کو دیکھ نہ پانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ کوئی چیز سرے سے ہے ہی نہیں۔ خدا ہماری آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ بینائی اصلاً یہاں نہیں وہاں ہے۔ ہماری آنکھ میں تو یہ صلاحیت بھی نہیں ہے کہ وہ ہماری روح کا عکس قبول کر سکے اور ہم روح کو آنکھ سے دیکھ سکیں۔ لیکن ہمارے اندر ایک قوت اور بھی ہے۔ وہ شعور و وِجدان کی قوت ہے۔ اس قوت کے ذریعہ سے آدمی کو اپنی روح کا احساس ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ جسمانی وجود اس کے مقابلہ میں نہایت فرو ہے۔ وجدانی قوت کے ذریعہ سے انسان خدا کے وجود کو بھی باور کر سکتا ہے جس کی ذات وصفات کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔ خود ہماری روح بھی اس کی ایک نشانی ہے۔ ہماری روح جتنا اپنا پتہ دیتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر اپنے رب کی خبر دیتی ہے۔

بندے اور خدا کے درمیان اگر کوئی چیز حائل ہے تو خود بندے کی اپنی یہ کم زوری ہے کہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نماز میں چوں کہ سارے علائق سے الگ ہو کر بندہ خدا کے آگے کھڑا ہوتا ہے اس لیے اب وہ خدا کے سامنے ہے۔ درمیان میں کوئی رکاوٹ یا بُعد نہیں ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ مرنے والا قبر میں خدا سے ملاقات کرتا ہے تو اس کا منشا بھی یہی ہے کہ وہاں سارے علائق دور ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی روک نہیں ہوتی۔

خدا اور بندے کے درمیان اصل رکاوٹ نفسیاتی و اخلاقی امر ہے۔ مکانی دوری تو یہاں پائی ہی نہیں جاتی۔ جتنی بھی رکاوٹیں ہیں وہ از قسم غفلت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ نماز کی حالت میں چھینک، جمائی اور اونگھ آنا اور حیض، قے اور نکسیر شیطان کی طرف سے ہے۔ ایسا اس لیے کہا گیا کہ ان چیزوں سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔ تہجد کی نماز کی خاص خصوصیت اسی لیے ہے کہ اس میں زیادہ یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا و مافیہا سے الگ ہو کر بندہ اپنے خدا کے روبرو کھڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ (بندے سے سب سے زیادہ قریب خدا رات کے آخری حصہ میں ہوتا ہے) قیامِ لیل کے بارے میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے: هُوَ قُرْبَةٌ لَّكُمْ اِلٰی رَبِّكُمْ مُكَفِّرَةٌ لِّلسَّيِّئَاتِ مُنْهَاةٌ عَنِ الْاِثْمِ ''وہ تمھارے رب تک تمھارے لیے قربت ہے اور برائیوں کو مٹانے والا اور گناہوں سے روکنے والا ہے۔''

نماز خدا کی عظمت و محبوبیت کا سکہ قلوب میں بٹھاتی ہے۔ نماز کے ذریعہ سے آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر یہ وصف ہمیشہ باقی اور تازہ رہ سکتا ہے کہ خدا اس سے دور نہیں ہے۔ اس کا ہمیشہ اور ہر آن جس سے سابقہ پیش آتا ہے وہ کوئی اور نہیں، خدا ہی کی ذات ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا یَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ وَّ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُهٗ وَلَا یَخْذُلُهٗ وَلَا یَحْقِرُهٗ اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَ یُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مِرَارٍ بِحَسْبِ امْرِءٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ یَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَ مَالُهٗ وَ عِرْضُهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''باہم ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، باہم ایک دوسرے کی کھود کرید میں نہ پڑو، ایک دوسرے

سے بغض نہ رکھو، دشمنی نہ کرو، کوئی تم میں سے کسی دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے، اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے اور نہ اسے حقیر جانے۔ تقویٰ یہاں ہے، تین بار اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ انسان کے لیے یہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ مسلمان پر ہر مسلمان کی یہ چیزیں حرام ہیں: اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ تقویٰ کا اصل مرکز انسان کا دل ہے۔ دل میں اگر خدا کا خوف اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس پایا جاتا ہے تو اس کا اثر انسان کی پوری زندگی میں نمایاں ہو کر رہے گا۔ زندگی میں اگر کوئی خوش گوار تبدیلی کا خواہش مند ہے تو اسے یہ بات شروع ہی میں جان لینی چاہیے کہ تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے دل کی حالت درست ہو اور دل کی درستی تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں۔ تقویٰ دل کا ادب ہے۔ دل اپنی فطری حالت میں رہ سکے اس کے لیے ضروری ہے کہ دل میں تقویٰ کو جگہ دی جائے۔

اس حدیث میں ایک بنیادی بات یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے، اس لیے دو مسلمان خواہ ان کے درمیان خاندانی رشتہ نہ بھی پایا جاتا ہو لیکن ان کے درمیان دین و ایمان کا جو رشتہ پایا جاتا ہے وہ رنگ و نسل کے رشتے سے کہیں زیادہ گہرا اور پائیدار رشتہ ہے، اس لیے وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ انھیں اپنے بھائی کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ نہ وہ خود اپنے بھائی کے ساتھ کسی ظلم و ستم کے روادار ہوں اور نہ اپنے بھائی کو کسی ظالم کے حوالہ کریں۔ یہ بھی بھائی کی حق تلفی ہے کہ کوئی اپنے بھائی کو حقیر سمجھے۔ اگر کوئی اپنے بھائی کے ساتھ کوئی اور ظلم اور زیادتی تو نہیں کرتا لیکن اسے حقیر سمجھتا ہے تو یہی ایک برائی اس کے دامنِ کردار کو داغدار کرنے کے لیے کافی ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنِّیْ اَعْلَمُ اٰیَةً لَّوْ اَخَذَ النَّاسُ بِهَا لَکَفَتْهُمْ وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاo وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ط

(احمد، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اگر لوگ اسے اختیار کرلیں تو وہی ان کے لیے کافی ہے۔ آیت ہے: وَ مَنْ

يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا‎o وَّ يَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ (اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اس کے لیے وہ نجات کی راہ پیدا کر دے گا اور اسے وہاں سے روزی دے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا)۔"

تشریح: یہ سورۃ الطلاق کی مشہور و معروف آیت ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ تقویٰ کوئی معمولی وصف نہیں ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا کی عظمت اور بزرگی کو تسلیم کرتا اور اپنی مرضی کے مقابلہ میں خدا کی مرضی کو فوقیت دیتا ہے۔ خدا کی رضا و خوش نودی کا حصول ہی اس کی اپنی زندگی کا اصل مقصود ہے۔ ایسی صورت میں خدا اسے بے چارگی کی حالت میں نہیں رہنے دے گا۔ وہ اس کے لیے لازماً پریشانیوں اور کلفتوں سے نجات کی راہ نکالے گا۔ یہ بھی ناقابلِ قیاس ہے کہ ایسا شخص رِزق سے محروم رہ جائے۔ خدا اس کے لیے رزق کا سامان ایسے طریقہ سے کر سکتا ہے کہ اسے پہلے سے اس کا کوئی گمان بھی نہ رہا ہو۔ خدا کو ہر چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اس پر بھروسہ کر کے کوئی شخص کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔

امانت و دیانت

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍ ؓ قَالَ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَّا قَالَ: لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ، وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبے میں ہمیں خطاب فرمایا ہو اور اس میں یہ بات نہ فرمائی ہو کہ "اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہ ہو اور وہ شخص دین سے محروم ہے جو عہد کا پابند نہ ہو۔"

تشریح: ایمان لانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا کہ آدمی نے کچھ حقیقتوں کو تسلیم کر لیا ہے، بلکہ ایمان اپنے کامل مفہوم میں اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آدمی ان تمام ذمّہ داریوں کو ادا کرے جو ایمان لانے کے بعد فطری طور سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ کسی کے ایمان نے اس کو بھروسہ کے لائق بنا دیا ہو۔ اگر وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ابھی ایمان کی قدر و قیمت اور اس کی فطرت کو سمجھا ہی نہیں اور نہ وہ ایمان کی لذتوں سے آشنا ہو سکا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ عہد کی پابندی کا بھی ہے۔ اگر آدمی عہد کا پابند نہیں ہے اور وہ جو عہد و پیمان کرتا ہے اس کا اسے کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا تو وہ بے کردار ہے۔ بے کردار ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا کوئی دین نہیں ہے۔ دین جب تک آدمی کی زندگی میں کردار کی شکل نہ اختیار کر سکے ہم اسے دین کا حامل نہیں کہہ سکتے۔

حقیقت میں ایک مومن اور دین دار شخص وہی ہے جس کو اس کا پورا شعور ہو کہ خدا نے اسے جو ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ اصل میں خدا کی امانت ہیں۔ خدا کا اس پر یہ حق ہوتا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی نیازمندی اور وفا شعاری کا ثبوت دے۔ اس کی زندگی خدا کی عظمت اور اس کی محبوبیت کی مظہر ثابت ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ امانت دار نہیں بلکہ ایک خائن شخص ہے۔ امانت دار شخص خدا کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اس کے بندوں کے ساتھ بھی خیانت نہیں کرسکتا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ خیانت کرتا اور اس کے اعتماد کو مجروح کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ امانت داری کی خوبی سے یکسر محروم ہے۔ ایسے شخص سے یہ توقع رکھنی کہ وہ خدا کا وفادار ہوگا سخت نادانی کی بات ہے۔ جب اس کے اندر امانت داری کی صفت موجود ہی نہیں جس کا ثبوت انسان کے ساتھ اس کی بے وفائی سے مل گیا تو کس بنیاد پر اس سے اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ بندوں کا اگر نہیں تو خدا کا تو وفادار ہوسکتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی سے کوئی عہد و پیمان کر کے اسے توڑ دیتا ہے اور اسے اپنے عہد کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا تو یہ اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے اندر کردار کی وہ طاقت مفقود ہے جو آدمی کو عہد کا پابند بناتی ہے۔ کردار کی قوت سے محروم شخص سے یہ توقع کوئی نادان ہی کرے گا کہ اگرچہ وہ بندوں کے معاملہ میں بدعہد ہے لیکن خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان کا وہ اپنی زندگی میں پاس ولحاظ رکھے گا۔ کردار میں دورنگی ممکن نہیں بلکہ کردار کو کردار کہتے ہی اسی لیے ہیں کہ اس میں تلون اور تخالف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ باکردار شخص ہر جگہ باکردار ثابت ہوگا اور بے کردار ہر جگہ بے کردار ہی دکھائی دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضرت (ﷺ) نے ارشاد فرمایا ہے: ''لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ مَنْ لَّا يَشْكُرُ النَّاسَ'' ''وہ شخص خدا کا بھی شکر گزار نہیں ہوسکتا جو انسانوں کے ساتھ احسان فراموشی کا رویّہ اختیار کرتا ہے۔''

امانت اور عہد کے الفاظ کے مفہوم میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ امین اور عہد کا پابند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی پوری زندگی میں وہ طرزِ عمل اختیار کرے جو خدا اور اس کے

رسول کی ہدایت کے مطابق ہو۔ اسلامی زندگی اپنی روح وحقیقت کے لحاظ سے امانت داری اور پابندیِ عہد و میثاق ہی کا دوسرا نام ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَکَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَکَ۔ (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے تمھارے پاس امانت رکھی ہے اس کی امانت ادا کرو اور جس کسی نے تمھارے ساتھ خیانت کی ہو تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تمھیں ہر ایک حالت میں امانت داری کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کوئی دوسرا شخص خواہ تمھارے ساتھ خیانت ہی کیوں نہ کرے تمھیں اس کے ساتھ خیانت نہیں کرنی ہے، طرزِ عمل لوگوں کے طرزِ عمل کے تابع ہرگز نہ ہو کہ وہ بھلائی کریں تو تم بھی بھلائی کرو اور وہ اگر برے ہو جائیں تو تم بھی برے بن جاؤ۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: وَطِّنُوْا اَنْفُسَکُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَ اِنْ اَسَآءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔ ”اپنے نفس کو اس قاعدہ کا پابند رکھو کہ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو اور اگر وہ بدسلوکی سے پیش آئیں جب بھی تم ظلم کے روادار نہ ہو۔“

ایک اور مشہور حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے نو (۹) باتوں کا حکم دیا ہے۔ ان میں تین باتیں آپؐ نے یہ بیان فرمائیں کہ ”جو میرا حق مارے میں اس کا حق ادا کروں، جو مجھے محروم کرے میں اسے عطا کروں اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کروں۔“

〈۳〉 وَ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ جَاءَتْ هِنْدُ اِلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبَا سُفْیَانَ رَجُلٌ مُّمْسِکٌ فَهَلْ عَلَیَّ مِنْ حَرَجٍ اَنْ اُنْفِقَ عَلٰی عِیَالِهٖ مِنْ مَّالِهٖ بِغَیْرِ اِذْنِهٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا حَرَجَ عَلَیْکَ اِنْ تُنْفِقِیْ عَلَیْهِمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان فرماتی ہیں کہ ہند نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل شخص ہیں تو کیا اس میں میرے لیے کچھ حرج ہے کہ میں بغیر ان کی اجازت کے ان کے مال میں سے ان کے بال بچوں پر

خرچ کروں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس میں تمھارے لیے کچھ حرج نہیں اگر تم دستور کے مطابق ان پر خرچ کرو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ اس طرح سے دستور کے مطابق خرچ کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ اسے چوری یا بددیانتی نہیں کہا جائے گا۔ اس حدیث سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے دین کو دشواری اور تنگی پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسے دور کرنے کے لیے مشروع فرمایا ہے۔

〈۴〉 وَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيْثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ اَمَانَةٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص بات کرے اور پھر ادھر ادھر مڑ کر دیکھے تو وہ امانت ہے۔''

تشریح: اگرچہ اس نے زبان سے یہ نہیں کہا کہ اسے راز رکھنا لیکن ادھر ادھر اس کے مڑ کر دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بات عام لوگوں کے علم میں آئے۔ ایسی صورت میں اس کی بات کی حیثیت امانت کی ہے۔ اس کی اس بات کا ذکر دوسرے لوگوں سے کرنا خیانت ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ خدا کے یہاں اس کی جواب دہی سے بچ نہیں سکتا۔

〈۵〉 وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ اِلَّا ثَلٰثَةَ مَجَالِسَ سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْ فَرْجٍ حَرَامٍ اَوْ اِقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''نشستوں کے لیے امانت داری ضروری ہے، البتہ تین مجلسیں اس سے مستثنیٰ ہیں: وہ مجلس جس کا تعلق کسی کے خونِ ناحق بہانے کی سازش سے ہو، یا وہ جس کا تعلق کسی کی عصمت لوٹنے سے ہو یا وہ جس کا تعلق بغیر کسی حق کے کسی کا مال چھیننے سے ہو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ کسی مجلس میں جو مشورہ یا فیصلہ راز داری کا کیا جائے اس کی حیثیت ایک امانت کی ہے۔ اہلِ مجلس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اسے راز رکھیں۔ لیکن اگر کسی مجلس میں ظلم اور زیادتی مثلاً کسی کی آبروریزی یا قتلِ ناحق کی سازش ہو تو پھر دیانت داری اور امانت داری اس میں ہے کہ اس منصوبہ کو ناکام بنانے کی کوشش کی جائے اور اس ناپاک منصوبہ سے ان لوگوں کو

باخبر کردیا جائے جو اسے ناکام بنانے میں مؤثر اقدام کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ ایسا کرنا ہرگز خیانت نہیں ہے۔

〈۶〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ۔

(ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس سے مشورہ کیا جائے وہ اس میں امین ہے۔“

تشریح: یعنی جس سے مشورہ کیا جائے اسے اس کا احساس ہونا چاہیے کہ اسے بھروسے کے لائق سمجھ کر کوئی اس سے مشورہ کر رہا ہے اس لیے وہ مشورہ بھی صحیح دے اور اس کی بات کو بھی راز میں رکھے، ادھر ادھر اسے لوگوں سے بیان کرتا نہ پھرے۔

〈۷〉 وَ عَنْ حُذَیْفَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم حَدِیْثَیْنِ رَاَیْتُ اَحَدَهُمَا وَ اَنَا اَنْتَظِرُ الْاٰخَرَ، حَدَّثَنَا اَنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِیْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ، ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ۔ وَ حَدَّثَنَا عَنْ رَّفْعِهَا قَالَ: یَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْاَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَیَظَلُّ اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْوَکْتِ ثُمَّ یَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ فَیَبْقٰی اَثَرُهَا مِثْلَ الْمَجْلِ کَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهٗ عَلٰی رِجْلِکَ فَنَفِطَ فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا وَّ لَیْسَ فِیْهِ شَیْءٌ فَیُصْبِحُ النَّاسُ یَتَبَایَعُوْنَ فَلَا یَکَادُ اَحَدٌ یُّؤَدِّی الْاَمَانَةَ فَیُقَالُ اِنَّ بَنِیْ فُلَانٍ رَّجُلًا اَمِیْنًا، وَ یُقَالُ لِلرَّجُلِ مَا اَعْقَلَهٗ وَمَا اَظْرَفَهٗ وَمَا اَجْلَدَهٗ وَمَا فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ خَرْدَلٍ مِّنْ اِیْمَانٍ۔ وَ لَقَدْ اَتٰی عَلَیَّ زَمَانٌ وَّمَا اُبَالِیْ اَیَّکُمْ بَایَعْتُ، لَئِنْ کَانَ مُسْلِمًا رَّدَّهُ الْاِسْلَامُ وَ اِنْ کَانَ نَصْرَانِیًّا رَّدَّهٗ عَلَیَّ سَاعِیْهٗ فَاَمَّا الْیَوْمُ فَمَا کُنْتُ اُبَایِعُ اِلَّا فُلَانًا وَّ فُلَانًا۔ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حدیثیں بیان فرمائیں۔ ان میں سے ایک کو میں نے دیکھ لیا اور دوسری کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپؐ نے ہم سے فرمایا: ”امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں نازل ہوئی۔ پھر انھوں نے قرآن کو جانا، پھر سنت کو جانا۔“ اور آپؐ نے ہم سے اس کے اٹھ جانے کا حال بیان فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد

فرمایا: ''آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے قبض کرلی جائے گی۔ پس اس کا دھندلا سا اثر رہ جائے گا۔ وہ پھر سوئے گا تو باقی امانت بھی نکال لی جائے گی اور ایک آبلہ جیسا نشان رہ جائے گا، جیسے تم آگ کی کوئی چنگاری اپنے پاؤں پر ڈال دو اور اس سے آبلہ پڑ جائے اور تم بہ ظاہر اسے ابھرا ہوا دیکھو حالاں کہ اس میں کوئی چیز نہ ہوگی۔ حالت یہ ہوگی کہ لوگ آپس میں خرید و فروخت کریں گے لیکن کوئی ایک بھی امانت کو ادا کرتا دکھائی نہ دے گا حتیٰ کہ کہا جائے گا کہ فلاں گھرانے میں ایک امانت دار شخص ہے۔ اور کسی کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ کس قدر عقل مند ہے اور کس قدر ہوشیار و مہذب اور کس قدر شجاع ہے! حالاں کہ اس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔'' اور ہم پر ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے کہ کسی کے بھی ہاتھ خرید و فروخت کرنے میں کچھ پروا نہ ہوتی تھی۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اسلام اور اگر عیسائی ہوتا تو اس کا والی اور ذمہ دار اسے مجھ پر پلٹا دیتا۔ مگر آج میں صرف فلاں اور فلاں لوگوں سے ہی خرید و فروخت کرتا ہوں۔''

تشریح: امانت لوگوں کے عمق قلب میں نازل ہوئی۔ امانت دل کی فطرت ہے۔ دل کا اصل سرمایہ یہی ہے جسے اس حدیث میں امانت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اسی سے دل کی قدر و قیمت ہے۔ قرآن کریم میں بھی ارشاد ہوا ہے: اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَهَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَ حَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ (الاحزاب:۷۲) ''ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا'' یعنی اس امانت کے متحمل آسمانوں، زمین اور پہاڑوں میں سے کوئی بھی نہ ہو سکا۔ اس امانت کا حامل انسان ہوا۔ اسی کو یہ صلاحیت بخشی گئی ہے کہ وہ اس امانت کو اٹھا سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص صلاحیت کے باوجود سرکشی کی بنا پر اس صلاحیت سے کام نہ لے اور خائن ثابت ہو۔

حدیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ضَعُفَتۡ عَنۡ اَنۡ تَسَعَنِیۡ وَ وَسِعَنِیۡ قَلۡبُ الۡمُؤۡمِنِ (احمد) ''آسمان اور زمین میری سمائی سے عاجز رہے۔ میری سمائی قلبِ مؤمن میں ہوتی ہے۔'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن کا قلب خدا کا احاطہ کر سکتا ہے، بلکہ اس سے مراد تحمل ہے یعنی زمین و آسمان جن اسرار کے حامل نہیں ہو سکتے ان کا حامل قلبِ مومن ہے۔ مؤمن کے دل کو باعتبار حال و صفات خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس

قرب کی وجہ سے وہ ان تمام اوصاف و کیفیات سے معمور ہوجاتا ہے جن کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ علم و ادراک، تقویٰ وخشیت، محبت و تذلّل اور انابت وغیرہ تمام ہی اوصاف انسان کے اندر پیدا ہوجاتے ہیں۔ انسان اس نور کا حامل ہوجاتا ہے جو اسے اعتماد اور بھروسے کے قابل بنادیتا ہے۔ پھر وہ نہ خدا کے ساتھ بے وفائی کرسکتا ہے اور نہ بندگانِ خدا کو کسی قسم کا دھوکہ دے سکتا ہے۔ قرآن میں ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ط (الانعام: ۱۲۲) ''کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور اس کے لیے روشنی کردی جس کو لیے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور ان سے ہرگز نکلنے والا نہ ہو؟''

ظاہر ہے ایسے شخص سے اس کا اندیشہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی معاملہ میں خائن ثابت ہو۔ وہ کسی سے کوئی عہد کرے گا تو اسے پورا کرے گا۔ اور اگر کسی شخص سے وہ کوئی لین دین کا معاملہ کرے گا تو اس میں سچا اور کھرا ثابت ہوگا، اس سے بددیانتی یا کسی قسم کی خیانت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

کتاب و سنت نے بھی اس امانت اور اس کے تقاضوں سے انسانوں کو آگاہ و باخبر کیا۔ انسان کی فطرت میں جو چیز ودیعت کی گئی تھی اس سے مختلف کسی اور چیز کی تعلیم قرآن وسنت نے انسانوں کو نہیں دی۔

یہ پہلی حدیث ہے جو راوی نے آں حضرت ﷺ سے سنی۔ دوسری حدیث امانت سے اٹھ جانے کے متعلق ہے۔

اپنی غفلت کی وجہ سے انسان امانت کی دولت سے محروم ہوجائے گا۔ یہاں تک کہ امانت کے اثرات بھی بہ تدریج اس کے ذہن اور دل سے بالکل مٹ جائیں گے۔ جس طرح ابھرے ہوئے آبلہ میں خراب پانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اسی طرح انسان اخلاق و کردار کے اعتبار سے بالکل کھوکھلا ہوکر رہ جائے گا۔

امانت اٹھ جانے کی وجہ سے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ خرید وفروخت اور دوسرے معاملات میں بے تکلف بددیانتی سے کام لیں گے۔ انھیں ایک دوسرے کے نقصان کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوگی مہذب سے مہذب شخص کو اگر قریب سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کے دل

میں رائی کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔ امانت داری اور ایمان دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ایمان کے بغیر کسی امانت داری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

راوی کا بیان ہے کہ جس سے ہمارا معاملہ ہوتا وہ اگر مسلمان نہ بھی ہوتا تب بھی ہمیں اس سے اندیشہ نہ ہوتا۔ دین وایمان نہ سہی اپنے سرداروں اور ذمہ داروں کی گرفت کا خیال اسے مجبور کرتا کہ وہ میرا حق نہ مارے بلکہ اسے پورا پورا ادا کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امانت کے اٹھ جانے کی جو اطلاع آں حضرت (ﷺ) نے دی تھی حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد صحابہؓ کے دور ہی میں اس کے آثار نمایاں ہونے لگ گئے تھے۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَيْرُ اُمَّتِىْ قَرْنِىْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، قَالَ عِمْرَانُؓ فَلاَ اَدْرِىْ اَذَكَرَ بَعْدَ قَرْنِهٖ قَرْنَيْنِ اَوْ ثَلٰثًا ثُمَّ اَنَّ بَعْدَكُمْ قَوْمًا يَّشْهَدُوْنَ وَلاَ يُسْتَشْهَدُوْنَ وَ يَخُوْنُوْنَ وَلاَ يُؤْتَمَنُوْنَ وَ يُنْذِرُوْنَ وَلاَ يَفُوْنَ وَ يَظْهَرُ فِيْهِمُ السَّمَنُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری امت میں سب سے بہتر میرے زمانے کے لوگ ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد متصل ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد متصل ہوں گے۔'' حضرت عمرانؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے اچھی طرح نہیں معلوم کہ آپؐ نے اپنے زمانے کے بعد دو زمانوں کو بہتر فرمایا یا تین کو۔ فرمایا: ''پھر تمھارے بعد وہ لوگ ہوں گے جو بغیر طلب کیے ہی گواہی دیں گے، خیانت کے مرتکب ہوں گے، امین نہ بنائے جائیں گے اور وہ نذر مانیں گے مگر اسے پوری نہ کریں گے اور ان میں فربہی ظاہر ہوگی۔''

تشریح: ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے زمانے کے بعد متصل دو زمانوں کو بہتر زمانہ فرمایا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِىْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَجِيْءُ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ اَيْدِيْهِمْ يَمِيْنَهٗ وَ يَمِيْنُهٗ شَهَادَتَهُمْ ''سب سے بہتر لوگ میرے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، پھر وہ لوگ بہتر ہیں جو میرے زمانہ کے لوگوں سے متصل ہوں گے پھر وہ لوگ جو ان

سے متصل ہوں گے۔ اس کے بعد ایسے لوگ ہوں گے جن کی گواہی ان کی قسم پر اور ان کی قسم ان کی گواہی پر سبقت کرے گی۔'' مطلب یہ کہ گواہی دینے کی حرص بڑھی ہوگی۔ ذمہ داری کا انھیں مطلق احساس نہ ہوگا۔

ابتدائے نبوت سے آخری صحابیؓ کی وفات کا زمانہ ۱۲۰ برس کا ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۲۰ سال کی مدت میں دو دور (دورِ نبوت اور دورِ صحابہ) گزر گئے۔ تابعین کا زمانہ ۱۷۰ سال میں ختم ہوا۔ تبعِ تابعین کا زمانہ ۲۲۰ ہجری میں تمام ہوتا ہے۔ اس وقت تک امت میں کافی خرابیاں رونما ہو چکی تھیں۔ احادیث میں تین قرن تک خیر اور بھلائی کے غالب رہنے کی خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ اس کے بعد برائی غالب ہو جائے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بھلائی دنیا سے ایک دم ناپید ہو جائے گی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو حق پر قائم ہوں گے اور دین کے فروغ کے لیے ان کی کوششیں جاری ہوں گی۔ اہلِ باطل کی کثرتِ تعداد اور ان کا غلبہ راہِ حق سے انھیں برگشتہ نہ کر سکے گا۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے دور میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کی سعادت حاصل کریں جو ہر طرح کی گم راہیوں اور بدعتوں سے دور رہ کر غلبۂ حق کے لیے کوشاں ہوں۔

توبہ و استغفار

﴿۱﴾ عَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِيِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَـاَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّىْ اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِى الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت اغر مزنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! خدا کے آگے توبہ کرو۔ میں دن میں سو بار اس کے آگے توبہ کرتا ہوں۔''

تشریح: یعنی میں خود بہ کثرت خدا کی جناب میں توبہ کرتا اور اس کی طرف رجوع ہوتا ہوں اس لیے تمھیں بھی توبہ کا التزام کرنا چاہیے۔

''میں سو بار اس کے آگے توبہ کرتا ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ میں خود کو اس کا ضرورت مند پاتا ہوں کہ بار بار خدا کی طرف متوجہ ہوں تا کہ وہ میری بھول چوک کو معاف فرمائے اور خدا کی جناب کے سوا میرا دل کہیں اور قرار نہ پکڑے اور اس لیے بھی کہ خدا کے سوا مجھے کہیں اور قرار نہیں

ملتا۔ اس طرح مجھے خدا کی توجہ خاص اور اس کی عنایات کی بھی زیادہ سے زیادہ امید اور توقع ہوتی ہے جس کا ایک بندہ سب سے زیادہ ضرورت مند اور محتاج ہوتا ہے۔

توبہ کرنے کا مطلب ہے رجوع کرنا، لوٹ آنا اور جھک جانا۔ اسی طرح ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ پہلی حالت بری ہی ہو بلکہ اچھی حالت سے اس سے بہتر حالت کی طرف رجوع کرنا بھی توبہ ہے۔ یہ لفظ خدا کے لیے بھی آتا ہے، اس وقت اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا بندے پر مہربان اور اس سے راضی ہوگیا۔ اس نے بندے کی توبہ قبول فرمالی۔ اس کی خطاؤں کو معاف کردیا اور اس کی طرف توجہ فرمائی۔

توبہ ایک بہترین اور پاکیزہ ترین اصطلاح ہے۔ اس میں انتہا درجہ کی شان پردہ داری بھی پائی جاتی ہے۔ بندہ جب گھناؤنے سے گھناؤنے فعل کو خدا سے ڈر کر ترک کردیتا ہے اور عزم کرتا ہے کہ وہ اس فعل کا اب ہرگز مرتکب نہ ہوگا تو اس کے اس طرزِ عمل کو اعترافِ جرم (Confession) سے بلکہ توبہ سے تعبیر کرتے ہیں، گویا بندہ اپنے خدا کی طرف لوٹا اور اس کی طرف رجوع ہوا ہے جو ایک بہترین وظیفۂ حیات ہے۔ اس طرح بندے کی عیب پوشی کی جاتی ہے، اس کے مقبولِ بارگاہ ہونے کی خبر دی جاتی ہے اور اسے رسوائی سے بچالیا جاتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَ اِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِى الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت اغرمزنیؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”میرے دل پر پردہ پڑ جایا کرتا ہے، پس میں دن میں سَو بار استغفار کرتا ہوں۔“

تشریح: دلِ مصطفےٰ (ﷺ) کی حالت و کیفیت کو کوئی کیا بیان کرسکتا ہے۔ پھر بھی شارحینِ حدیث نے اس حدیث کی شرح میں اپنے بعض احساسات کا اظہار کیا ہے۔ رسولِ خدا ﷺ کی قلب کی حالت یہ تھی کہ آپؐ ہر آن اور ہر لمحہ خدا کو یاد کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے: كَانَ النَّبِىُّ ﷺ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ۔ (مسلم) ”نبی ﷺ ہر آن خدا کو یاد کرتے تھے۔“ آپؐ چاہتے تھے کہ دل ہمہ وقت خدا کی جناب میں حاضر رہے اور حضوری کی کیفیت میں کسی قسم کا فرق واقع نہ ہو، لیکن آپؐ کی ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے

کے علاوہ دعوتِ حق، جہاد اور لوگوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کتنے ہی امور تھے جن کی طرف آپؐ کو توجہ دینی پڑتی تھی۔ حساس قلب اسے بھی ایک طرح کی غفلت پر محمول کرتا تھا اور آپؐ اس کے لیے استغفار فرماتے تھے۔ بعض شارحین نے 'پردہ' (غین) سے مراد سکینہ لیا ہے جو قلبِ اطہر پر اترتا تھا اور دل پر چھا جاتا تھا۔ آپؐ کا استغفار درحقیقت اظہار شکر اور مزید کی طلب کے لیے تھا جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے: اَفَلاَ اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔ ''کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ وَ لَجَآءَ بِقَوْمٍ یُّذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ فَیَغْفِرُ لَهُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو لازماً خدا تمھیں ختم کر کے ایسے لوگوں کو لے آئے جو گناہ کریں اور اللہ سے مغفرت کے طالب ہوں اور پھر خدا انھیں بخش دے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی تخلیق سے مطلوب یہ نہیں ہے کہ ان سے سرے سے کوئی گناہ ہی سرزد نہ ہو بلکہ بندے کے لیے اپنے گناہوں پر اصرار کرنا جرم عظیم ہے۔ بندہ اگر خدا کی طاعت میں زندگی گزارتا ہے تو اس کا رب قدرداں ہے، وہ اس کی نیکیوں کا اجر عطا فرمائے گا اور اگر کوئی گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر توبہ و استغفار کرتا اور اپنے گناہوں سے تائب ہوتا ہے تو اس کا رب غفور اور خطاؤں کا بخشنے والا ہے، وہ اس کی خطاؤں اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: كُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ خَطَّآءٌ وَ خَیْرُ الْخَطَّآئِیْنَ التَّوَّابُوْنَ۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر انسان خطا کار ہے اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔''

تشریح: یعنی خطا تو انسان سے ہوتی ہی ہے۔ بشری کمزوریوں سے کون پاک ہے۔ لیکن بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی غلطی پر قائم نہیں رہتے بلکہ جلد سے جلد تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ وہ ظلمت اور تاریکی میں پڑ تو سکتے ہیں لیکن اس میں وہ پڑے نہیں رہتے، اس سے نکلنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ انھیں اصلاً تعلق روشنی سے ہوتا ہے، تاریکی سے نہیں۔ وہ خیر سے دل چسپی رکھتے ہیں، شر سے ان کا تعلق نہیں ہوتا۔

﴿۵﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰہُ لَہٗ مِنْ کُلِّ ضِیْقٍ مَّخْرَجًا وَّ مِنْ کُلِّ ھَمٍّ فَرَجًا وَّ رَزَقَہٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

(احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ ان کا بیان ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص استغفار کو اپنے اوپر لازم کرلے تو اللہ ہر تنگی سے نکلنے کی راہ اس کے لیے پیدا کردیتا ہے اور ہر رنج اور غم سے نجات عطا کرتا ہے اور اسے ایسی جگہ اور ایسے طریقے سے رزق بہم پہنچاتا ہے کہ جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔''

تشریح: بندہ ہر حالت میں خدا کا محتاج ہے۔ اس پر لازم ہے کہ استغفار کے ذریعہ سے اپنے رب سے وابستہ رہے۔ خوفِ خدا کا تقاضا بھی یہی ہے اور رحمتِ خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ قرآن میں بھی ہے: وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا ۙ وَّ یَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ؕ (الطلاق: ۲-۳) ''جو کوئی اللہ کا ڈر رکھے گا اس کے لیے وہ نکلنے کی راہ پیدا کردے گا اور اسے وہاں سے رزق دے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔'' قرآن کے یہ الفاظ حدیث کی تصدیق کرتے ہیں۔ استغفار کے منفعت بخش ہونے کی شاہد قرآن کی یہ آیات بھی ہیں: فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ؕ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا ۙ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّ یُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ یَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا ؕ مَا لَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ۚ (نوح: ۱۰-۱۳) ''پس میں نے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، یقیناً وہ بڑا مغفرت فرمانے والا ہے، وہ آسمانوں کو تم پر خوب برستا چھوڑے گا، وہ مال اور بیٹوں سے تمھیں فروغ عطا کرے گا اور تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری فرمائے گا۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کے لیے کسی وقار و عظمت کی توقع نہیں رکھتے۔''

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَللّٰہُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَۃِ عَبْدِہٖ حِیْنَ یَتُوْبُ اِلَیْہِ مِنْ اَحَدِکُمْ کَانَتْ رَاحِلَتُہٗ بِاَرْضٍ فَلَاۃٍ فَانْفَلَتَتْ مِنْہُ وَ عَلَیْھَا طَعَامُہٗ

وَ شَرَابُهٗ فَاَیِسَ مِنهَا فَاَتٰی شَجَرَةً فَاضْطَجَعَ فِیْ ظِلِّهَا قَدْ اَیِسَ مِنْ رَّاحِلَتِهٖ فَبَیْنَمَا هُوَ کَذٰلِکَ اِذْ هُوَ بِهَا قَآئِمَةٌ عِنْدَهٗ فَاَخَذَ بِخِطَامِهَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شَدَّةِ الْفَرَحِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَ اَنَا رَبُّکَ أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ اپنے بندے کی توبہ پر جب وہ (گناہ کے بعد) معافی مانگنے کے لیے اس کی طرف پلٹتا ہے۔ تم میں سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری صحرا میں ہو پھر وہ سواری غائب ہوگئی اور اسی پر اس کا کھانا پانی بھی تھا (اس نے ادھر ادھر چھان مارا مگر سواری نہ مل سکی) وہ بالآخر مایوس ہوکر ایک درخت کے پاس آکر اس کے سایے میں لیٹ گیا۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کی سواری (اونٹنی) اس کے پاس کھڑی ہے۔ اس نے اس کی مہار پکڑ لی اور انتہائی مسرت میں اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: ’اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔‘ یہ چوک وفورِ مسرت میں اس سے ہوئی (کہ غلط الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے)۔‘‘

تشریح: اظہارِ شکر کے طور پر کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ وَ اَنَا عَبْدُکَ (خدایا، تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں) لیکن وفورِ مسرت میں وہ کچھ کا کچھ کہہ گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بندے کی توبہ خدا کی رضا و خوشنودی کا باعث ہے۔ توبہ کرنے سے پہلے بندہ گویا کھو گیا تھا اور اس کی ہلاکت یقینی ہوگئی تھی لیکن توبہ کرکے اس نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کردیا اور ضائع ہونے سے اپنے کو بچا لیا۔ خدا چاہتا یہی ہے کہ اس کا کوئی بھی بندہ جس کو اس نے بہترین فطرت پر تخلیق فرمایا ہے ضائع اور تباہ نہ ہو۔

〈۷〉 وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْمَا یَرْوِیْ عَنِ اللّٰهِ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَنَّهٗ قَالَ: یٰعِبَادِیْ اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَ جَعَلْتُهٗ بَیْنَکُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا یٰعِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَیْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِیْ اَهْدِکُمْ یٰعِبَادِیْ کُلُّکُمْ جَآئِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْکُمْ یٰعِبَادِیْ کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ کَسَوْتُهٗ فَاسْتَکْسُوْنِیْ اَکْسُکُمْ یٰعِبَادِیْ اِنَّکُمْ تُخْطِؤُنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَ اَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْ لَکُمْ یٰعِبَادِیْ اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّیْ

فَتَضُرُّوْنِیْ وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ یٰعِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ وَ اِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ مَّا زَادَ ذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا یٰعِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ وَ اِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْکُمْ مَّا نَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُّلْکِیْ شَیْئًا یٰعِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ وَ اِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ قَامُوْا فِیْ صَعِیْدٍ وَّاحِدٍ فَسَأَلُوْنِیْ فَاَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَّسْئَلَتَهٗ مَا نَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّا عِنْدِیْ اِلَّا کَمَا یَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ یٰعِبَادِیْ هِیَ اِنَّمَا اَعْمَالُکُمْ اُحْصِیْهَا عَلَیْکُمْ ثُمَّ اُوَفِّیْکُمْ اِیَّاهَا فَمَنْ وَّجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰهَ وَ مَنْ وَّجَدَ غَیْرَ ذٰلِکَ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان روایات کے ضمن میں جو آپؐ اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے تھے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اسے تمھارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا ہے۔ پس تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گم راہ ہے سوائے اس کے جس کو میں نے ہدایت دی۔ پس مجھ سے ہدایت کے طالب ہو میں تمھاری رہ نمائی کروں گا۔ اے میرے بندو! تم میں سے ہر ایک بھوکا ہے سوائے اس کے جس کو میں نے کھلایا۔ پس تم مجھ سے کھانا مانگو، میں تمھیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں سے ہر ایک ننگا ہے سوائے اس کے جس کو میں نے پہننے کو دیا۔ پس تم مجھ سے لباس مانگو، میں تمھیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم رات دن خطائیں کرتے رہتے ہو اور میں تمام خطاؤں کو بخشتا ہوں۔ پس مجھ سے بخشش کے طالب ہو، میں تمھیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم (اگر گناہ کر کے) مجھے نقصان پہنچانا چاہو گے تو مجھے ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور (اگر نیک کام کر کے) مجھے فائدہ پہنچانا چاہو گے تو ہرگز مجھے فائدہ نہیں پہنچا سکو گے۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور تمھارے پچھلے اور تمھارے انس وجن تمھارے اپنے ایک شخص کے نہایت خداترس دل کے مانند ہو جائیں تو اس سے میرے اختیار اور بادشاہی میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور تمھارے پچھلے اور تمھارے انس وجن تمھارے ایک شخص کے بدتر و فاجر تر دل کے مانند ہو جائیں تو

اس سے میری بادشاہی میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمھارے اگلے اور تمھارے پچھلے اور تمھارے انس وجن سب کے سب ایک جگہ کھڑے ہوکر مجھ سے مانگیں اور میں ہر انسان کو اس کی طلب کے مطابق دوں تو اس سے میرے پاس جو کچھ ہے اس میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی، ہوگی تو بس ایسی ہی جیسی کہ سمندر میں کسی سوئی کے ڈالنے کے وقت (اس سمندر کے پانی میں) ہوتی ہے۔ اے میرے بندو! یہ تو بس تمھارے اعمال ہیں جن کو میں تمھاری خاطر گن رکھتا ہوں پھر میں تم کو انھیں پورا پورا ادا کردوں گا۔ لہٰذا جو کوئی بھلائی پائے اس کو چاہیے کہ وہ خدا کی حمد کرے اور جو اس سے مختلف دوسری چیز پائے وہ بس خود کو ملامت کرے۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا اگر بندے کو یوں ہی چھوڑ دے اور اس کی ہدایت کا سامان نہ کرے تو وہ ہرگز ہدایت حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا اور اپنی اس فطرت سے بے گانہ ہوجائے گا جس کا ذکر حدیث کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ'' ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے'' کیا گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ''کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ ھَدَیْتُہٗ'' (تم میں سے ہر ایک گم راہ ہے سوائے اس کے جس کو میں نے ہدایت دی) کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَۃٍ ثُمَّ رَشَّ عَلَیْھِمْ مِنْ نُوْرِہٖ'' ''بلاشبہ خدا نے خلق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر اس پر اپنے نور کی پھوار برسائی۔'' اس پھوار ہی کے ذریعہ سے تاریکی سے نجات ممکن ہوسکی۔ خدا کے نور کے مقابل جو کچھ ہے وہ تاریکی ہے۔ خدا سے بے نیاز ہوکر انسان ظلمت سے ہرگز نہیں نکل سکتا۔

داد و دہش سے خدا کے یہاں ہرگز کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اسی کو سمندر اور سوئی کی مثال دے کر سمجھایا گیا ہے۔ مثال سے بات ذہن میں نقش ہوجاتی ہے اور اسے یاد رکھنا بھی آسان ہوتا ہے۔

حدیث کے یہ آخری الفاظ اس حدیث کا ماحصل ہیں۔ انسان کو جو اور جس طرح کی بھلائی حاصل ہو وہ درحقیقت خدا کی عنایت ہے۔ وہ اپنے بندے پر بے انتہا عنایات کرنے کی پوزیشن میں ہے، اس کی قدرت اور رحمت بے پایاں ہے... وہ اپنی ذات کے لحاظ سے بے نیاز اور غنی عن العالمین ضرور ہے لیکن اس کی رحمتوں اور فیاضیوں سے سارا عالم فیض یاب ہوسکتا ہے۔

بندے کے لیے لازم ہے کہ خیر اور بھلائی میں حصہ پا کر خدا کا شکر گزار ہو اور اس کی حمد کرے اور اگر وہ بھلائی سے محروم رہتا ہے تو اس میں قصور خود بندے کا ہے خدا کا نہیں۔ اسے ملامت کرنی ہے تو خود کو ملامت کرے۔ خدا نے تو اپنی رحمت کا دروازہ سب ہی کے لیے کھلا رکھا ہے۔ اب اگر کوئی خود کو خدا کی رحمت سے الگ رکھتا ہے تو وہ خود اپنے اوپر ظلم کو روا رکھتا ہے اس کی ذمّہ داری خود اسی پر عائد ہوتی ہے۔

امید وبیم

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَوْ یَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهٖٓ اَحَدٌ وَلَوْ یَعْلَمُ الْکَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهٖٓ اَحَدٌ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو عذاب اللہ کے پاس ہے اگر اہلِ ایمان اسے جان لیں تو کوئی بھی اس کی جنت کی طمع نہ کر سکے اور جو رحمت اللہ کے پاس ہے اس کا علم اگر اہلِ کفر کو ہو جائے تو کوئی بھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔“

تشریح: دنیا میں کسی بندے کے لیے جو طرزِ عمل صحیح اور درست ہو سکتا ہے وہ یہی کہ اس کا دل نہ خوفِ خدا سے کبھی خالی ہو اور نہ وہ کبھی خدا کی رحمت سے مایوس ہو۔ زندگی کو درست رکھنے کے لیے خوف اور امید دونوں کی ضرورت ہے۔ خوف انسان کو خدا کی نافرمانی سے باز رکھے گا اور امید اسے نیکیوں کی طرف لے جائے گی۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ یہ خوف اور امید بے بنیاد اور وہم پر ہرگز مبنی نہیں ہے۔ خدا کے پاس ایسا دردناک عذاب مہیا ہے کہ وہ اگر صحیح طور پر ایک مومن بندہ کے بھی علم میں آجائے تو اس کی جنت کی آرزو ختم ہو جائے اور اسے یہ گمان ہونے لگے کہ اس عذاب اور غضبِ خداوندی سے بچ نکلنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ کون اس کی لپیٹ میں آجائے۔ عذاب کی اس شدت کے مقابلے کے لیے ہمارے پاس جو یقین وعمل ہے اس میں وہ قوت واثر کہاں کہ وہ غضبِ الٰہی کی شدت کو کم کر سکے۔

اسی طرح اگر کافر شخص کو جو کسی طرح بھی رحمت کا مستحق نہیں ہے خدا کی رحمت کا صحیح علم ہو سکے تو وہ بھی خدا سے امید قائم کرنے لگ جائے گا اور اسے یہ گمان ہوگا کہ خدا کی رحمت جب

اس قدر وسیع ہے اور اس میں اس قدر جوش وخروش ہے تو کوئی بھی جنت سے محروم نہیں ہوسکتا۔ شاید خدا کے غضب اور اس کی رحمت کی اس سے بہتر تصویر کشی ممکن نہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ حُسْنَ الظَّنِّ بِاللّٰهِ تَعَالٰی مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”خدا کے ساتھ نیک گمان رکھنا بہترین عبادت ہے۔“

تشریح: اللہ کے ساتھ کسی بندے کا رشتہ و تعلق کیسا اور کس نوعیت کا ہے اس کا اندازہ آپ اس گمان سے کر سکتے ہیں جو وہ اپنے رب سے رکھتا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ نیک گمان رکھے۔ اس کے دین و ایمان کی درستی کا اصل انحصار اسی پر ہے۔ خدا کا معاملہ اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ۔ ”میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔“ اب یہ بندے پر ہے کہ وہ جیسا چاہے اپنے رب کے ساتھ گمان رکھے۔ (فَلْیَظُنَّ بِیْ مَا یَشَآءُ)

خدا کے ساتھ ایک مومن شخص جو حسن ظن رکھتا ہے اس کے کئی پہلو ہیں: مردِ مومن یہ سمجھتا ہے کہ اس کا رب اس کی خبر گیری سے غافل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اسے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ یہ توکل دنیا میں اس کی سب سے بڑی قوت ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا نے اس کے لیے جو بھی فیصلہ کیا ہے اسی میں اس کی بھلائی ہے۔ خدا نے اسے جو کچھ دیا ہے وہ اس سے سوا ہے جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا۔ آخرت میں بھی وہ اس کے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا۔

بجلی، گرمی، روشنی وغیرہ سے کہیں بڑھ کر قوت ان اعمال میں پائی جاتی ہے جن کے پیچھے اچھے جذبات اور للّٰہیت کارفرما رہی ہو۔ یہ خدا کے ساتھ حد درجہ کی بدگمانی ہوگی کہ آدمی، ہوا، گرمی، سردی وغیرہ کے اثرات کو تو تسلیم کرتا ہو لیکن خدا سے مایوس ہو، نیک اعمال سے غفلت حسن ظن باللہ کے منافی ہے۔ کیا اعمال نیک پر خدا سے اسے جزا کی امید نہیں یا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ خدا کو اس کے اعمال کی خبر نہیں ہوتی۔ حسن ظن باللہ ایک ایسی کسوٹی ہے کہ کوئی بھی شخص جب چاہے اس پر اپنے کو پرکھ کر دیکھ سکتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور اس نے اپنی زندگی میں خدا کو کیا مقام دے رکھا ہے۔

حسنِ ظن باللہ کو عبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے کہ جس کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اور اس میں مشغول رہ کر دوسرے ضروری کام بھی انجام دیے جا سکتے ہیں۔ یہ عبادت دیگر مصروفیات میں حارج نہیں ہوتی۔ اور یہ عبادت بھی ایسی ہے جو ایک بہتر عبادت ہے۔

(۳) وَ عَنْ اُمِّ الْعَلاَءِ الْاَنْصَارِیَّۃِ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: وَاللّٰہِ لاَ اَدْرِیْ وَاللّٰہِ لاَ اَدْرِیْ وَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلاَ بِکُمْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت امّ العلاء انصاریہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں، لیکن بہ خدا میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اور تمھارے ساتھ کیا۔‘‘

تشریح: نبی (ﷺ) کا یہ ارشاد ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ جو کبار مہاجرین میں سے تھے، مہاجرین میں سب سے پہلے مدینہ میں ان ہی کا انتقال ہوا۔ نبی (ﷺ) نے ان کی وفات کے بعد ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ آپؐ کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ آپؐ کی موجودگی میں جنت البقیع میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ایک خاتون نے کہا کہ اے ابن مظعون تجھے جنت مبارک ہو، تیری عاقبت بخیر ہے۔ اس پر آپؐ نے توبیخ کی کہ غیب کی خبر کسی کو کیا معلوم۔ پھر یہ خلافِ ادب بھی ہے کہ امورِ غیب کے بارے میں کوئی بات جزم اور وثوق کے ساتھ کہی جائے۔ کون کن حالات سے دوچار ہوگا اس کے تفصیلی احوال کی خبر رب العزت ہی کو ہوسکتی ہے۔ بعض شارحینِ حدیث نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے آپؐ کا یہ ارشاد اس وقت کا ہو جب یہ آیت نازل نہ ہوئی ہو: لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح:۲) ’’...تاکہ اللہ تمھارے اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخش دے۔‘‘

ذوقِ صحیح

رجوع الی اللہ

〈۱〉 عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ قَالَ: لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادٍ مِّنْ ذَھَبٍ اَحَبَّ اَنَّ لَہٗ وَادِیًا اٰخَرَ وَلَنْ یَّمْلَأَ فَاہُ اِلَّا التُّرَابُ وَاللّٰہُ یَتُوْبُ عَلٰی مَنْ تَابَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”ابنِ آدم کے پاس اگر ایک وادی سونے کی ہو پھر بھی وہ چاہے گا کہ دوسری ایک اور وادی کا وہ مالک ہو۔ اس کا منہ تو بس مٹی ہی بھرتی ہے۔ اللہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو توبہ کرے۔“

تشریح: یعنی آدمی کی آرزوئیں تو قبر ہی میں جا کر ختم ہوتی ہیں۔ زندگی میں اس کی خواہشات اور تمناؤں کا سلسلہ دراز ہی ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے سونے کی بھی وادی میسر آجائے تو بھی اس کی خواہش ہوگی کہ کاش ایسی ہی ایک اور وادی اس کے حصے میں آجائے۔ دنیا میں بے جا خواہشات اور حرص و آز سے پیچھا چھڑانے میں اگر کوئی کامیاب ہوسکتا ہے تو وہی شخص جس کی زندگی میں خدا شامل اور داخل ہو گیا ہو۔ جب تک اس کا لطف خاص نہ ہو آدمی کو خواہشات کی غلامی سے نجات نہیں ملتی۔ لیکن خدا ان ہی لوگوں کو دنیا میں قانع اور اپنا آرزومند بناتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو خدا سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں اور اسی کے دامن میں سکون و عافیت اور آرام کے خواہاں ہوتے ہیں۔

انس و محبت

〈۱〉 عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَھْلِ الْبَادِیَۃِ اَتَی النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَتَی السَّاعَۃُ قَآئِمَۃٌ؟ قَالَ: وَیْلَکَ وَمَا اَعْدَدْتَ لَھَا؟ قَالَ: مَا اَعْدَدْتُ لَھَا اِلَّآ اَنِّیْ اُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ۔ قَالَ: اِنَّکَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ، فَقُلْنَا وَ نَحْنُ کَذٰلِکَ قَالَ: نَعَمْ، فَفَرِحْنَا یَوْمَئِذٍ فَرَحًا شَدِیْدًا فَمَرَّ غُلَامٌ لِّلْمُغِیْرَۃِ وَ کَانَ مِنْ اَقْرَانِیْ فَقَالَ: اِنْ اُخِّرَ ھٰذَا فَلَنْ یُّدْرِکَہُ الْھَدَمُ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَۃُ۔ (بخاری)

ترجمہ: ”حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک بدوی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! قیامت کب برپا ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ”افسوس تجھ پر، تو نے

اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے؟'' اس نے کہا کہ میں نے تو اس کے لیے کوئی سامان نہیں کیا ہے سوائے اس کے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے۔'' ہم نے عرض کیا کہ کیا ہم بھی اسی طرح ہوں گے؟ فرمایا: ''ہاں!'' اس پر ہم لوگوں کو اس دن بے انتہا مسرت ہوئی۔ اتنے میں مغیرہ کا ایک غلام جو میرا ہم سن تھا گزرا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر یہ زندہ رہا تو اس کے بڑھاپے سے پہلے ہی قیامت آجائے گی۔''

تشریح: زندگی میں اصل فیصلہ کن چیز محبت ہے۔ کسی آدمی کے بارے میں اصلاً دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہوتی کہ اس کے ظاہری اعمال کیسے ہیں؟ بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص خود کیا ہے؟ اس کا پتہ اس کے جذبۂ محبت ہی سے چلتا ہے۔ اپنے آخری تجزیہ میں آدمی محبت ہی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ محبت وہ کس سے اور کیوں رکھتا ہے؟ اعمال تو مختلف وجوہ سے کمیت کے اعتبار سے تھوڑے بھی ہو سکتے ہیں لیکن اخلاص و محبت کے فقدان یا کمی کی تلافی کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔ حسن و حقیقت سے محبت نہ ہو، یہ آدمی کے لیے عین ہلاکت ہے۔

سچی محبت کبھی بے اثر نہیں رہ سکتی۔ محبت آدمی کو اس کے مطلوب و محبوب سے قریب کرتی ہے بلکہ محبت خود عین قرب ہے۔ محبت زندگی کا مزاج ہے۔ جس شخصیت کی تعمیر کسی بلند و پاکیزہ محبت سے نہ ہوئی ہو وہ روح و حیات اور نور سے خالی ہے۔ یہ حقیقت ہے:

We are shaped and fashioned by what we love.

''ہماری (شخصیت کی) تعمیر و تزئین اس سے ہوئی ہے جس سے ہم محبت کرتے ہیں۔''

ہم اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سچی محبت رکھتے ہیں تو ہم کام یاب ہیں۔ محبت اور وفاداری کا ثبوت کبھی معمولی انفاق سے فراہم ہو جاتا ہے کبھی کثیر دولت خرچ کر دینے کے بعد بھی محبت متحقق نہیں ہوتی۔ خدا دلوں کو دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس انفاق کے پیچھے خدا اور رسول کی محبت کارفرما ہے اور کس انفاق کے پیچھے کوئی اور چیز کام کر رہی ہے۔ وہ اس کی بھی خبر رکھتا ہے کہ کس کے اندر کس درجہ کی محبت اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی اگر احد پہاڑ کے برابر سونا (خدا کی راہ میں) خرچ کر دے تو وہ کسی صحابی کے ایک مد (ایک پیمانہ جس میں سیر بھر جو آتا ہے) یا نصف مد کے برابر بھی اس کا ثواب نہ پہنچ سکے گا۔

حضرت انسؓ کا یہ بیان بھی منقول ہوا ہے کہ میں نے اسلام کے بعد مسلمانوں کو کسی بات سے بھی اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا وہ آپؐ کے اس ارشاد سے ہوئے۔ کہ تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے۔

سائل نے پوچھا تھا کہ قیامت کب برپا ہوگی؟ آپؐ نے مغیرہ کے غلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ غلام (جو کم عمر ہے) اگر زندہ رہا تو اس کے بوڑھا ہونے سے پہلے تمھارے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آجائے گا۔ اور آدمی کی موت ہی اس کے لیے اپنی قیامت ہے۔ اس لیے کہ موت کے بعد آدمی کے ساتھ وہ معاملات شروع ہوجاتے ہیں جن کی حیثیت جزائے اعمال کی ہے۔ قیامت آخر اسی لیے تو برپا ہوگی کہ انسانوں کو ان کے اپنے اعمال کی جزا پورے طور پر مل سکے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی آدمی کی موت اور قیامت کے برپا ہونے کے درمیان کی مدت اس آدمی کو ناقابلِ لحاظ حد تک مختصر محسوس ہوگی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قیامت اور حشر ونشر کی گھڑی آنے میں بس اتنی ہی تاخیر ہے جتنی اپنی موت کے آنے میں۔ قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے: وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُهُمۡ کَاَنۡ لَّمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ یَتَعَارَفُوۡنَ بَیۡنَهُمۡ ؕ (یونس:۴۵) ”جس دن وہ انھیں اکٹھا کرے گا، تو ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ دن کی ایک گھڑی بھر ٹھہرے تھے۔“

〈۲〉 وَ عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ قَالَ: اَلۡمَرۡءُ مَعَ مَنۡ اَحَبَّ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔“

〈۳〉 وَ عَنۡ اَبِیۡ مُوۡسٰیؓ قَالَ: قِیۡلَ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلرَّجُلُ یُحِبُّ الۡقَوۡمَ وَلَمَّا یَلۡحَقۡ بِهِمۡ، قَالَ: اَلۡمَرۡءُ مَعَ مَنۡ اَحَبَّ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کسی قوم سے محبت کرتا ہے اور وہ اس قوم کے لوگوں سے مل نہیں سکا۔ آپؐ نے فرمایا: ”آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔“

تشریح: یعنی اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آدمی کی اپنی زندگی میں اس شخص سے ملاقات نہ ہوسکی جس سے اس کو محبت تھی۔ محبت کی وجہ سے لازماً اسے اپنے محبوب شخص کی معیت حاصل ہوگی۔ محبت زندگی کی بنیادی اقدار میں شامل ہے۔ اس کے تقاضے لازماً پورے ہوکر رہیں گے۔

زندگی کی ہر شے اپنے وجود میں دوام کی خبر رکھتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ بے معنی ہوکر رہ جائے۔ یہاں کی کوئی چیز بے معنی ہرگز نہیں ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ہر لمحہ پر ابدیت اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ محبت کا جذبہ ایک اہم جذبہ ہے اسے بے معنی کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ محبت لازماً

دائمی اثرات کی حامل ہے۔ وہ کوئی کھو جانے والی چیز نہیں ہوسکتی۔ اسے بقا حاصل ہے۔ بقا اس کی فطرت کا اہم مطالبہ ہے۔۔۔ بقا کی طرح اس کے دوسرے تقاضے بھی یقیناً پورے ہوں گے۔

﴿۴﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ وَّ اَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰہِ وَاَحِبُّوْٓا اَھْلَ بَیْتِیْ لِحُبِّیْ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خدا سے محبت کرو اس لیے کہ وہ نعمت سے تمھاری پرورش کرتا اور غذا پہنچاتا ہے اور مجھ سے محبت رکھو خدا کی محبت کے سبب اور میرے اہلِ بیت کو محبوب رکھو میری محبت کی وجہ سے۔''

تشریح: یعنی اور کچھ نہیں تو اتنا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا ہی نے اس کی پرورش اور غذا کا سامان کیا ہے۔ خدا کی اس عنایت کا تقاضا ہے کہ انسان کو اپنے خدا سے محبت ہو۔ خدا کی نوازشوں اور اس کے فضل و کرم کا حق اگر انسان ادا کرسکتا ہے تو اسی طرح کہ وہ اس سے جان و دل سے محبت کرے۔ پھر خدا کی اس محبت کا تقاضا ہے کہ آدمی حضور اکرم (ﷺ) کی ذات سے محبت رکھے۔ کیوں کہ آپؐ خدا کے محبوب اور برگزیدہ ہیں۔ اور حضور اکرم (ﷺ) کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی آپؐ کی آل و اولاد اور آپؐ کے اہلِ بیت سے محبت کا رشتہ قائم کرلے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَنَّہٗ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ اَلْیَوْمَ اُظِلُّھُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔ (موطا)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جو باہم میری عظمت و بزرگی کی وجہ سے محبت رکھتے تھے۔ آج میں انھیں اپنے سایے میں رکھوں گا۔ آج کے دن میرے سایے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کو باہم محبت کا رشتہ استوار کرنا چاہیے۔ انھیں اہلِ ایمان اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی عظمت کو پہچانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ خدا کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں تو خدا کی عظمت اور اس کا جلال ان سے انتقام لے کر رہے گا۔ یہ خدا کا حق ہے کہ بندہ اس سے محبت رکھے اور ان لوگوں سے بھی محبت کرے جن کا خدا سے محبت کا

رشتہ ہے۔ خدا کی عظمت کا احساس مومن کو ہر قسم کی حق تلفی سے باز رکھتا ہے۔ مومن باہم محبت کے رشتہ میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ خدا کی عظمت اور بزرگی کا مشترک احساس اہل ایمان کو وجود واحد کی شکل میں بدل دیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو غیر نہیں سمجھتے۔ خدا کی عظمت کا احساس وشعور دوسرے سارے احساسات پر چھا جاتا ہے۔ ان میں ایسی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے جس کی نظیر دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کی یگانگت اور ان کے اتحاد کو کوئی بھی چیز مجروح نہیں کر سکتی۔ درحقیقت وہ اپنی دنیا کی زندگی بھی خدا ہی کے سایہ میں گزارتے ہیں جب کہ خدا ناشناس لوگوں کی زندگیاں محض مادی مفاد کی طلب اور عارضی عیش و آرام کے سہارے بسر ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت آج نہیں تو کل مبرہن ہو کر رہے گی، چنانچہ فرمایا گیا کہ خدا قیامت کے روز ان لوگوں کو جو باہم خدا کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے رشتۂ محبت پر جڑے ہوئے تھے اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔ اس دن اس سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ جھوٹی عافیتیں اور پناہ گاہیں اس دن باقی نہ رہ سکیں گی۔ جھوٹے سہارے ٹوٹ چکے ہوں گے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ مَا رَأَيْتُ اَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ اَشَدَّ مِنْهُ قَالَ رَجُلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ الرَّجُلُ يُحِبُّ الرَّجُلَ عَلَى الْعَمَلِ مِنَ الْخَيْرِ يَعْمَلُ بِهٖ وَلَا يَعْمَلُ بِمِثْلِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے صحابہؓ کو کبھی اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا وہ اس پر خوش ہوئے۔ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! ایک شخص ایک آدمی سے اس کے نیک عمل کی وجہ سے محبت کرتا ہے اگرچہ وہ خود اس جیسا عمل نہیں کرتا۔ آپؐ نے فرمایا: ”آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے۔“

تشریح: زندگی کی بنیادی قدروں میں سے ہر ایک قدر کو اتنی جامع و وسیع حقیقت کی حیثیت حاصل کہ اسے دین کا عنوان قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعہ سے دین کی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ فکر کی بلند ترین سطح پر سارے اقدارِ حیات باہم شیر و شکر کی طرح مل کر اس طرح ایک ہو جاتے ہیں کہ ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

محبت زندگی کی ایک اہم قدر (Value) اور ایک اہم جذبہ ہے۔ دین نے اسے بنیادی اہمیت دی ہے۔ اسلام کے بارے میں جو لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہیں یا جو کسی وجہ سے اس

سے دشمنی کا رویّہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک سخت گیر مذہب ہے۔ کاش وہ سمجھ سکتے کہ کتنی غلط بات ان کی زبان سے نکل رہی ہے۔ اسلام تو فی الواقع محبت کا مذہب (The religion of love) ہے۔ اسلام اور اس کے عقائد ونظریات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زندگی کے حقائق (Facts) کو سمجھے۔ اسلام زندگی کی حقیقتوں سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام کو ہدایت سے تعبیر کیا ہے۔ توحید اور آخرت کے نظریہ کو لیجیے، دونوں ہی کا زندگی کے ان حقائق سے گہرا تعلق ہے جن سے صرفِ نظر کرنا اندھاپن اور گم راہی ہے۔ مخالفِ اسلام نظریات کو اسی لیے ضلالت کہا گیا ہے کہ ان میں زندگی کی حقیقتیں نظر انداز ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آخرت میں دوسری کوئی چیز نہیں، زندگی ہی کے حقائق روشن ہوں گے۔ جس طرح آپ آم کا درخت لگاتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب آپ کا لگایا ہوا یہ درخت پھل دینے لگتا ہے۔ پھل دینے سے پہلے بھی اس سے آپ کو شادابی اور سایہ وغیرہ حاصل ہوتا ہے لیکن وقت آنے پر اس کے علاوہ آپ کو میٹھے پھل بھی دینے لگتا ہے اور اس درخت کے اندر جو امکانات موجود رہے ہیں وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس موجودہ زندگی میں جو امکانات پائے جاتے ہیں ان سے ہم اس دنیا میں بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ زندگی کے امکانات مکمل طور پر ظاہر ہو سکیں گے اور آدمی لازوال نعمتوں سے بہرہ مند ہوگا۔ غرضیکہ آخرت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کائنات اور موجودہ زندگی سے مطابقت نہ رکھتی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت موجودہ زندگی کے امکانات ہی کا کامل اظہار ہے۔

محبت موجودہ زندگی کی ایک معلوم ومعروف شے ہے۔ اس کے اثرات کا دائرہ دونوں جہان کو وسیع ہے۔ مومن کی زندگی میں محبت کے جذبہ کی بڑی قدر وقیمت ہے۔ خدا خود اپنے نیک بندوں سے محبت فرماتا ہے۔ محبت کا جذبہ بڑا مستحکم اور پاکیزہ ہوتا ہے۔ محبت کو ساری کدورتوں اور کثافتوں سے دل کو پاک کرنے کی قوت حاصل ہے۔ خدا کی ذات محبوب ذات ہے۔ اس کی اگر کسی کو پہچان ہو جائے تو وہ لازماً اس سے محبت رکھے گا اور طاعت وبندگی میں سرگرم نظر آئے گا۔ خدا کی راہ میں جدوجہد کرنے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہ سکتا۔ خدا سے محبت کرنے والوں کے باہمی تعلقات میں بھی محبت کی کارفرمائی ہوگی۔ وہ باہم ایک دوسرے کے دین وایمان اور جان ومال کے بھی محافظ ثابت ہوں گے۔

دوستی اور محبت اس دنیا کی زندگی کی بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ جس کا کوئی دوست نہ ہو اس کی زندگی بے کیف و بے رنگ ہوگی۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سلمہ بن اکوع کو چمڑے کی ایک ڈھال عنایت فرمائی تھی۔ انھوں نے اسے کسی شخص کو دے دیا۔ حضور ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا سلمہ تیری ڈھال کہاں ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اپنے دوست کو دے دی۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: اِنَّکَ کَالَّذِیْ قَالَ الْاَوَّلَ اَللّٰھُمَّ ابْغِنِیْ حَبِیْبًا ھُوَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ (مسلم) ''تم تو اس شخص کی طرح ہو پہلے جس نے کہا تھا، خدایا تو مجھے ایسا دوست دے جو مجھے میری جان سے پیارا ہو۔''

محبت بہ ذات خود بھی نعمت ہے۔ یہ بہ ذات خود زندگی کو مطلوب ہے۔ محبت وہ نور ہے جس سے خدا کی پہچان ہوتی ہے۔ محبت نور ہے، محبت علم ہے۔

نیک شخص کا حق ہے کہ ہم اس سے محبت کا تعلق رکھیں۔ اس کے ذریعہ سے ہمیں اس کی رفاقت حاصل ہوسکتی ہے اس لیے کہ جذبۂ محبت وہ جذبہ ہے جس کی قدر و قیمت بہ ہر صورت باقی رہتی ہے۔ اگر خدا کے وفادار بندوں سے ہم سچی محبت رکھتے ہیں تو کام یابی کا سرا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ سچی محبت کا ثبوت کبھی محض جذبۂ دل ہی فراہم کر دیتا ہے اور کبھی جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ کثیر دولت صرف کر دینے کے بعد بھی محبت متحقق نہیں ہوتی۔ خدا اصلاً ہمارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

(۷) وَ عَنْ زَیْدِ الْخَیْرِؓ قَالَ: قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لِتُخْبِرْنِیْ مَا عَلَامَۃُ اللّٰہِ فِیْمَنْ یُّرِیْدُہٗ وَمَا عَلَامَتُہٗ فِیْمَنْ لَّا یُرِیْدُہٗ فَقَالَ: کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا زَیْدُ؟ قُلْتُ: اُحِبُّ الْخَیْرَ وَ اَھْلَہٗ وَ اِنْ قَدَرْتُ عَلَیْہِ بَادَرْتُ اِلَیْہِ وَ اِنْ فَاتَنِیْ حَزِنْتُ عَلَیْہِ وَ حَنَنْتُ اِلَیْہِ فَقَالَ ﷺ: فَتِلْکَ عَلَامَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی فِیْمَنْ یُّرِیْدُہٗ وَلَوْ اَرَادَکَ لِغَیْرِھَا لَھَیَّأَکَ لَھَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت زید خیرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اس شخص میں خدا کی کیا نشانی ہے جس کو وہ چاہے اور جس کو وہ نہ چاہے اس میں اس کی کیا علامت ہے؟ فرمایا: ''اے زید! تم نے کس حال میں صبح کی؟'' میں نے عرض کیا کہ اس حالت میں کہ نیکی اور نیکی کرنے والوں سے مجھے محبت ہے اور اگر میں نیکی پر قادر ہوں تو اسے جلد کرتا ہوں اور اگر نیکی فوت ہوجائے تو غمگین ہوجاتا ہوں اور رو پڑتا ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''یہی

اللہ تعالیٰ کی نشانی اس شخص میں ہے جس کو وہ چاہتا ہے اور اگر وہ تیرے لیے کسی اور چیز کا ارادہ فرمالیتا تو تجھے اُس کے لیے مستعد کردیتا۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا کے یہاں مقبولیت کی علامت یہ ہے کہ آدمی کو خیر اور اہل خیر، نیکی اور نیکی اختیار کرنے والوں سے محبت ہو۔ قدرت ہو تو نیکی سے باز نہ آئے بلکہ نیکی اور بھلائی کے کاموں کی طرف لپک پڑے اور اگر خدانخواستہ نیکی فوت ہوجائے تو یہ چیز اسے غمگین اور افسردہ کردے۔ نیکی سے کسی کی رغبت اس بات کی واضح علامت ہے کہ خدا اسے چاہتا ہے اور اگر آدمی بہ جائے بھلائی اور خیر کے کسی اور چیز کے لیے مستعدی دکھا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کا مقبول بندہ نہیں ہے۔ اسی لیے خدا نے اسے دوسرے کاموں کے لیے چھوڑ دیا۔ قرآن میں ہے: وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰیO وَ کَذَّبَ بِالْحُسْنٰیO فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰیO (الیل:۸-۱۰) "رہا وہ شخص جس نے بخل کیا اور بے نیازی برتی اور خوشتر کو جھٹلا دیا، اسے ہم مشکل اور سختی میں ڈالنے والی شے کا اہل بننے کی ڈھیل دے دیں گے۔"

〈۸〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ثَلَاثٌ مَّنْ کُنَّ فِیْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْاِیْمَانِ: اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَ اَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ، وَ اَنْ یَّکْرَهَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ، کَمَا یَکْرَهُ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں اسے ایمان کی لذت اور اس کا لطف حاصل ہوگا۔ یہ کہ خدا اور اس کا رسول تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں اور یہ کہ کسی شخص سے اسے محبت ہو تو یہ محبت محض اللہ کے لیے ہو اور یہ کہ وہ کفر کی طرف پلٹنے کو جب کہ اللہ نے اسے اس سے نکال لیا ہو، ایسا برا سمجھے جیسا کہ اس کو برا سمجھتا ہے کہ اسے آگ میں پھینک دیا جائے۔"

تشریح: معلوم ہوا کہ ایمان ایک لذیذ اور وجد انگیز شے ہے لیکن اس کی لذت سے آشنا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس چیز کی حقیقت کو سمجھ سکے جس پر وہ ایمان رکھتا ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی لذت بخشی اور پرکیف ہونے کا اصل راز جذبۂ محبت ہے۔ جب آدمی کے فکر و خیالات اور اس کی زندگی کے تمام امور میں محبت ایک کارفرما

قوت کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے تو اس وقت اسے اس حلاوت اور لذت سے آشنا ہونے میں دیر نہیں لگتی جس کی خبر اس حدیث میں دی گئی ہے۔

جس حقیقت کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اس کا ذکر اس مشہور حدیث میں بھی ملتا ہے۔ذَاقَ طَعْمَ الْإِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلاً (مسلم) ''ایمان کا مزہ چکھ لیا اس شخص نے جو اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمدؐ کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مخلوق و مربوب ہے۔اس کی زندگی کی تکمیل کا تصوّر بھی ہم رب کے بغیر نہیں کر سکتے۔ انسان اپنی مادی، نفسیاتی اور روحانی ہر طرح کی حاجت اور ضرورت کے لیے اپنے رب کا محتاج ہے۔ خدا کا قانونِ ربوبیت ہمارے لیے سب سے بڑی نوازش ہے۔حقیقت آشنا ہے وہ شخص جو خدا کے قانون ربوبیت پر شاداں وفرحاں ہے۔

آدمی کا دین اسلام ہو، یہ خدا کو رب ماننے کا فطری تقاضا ہے۔اس لیے کہ اسلام کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی ربوبیت یعنی اس کی کارفرمائی وکارسازی سے اپنے کو الگ نہ رکھ کر بالکلیہ اپنے کو خدا کے حوالے کر دے۔ یہ حوالگی وسپردگی زندگی کو ایک خاص ڈھب (Pattern) میں ڈھال دیتی ہے۔اصطلاح میں اسی کا نام اسلام ہے۔اس لیے اسلام کو بہ طور دین اور طریقِ زندگی کے اختیار کرنا ہی انسان کی اصل فطرت ہے۔اپنی فطرت کے مطالبے کو پورا کر کے ہی آدمی اس لذت وحلاوت کو حاصل کر سکتا ہے جس کی طلب ہر ایک دل میں رکھی گئی ہے۔حقیقت میں ایمان سے فیض یاب اسی شخص کو کہیں گے جس کی زندگی فطرت کے اس مطالبہ کی تکمیل کے مترادف ہو۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے نمائندے اور اس کے رسول ہیں۔آپؐ کی دعوت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان اپنی فطرت سے واقف ہو اور اس کے اصل مطالبہ کو پورا کرنے کی طرف سے غافل نہ ہو۔ ایسے رسول کی رہ نمائی کو تسلیم کرنے سے ظاہر ہے انسان کے لیے بے انتہا خوشیوں اور لامحدود مسرتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔آپؐ کی رسالت کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں کہ انسان کے حصے میں وہ مسرتیں آسکیں جو ہر حق شناس شخص کے لیے مقدر ہیں۔

اس طرح یہ بہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ ایمان ان تین صداقتوں کے مانے بغیر جن کا ذکر

اوپر کیا گیا ہے بے روح اور بے ثمر رہتا ہے اور انسان کی زندگی بے ثمر اور المیہ (Tragedy) بن کر رہ جاتی ہے۔

غیرت

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰهَ یَغَارُ وَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَغَارُ وَ غَیْرَةُ اللّٰهِ اَنْ لَّا یَأْتِیَ الْمُؤْمِنُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ غیرت مند ہے اور مومن بھی غیرت مند ہوتا ہے۔ اور اللہ کی غیرت کا مقتضا یہ ہے کہ مومن اس کام کو نہ کرے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔''

تشریح: خدا نے انسان کو عزت و عظمت بخشی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اس عزت کی قدر و قیمت کو پہچانے اور اسے کسی طرح بھی مجروح نہ ہونے دے۔ انسان کے اندر غیرت کا جذبہ اسی عزت کی محافظت کے لیے رکھا گیا ہے۔ جن امور کے ارتکاب سے آدمی کی عزت مجروح ہوتی ہے خدا نے ان کو اس کے لیے حرام قرار دیا ہے۔ خدا صرف یہی نہیں چاہتا کہ انسان کے وجود کی محافظت ہو بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی عزت پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔ یہ خدا کا انتہا درجہ کا فضل و احسان ہے۔ مثلاً خدا نے شرک اور زنا کو حرام ٹھہرایا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں ہی چیزیں انسان کی عزتِ نفس اور اس کے وقار کے خلاف ہیں۔ جس طرح بدکاری اور زنا ایک ذلیل حرکت ہے ٹھیک اسی طرح شرک بھی انسان کے لیے ایک فحش اور شرم ناک کام ہے۔ جس طرح زنا سے انسان کا وقار، اس کی شرافت، اس کی پاک بازی باقی نہیں رہتی ٹھیک اسی طرح سے شرک بھی آدمی سے اس کی عزت چھین لیتا ہے اور اس کی حیثیت ایک آوارہ اور بے آبرو شخص سے زیادہ نہیں رہتی۔ قرآن نے سورۃ النور میں شرک اور زنا کو ایک ساتھ بیان کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ شرک اور زنا میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ انسان کے لیے دونوں میں یکساں قباحت پائی جاتی ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خدا کا اپنے بندوں سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا ہے کہ بندے ان کاموں میں ملوث ہوں

جو اس کی اپنی عظمت و رفعت کے شایانِ شان نہیں۔ اسے بندے کی رسوائی اور تذلیل گوارا نہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ الْمُغِیْرَةِ قَالَ: قَالَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ: لَوْ رَأَیْتُ رَجُلاً مَّعَ اِمْرَأَتِیْ لَضَرَبْتُهٗ بِالسَّیْفِ غَیْرَ مُصْفَحٍ فَبَلَغَ ذٰلِکَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اَتَعْجَبُوْنَ مِنْ غَیْرَةِ سَعْدٍ وَّاللّٰهِ لَاَنَا اَغْیَرُ مِنْهُ وَاللّٰهُ اَغْیَرُ مِنِّیْ وَ مِنْ اَجْلِ غَیْرَةِ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلاَ اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَیْهِ الْعُذْرُ مِنَ اللّٰهِ وَ مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ بَعَثَ الْمُنْذِرِیْنَ وَالْمُبَشِّرِیْنَ وَلاَ اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَیْهِ الْمِدْحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَمِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ وَعَدَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ نے فرمایا کہ اگر میں کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھوں تو لازماً میں اس پر تلوار سے وار کروں۔ تلوار کے چوڑے پہلو سے نہیں (بلکہ دھار کی طرف سے)۔ رسولِ خدا ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا سعد کی غیرت پر تمھیں تعجب ہے، بہ خدا میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے بڑھ کر غیور ہے۔ اور یہ اللہ کی غیرت ہی ہے جس کی وجہ سے اللہ نے کھلے اور چھپے تمام ہی بے حیائی کے کاموں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کوئی ازالۂ عذر کو پسند کرنے والا نہیں اسی لیے اس نے متنبہ کرنے والے اور بشارت دینے والے (پیغمبر) بھیجے اور اللہ سے بڑھ کر کسی کو تعریف بھی پسند نہیں ہو سکتی اسی لیے خدا نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔''

تشریح: اصل میں یہاں لفظ عذر آیا ہے۔ نووی کے نزدیک عذر یہاں اعذار یعنی ازالۂ عذر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ خدا نے نبیوں اور رسولوں کو دنیا میں نذیر و بشیر بنا کر اسی لیے بھیجا تاکہ کوئی شخص یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ اسے تو حقیقتِ حال کی خبر ہی نہ تھی۔ قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے: رُسُلاً مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلاَّ یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَ کَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًاo (النساء:۱۶۵) ''رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے، اللہ تو ہے ہی زبردست، نہایت حکمت والا۔''

اللہ تمام تر حسن و خوبی کا مالک ہے۔ انسان کے فکر و شعور کی ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ

اسے خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو۔ یہ بڑی بدبختی کی بات ہوگی کہ آدمی دنیا میں ساری باتوں کے سلسلے میں واقفیت بہم پہنچائے لیکن اپنے رب کی صفات اور اس کے جمال و کمال سے بے خبر رہے۔ بندہ خدا کی حمد اور تعریف اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ اسے اپنے رب کی صحیح پہچان ہو۔ انسان کیا عقائد و نظریات رکھے اور وہ اپنی زندگی میں کون سا طرزِ عمل اختیار کرے، اس سلسلے میں خدا نے جو رہ نمائی فرمائی ہے وہ اس کا سب سے واضح ثبوت ہے کہ خدا کی ذات قابلِ حمد و ستائش ہے۔ اب اگر کوئی شخص خدا کی نافرمانی اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ زندگی کے لیے ایسے احکام کا طالب ہے جو وہی دے سکتا ہے جو ہماری تعریف کا مستحق نہیں، مثلاً شرک، جہل، رذالت اور پستی کی تعلیم تو خدا دینے سے رہا۔ اس طرح کی تعلیم تو شیطان ہی کی ہوسکتی ہے جو مردود اور قابلِ نفریں ہے۔

حیا و شرم

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضؓ مَرَّ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم عَلٰی رَجُلٍ وَّ هُوَ یُعَاتِبُ فِی الْحَیَآءِ یَقُوْلُ: اِنَّکَ لَتَسْتَحْیِیْ حَتّٰی کَاَنَّهٗ یَقُوْلُ قَدْ اَضَرَّ بِکَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: دَعْهُ فَاِنَّ الْحَیَآءَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے، وہ حیا کے سلسلے میں عتاب کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تم اس قدر حیا کرتے ہو کہ اس سے تمھیں نقصان پہنچے گا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسے چھوڑ دو، اس لیے کہ حیا ایمان کا ایک جزو ہے۔“

تشریح: یعنی حیا اور شرم کرنے سے اسے منع نہ کرو۔ حیا تو ایک قابلِ قدر خلق و وصف اور ایمان کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کو دیکھ کر سلیم الطبع شخص سوچتا ہے کہ اسے اپنے خدا کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ یہی خدا کے احسانات کا فطری تقاضا ہے۔ لیکن اس فطری تقاضے کو اکثر انسان بھول جاتا ہے۔ انسان کو کفرانِ نعمت سے باز رکھنے والی کئی چیزیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً خدا کے عتاب کا خوف، اس کی عنایات سے محروم ہوجانے کا اندیشہ وغیرہ۔ لیکن جس شخص کو نافرمانی اور ناشکری کی روش اختیار کرتے ہوئے حیا اور شرم دامن گیر ہوتی ہے کہ خدا کے احسانات کے صلہ میں وہ اس کی ناشکری کیسے کرے، اس شخص کی پاک طینتی اور نفیس الطبعی کی

جتنی بھی تحسین اور تعریف کی جائے کم ہے۔ حیا خدا سے اس کے ایسے تعلق کا مظہر ہے جو قابلِ قدر اور نہایت کیف آگیں ہے۔

اس حدیث میں حیا کو ایمان کا جزو کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان جملہ محاسن کا جامع عنوان ہے۔ ایمان دراصل توحید کے اقرار کا نام ہے۔ نظریۂ توحید کا زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر اثر پڑتا ہے۔ زندگی کی کسی چیز کو بھی توحید سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اپنی پوری زندگی سے اور اپنی پوری زندگی میں جس نے خدا کو پہچانا اسی نے خدا کو زیادہ پہچانا۔ ہماری پوری زندگی میں خدا ہمارے ساتھ ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی پوری زندگی کے ذریعہ سے اس کا اظہار کرنا چاہیے کہ ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ بہار کا اثبات ہر رنگ میں ضروری ہے۔

In all thy ways acknowledge Him.

ہماری زندگی کے ہر اسلوب اور ہر طریقہ سے ہماری ایمانی کیفیت کا اظہار ہو، ٹھیک اسی طرح جس طرح روح انسانی اپنے کو زندگی کے مختلف اسالیب میں ظاہر کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم خدا کو اپنی پوری زندگی کے ذریعہ سے قبول کریں۔ ہمارے پاس خدا کو جاننے کا ذریعہ زندگی ہی ہے۔ اور یہ اقرب ذریعہ ہے۔ سجدہ کی طرح ہماری زندگی خدا کے قرب کا ذریعہ بلکہ عین قرب ہو سکتی ہے۔ اور قرب ہمارے وجود وحیات کا جزو بن سکتا ہے۔ یہ بات کتنی وجد آفریں ہے۔

ایمان کا تعلق ہماری پوری زندگی اور اس کی سرگرمیوں سے ہے۔ یہ ایمان مومن کی زندگی میں جملہ محاسن کا ایک جامع عنوان قرار پاتا ہے۔ جنت خوبیوں اور محاسن ہی کا سرچشمہ اور مخزن ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں اور جس شکل میں کوئی خوبی نظر آتی ہے اس کا رشتہ اور تعلق جنت ہی سے ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّةِ (حدیث) ''ایمان کا مقام جنت ہے۔''

خوبی یہ ہے کہ بدی کی راہ میں خود آدمی کی اپنی ذات روک بن جائے۔ اس کے بغیر بدی سے نفرت اور حقیقی بُعد پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مطلوب یہ ہے کہ آدمی کی ذات خود نیکی کے لیے محرک ہو۔ اس کے بغیر صحیح معنی میں انسان نیک کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔

حیا کا ایک تقاضا یہ ہے کہ ہم نگاہ کو بچائیں۔ جو شخص نگاہ کی حفاظت نہیں کرتا اس کا دل آوارہ ہو جاتا ہے۔ نگاہ کے ساتھ دل بھی لگا ہوتا ہے۔ غضّ بصر کی شریعت میں اسی لیے بڑی

تاکید آئی ہے۔ حیا تنہائی کی حالت میں بھی مطلوب ہے۔ اس لیے کہ کوئی اور نہیں تو خدا اس حالت میں بھی آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حسّاس طبیعتیں تو خود اپنے آپ سے بھی حیا کرتی ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّۃِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ’نبوت سابقہ کے کلام میں سے لوگوں نے جو کچھ پایا ہے اس میں سے ایک یہ ہے:‘ ’’جب تم نے شرم کو اٹھا کر رکھ دیا تو اب جو چاہو کرو۔‘‘

تشریح: انسانی معاشرے میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بگڑے سے بگڑے سماج میں بھی کتنی ہی ایسی نیک باتیں اور ضرب المثل مشہور ہیں جو حقیقت میں انبیائے سابقین کی تعلیمات کا بقایا ہیں لیکن ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی۔ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ یہ مقولہ کہ جب تم نے شرم اور حیا کو بالائے طاق رکھ دیا تو اب جو چاہو کرو (بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن) نبوتِ سابقہ کے کلام میں سے ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انبیائے سابقین کی تعلیمات میں بھی گہری بصیرت و حکمت اور نصیحت پائی جاتی تھی۔ اس مقولہ کی طرح اور بھی کتنے ہی اقوال لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں جن میں انبیاءؑ کی تعلیمات کے عکس دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حیا اور شرم کی تعلیم صرف نبی (ﷺ) ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ اس کو سابق انبیاء کے زمانے میں بھی بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ حیا درحقیقت ایک لطیف اندرونی تحریک ہے جو آدمی کو نازیبا اور خلافِ ادب کاموں سے باز رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس اندرونی کیفیت کی وجہ سے آدمی کی شخصیت میں بڑی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم (ﷺ) کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ آپ کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا والے تھے۔ حدیث میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں بھی آیا ہے کہ خدا کو اپنے بندہ سے اس بات پر شرم آتی ہے کہ جب اس کا بندہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھائے تو وہ ان کو خالی واپس کردے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

پیش نظر روایت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جس شخص کے اندر حیا نہیں ہے وہ جو برائی اور بدی کرے تھوڑا ہے۔ اس لیے کہ اصلاً جو چیز اسے برائی سے باز رکھنے والی تھی جب وہی جاتی رہی تو پھر کون سی چیز اللہ کی نافرمانی اور برے کاموں سے روک سکتی ہے۔ حیا ایک ذاتی وصف ہے۔ جس کے اندر یہ وصف موجود ہے وہ خود اپنے اندرون کے تقاضے سے بے حیائی کے کاموں سے بچے گا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے لیموں کا درخت زمین سے ان ہی اجزا کو لے گا جو اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کے موافق ہوں گے وہ دوسرے اجزاء کو چھوڑ دے گا۔ گنا اور شکر قند زمین سے ان اجزاء کو ایسی شکل میں لے گا کہ ان کے اندر شیرینی پیدا ہو سکے۔ اس کے برخلاف نیم کا درخت زمین سے ایسے اجزا کو اس صورت میں لے گا کہ اس کے اندر تلخی اور کڑواہٹ آسکے۔

(۳) وَ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اَلْحَيَآءُ لَا يَاْتِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ۔
(بخاری)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”حیا خیر ہی لاتی ہے۔“

تشریح: حیا اپنے نتیجہ کے لحاظ سے کسی نقصان اور شر کا موجب نہیں ہوتی۔ حیا سراپا خیر ہے۔ اَلْحَيَآءُ خَيْرٌ كُلُّهٗ (حدیث) بے شرمی اپنے انجام کے اعتبار سے سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ حیا کو چھوڑ کر آدمی سب سے پہلے خود اپنی شخصیت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس سے اس کا وقار اس درجہ مجروح ہوتا ہے کہ اس کی تلافی کا امکان بہت کم باقی رہتا ہے۔

(۴) وَ عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ بْنِ رُكَانَةَ يَرْفَعُهٗ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقٌ وَّ خُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَآءُ۔
(رواہ مالک مرسلا، ابن ماجہ، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت زید بن طلحہ بن رکانہ سے روایت ہے۔ وہ نقل کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہر دین کا ایک خُلق ہوتا ہے، اسلام کا خلق حیا ہے۔“

تشریح: مؤطا میں امام مالکؒ نے اس حدیث کو زید بن طلحہؒ سے روایت کیا ہے۔ زید بن طلحہ

تابعی ہیں ان تک یہ حدیث کس صحابی کے ذریعہ سے پہنچی۔ اس کا ذکر امام مالکؒ نے نہیں کیا۔ البتہ ابن ماجہ اور بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ اسے دو صحابیوں حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

کوئی بھی نظریۂ حیات یا طریقِ زندگی ہو لازماً اس کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوگا اور وہ ایک خاص ذوق کا ترجمان ہوگا۔ اسی مزاج، اسپرٹ اور ذوق کے اعتبار سے ہم اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسلام نفسیات کے معتبر اور نازک و لطیف تر حقائق پر مبنی دین ہے۔ حیا کو خلقِ اسلام کہا جا رہا ہے۔ یہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ معلوم ہوا کہ کامل مسلم وہی ہے جس کے اندر حیا ہو۔ جو خدا سے بھی حیا کرتا ہو، جس نے اسے وجود بخشا اور انسانوں سے بھی حیا کرتا ہو جن کے درمیان وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کو ان باتوں سے انقباض ہو جو فحش اور ناشائستہ ہوں۔ وہ خدا کے حقوق کا بھی نگراں ہو اور بندگانِ خدا کے حقوق کا بھی پاس و لحاظ رکھتا ہو۔

﴿۵﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ الْحَیَآءَ وَالْاِیْمَانَ قُرَنَآءُ جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حیا اور ایمان ساتھ ہی یکجا رہتے ہیں، جب ان میں کوئی ایک اٹھا لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔''

تشریح: جہاں چراغ ہوتا ہے اس کے ساتھ اس کی روشنی بھی ہوتی ہے۔ دونوں میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ چراغ تو نہ ہو مگر روشنی ہو، اسی طرح ہم اس کا بھی تصور نہیں کر سکتے کہ روشنی ہو مگر چراغ کے بغیر ہو۔ ٹھیک یہی حال ایمان اور حیا کا ہے۔ ایمان ہے تو اس کی صفت حیا بھی ہوگی۔ اور اگر آدمی کے اندر حیا نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس کا دل ایمان کی اعلیٰ صفات سے خالی ہے۔

ایک روایت میں فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ۔ کی جگہ پر یہ الفاظ آئے ہیں: فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُهُمَا تَبِعَهُ الْاٰخَرُ۔ ''جب ان میں سے کوئی ایک چھن جاتا ہے تو دوسرا بھی اس کے پیچھے چلا جاتا ہے۔''

اس حدیث میں ایک لفظ قرناء آیا ہے۔ یہ قرین کی جمع ہے۔ بعض نسخوں میں قرنا یعنی صیغۂ تثنیہ کے ساتھ آیا ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَاکَانَ الْفُحْشُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَهٗ وَمَا کَانَ الْحَیَآءُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَهٗ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''فحش اور بے حیائی کی بات جس چیز میں بھی پیدا ہو جائے وہ اسے لازماً عیب دار اور بدنما کر دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہو اسے خوش نما بنا دیتی ہے۔''

تشریح: یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جمالیاتی قدروں کا لحاظ عام نگاہ ہی میں نہیں بلکہ دینی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے۔ جس چیز میں خوش نمائی کے بہ جائے بدنمائی اور عیب ہو وہ چیز بے وقعت سمجھی جائے گی۔ حیا کا پاس و لحاظ درحقیقت جمالیاتی احساس کی قدر شناسی کے مترادف ہے۔

عفت و ضبطِ نفس

〈۱〉 عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ یَّضْمَنْ لِیْ مَا بَیْنَ لَحْیَیْهِ وَمَا رِجْلَیْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے دونوں جبڑوں اور اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیزوں کی ضمانت دے تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

تشریح: دونوں جبڑوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیزوں سے مراد زبان اور شرم گاہ ہے۔ ہماری عفت کا کیا حال ہے اور ہمارے اندر کتنا ضبطِ نفس ہے اس کا بہ خوبی اندازہ ان دو چیزوں سے کیا جا سکتا ہے۔

آدمی وہی بات کہے جو صحیح اور درست ہو اور جس کے کہنے کی ضرورت بھی ہو تو یہ اس کے قابل اعتماد شخص ہونے کا بین ثبوت ہوگا۔ زبان کے استعمال میں احتیاط اور ذمہ داری کا احساس آدمی کو کردار کے لحاظ سے اتنا بلند کر سکتا ہے اور اسے وہ وقار بخش سکتا ہے جس کا عام حالات میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن میں بھی ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًاۙ یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (الاحزاب: ۷۰-۷۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کا ڈر رکھو اور درست بات کہو، وہ تمھارے اعمال درست کر دے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا۔''

دوسری چیز جس کی حفاظت کی تاکید اس حدیث میں فرمائی گئی ہے وہ ہے شرم گاہ۔ جنسی جذبہ ایک ایسا قوی جذبہ ہے کہ اگر اس کے معاملہ میں انسان بے اعتدالی اور بے راہ روی کا شکار ہو جائے تو اس کے جو خطرناک نتائج بے حیائی، فحاشی، عریانیت وغیرہ کی شکل میں سامنے آتے ہیں ان سے ہر شخص واقف ہے۔ جنسی بے راہ روی پورے سماج کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ جنسی جذبہ جس کی حیثیت ایک بڑی نعمت کی ہے، جس پر انسانی نسل کی بقا کا دارومدار ہے، آوارگی اور بے راہ روی کی نذر ہو کر افراد، خاندان اور پورے معاشرے کے لیے ایک عذاب اور مصیبت کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے اس کی جو شہادتیں بہم پہنچائی ہیں وہ حد درجہ عبرت ناک ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ جَاعَ اَوِ احْتَاجَ فَكَتَمَهُ النَّاسَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَنْ يَّرْزُقَهُ رِزْقَ سَنَةٍ مِّنْ حَلَالٍ۔

(بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص بھوکا یا محتاج ہو اور اپنی حالت کو لوگوں سے چھپائے تو خدائے عزوجل پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے لیے حلال طریقے سے سال بھر کی روزی کا انتظام فرمادے۔''

تشریح: یعنی جو شخص بھوک اور تنگی کی تکالیف برداشت کر لیتا ہے لیکن اپنے کو ذلیل و رسوا ہونے نہیں دیتا تو اللہ لازماً عزت و آبرو کی محافظت میں اس کی مدد فرماتا ہے اور اس کے لیے رزق کا کوئی نہ کوئی سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن خدا کی مدد اسے اسی وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک اسے اپنی عزت کی قدر و قیمت اور حیا کا پاس ولحاظ ہوتا ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آدمی کے پاس سب سے قیمتی شے اس کی اپنی شخصیت ہے۔ اس کے مجروح ہونے کے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا۔ اپنے وقار کو مجروح کر کے لوگوں سے اگر کوئی مدد حاصل کرتا ہے تو یہ بڑے ہی گھاٹے کا سودا ہے۔ اس لیے کہ ایک بیش قیمت شے کھو کر اس نے جو چیز حاصل کی وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مثالی معاشرہ وہی ہو سکتا ہے

جس میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا لحاظ پایا جاتا ہو بلکہ وہ لوگوں کی عزت و آبرو اور ان کے وقار کی محافظت کا بھی ضامن ہو۔

〈۳〉 وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اپنے اس مومن بندے کو محبوب رکھتا ہے جو کہ محتاج، پارسا، عیال دار ہو۔''

تشریح: یعنی باوجود اس کے کہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہے، بال بچے بھی اس کے ساتھ ہیں جن کی کفالت بھی اسے کرنی ہوتی ہے اسے اپنی عفت و عزت و آبرو کا پورا خیال ہے۔ تنگی اور پریشانی میں گزر کرتا ہے لیکن نہ وہ حرام کمائی کی طرف لپکتا ہے اور نہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اپنے وقار کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ اللہ کو اپنے ایسے بندوں سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ وہ انھیں پسند فرماتا ہے۔

〈۴〉 وَ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ رَّضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ۔ (بیہقی)

ترجمہ: حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ سے تھوڑے رزق پر راضی ہو تو اللہ اس سے تھوڑے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔''

تشریح: خدا کے دیے ہوئے تھوڑے رزق پر راضی رہنا درحقیقت آدمی کی سلیم الطبعی کی ایک بڑی دلیل ہے۔ سلامتیِ طبع اتنا بڑا وصف ہے کہ اگر آدمی کے پاس بہ ظاہر اعمالِ نیک کی کثرت نہ بھی ہو تو اس سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن اگر یہ وصف مفقود ہو تو کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اصل قدر و قیمت سلیم قلب کی ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝

(الشعرآء: ۸۸-۸۹)

''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی صحیح سالم دل لے کر اللہ رب العزت کے پاس آیا۔''

یہ حدیث بہت خوب صورت ہے۔ یہاں موقع نہیں کہ اس کے ادبی محاسن کی طرف کچھ اشارے کیے جائیں۔ اہلِ ذوق اس کے ادبی حسن کو بہ خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔

〈۵〉 وَ عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عقل مند شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو تابع رکھے اور عمل مابعد موت کے لیے کرے۔ اور عاجز وہ شخص ہے کہ جو اپنے نفس کی خواہشات کا غلام ہو اور خدا سے تمنائیں رکھتا ہو۔“

تشریح: آدمی وہ طرزِ عمل اختیار کرے جو اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نافع ثابت ہو۔ یہی عقل کا تقاضا ہے۔ اس پہلو سے جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ آدمی کی تمام کامیابی کا راز اس بات میں ہے کہ وہ اپنے نفس کو گم راہ نہ ہونے دے۔ اس پر قابو رکھے اور عاجلہ پسندی کا شکار ہو جانے سے اسے بچائے۔ نگاہ میں وہ ہو جو معتبر ہو یعنی وہ حیات جاوداں جو موت کے بعد عطا ہونے والی ہے جسے کیف آگیں اور پر مسرت بنانے کے لیے ہمیں موجودہ حیات میں اعلیٰ کردار کا ثبوت دینا ہے۔ اگر ہم اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے تو موت کے بعد کی ہماری زندگی نہایت الم ناک اور ذلت آمیز ہوگی جس کا آج تصور کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو وہ شخص کتنا نادان اور ناکارہ ہے جو اللہ سے اپنی بڑی تمنائیں وابستہ رکھے لیکن اس سلسلے کی اپنی ذمہ داریوں کا اسے کوئی احساس نہ ہو۔ اپنی ساری توانائی اور دل چسپیاں نفسانی خواہشات کی تکمیل میں لگا رکھی ہو۔

زہد

〈۱〉 عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا اَنَا عَمِلْتُهٗ اَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَ اَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ: اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْ مَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسولؐ! مجھے ایسا کوئی عمل بتائیں کہ جب میں کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں؟“ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”دنیا کی طرف سے بے رغبتی اختیار کر لو تو

خدا تم سے محبت کرنے لگے گا اور جو کچھ جاہ وثروت لوگوں کے پاس ہے اس سے بے رغبتی و بے رخی اختیار کرلو، تو لوگ تم سے محبت کرنے لگ جائیں گے۔''

تشریح: خدا کسی سے محبت فرمائے اور اس کے ساتھ ہی وہ محبوب خلائق بھی ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک بہترین شخص ہے۔ حضور (ﷺ) کا بتایا ہوا عمل جس کو اختیار کرنے کے بعد کوئی شخص خدا اور اس کے بندوں کا محبوب بن جاتا ہے گہرے نفسیاتی حقائق پر مبنی ہے۔ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے کے بعد آدمی پورے طور پر خدا کے لیے فارغ ہو جاتا ہے۔ اس کی ساری دل چسپیاں خدا کے لیے خاص ہو جاتی ہیں۔ اس کے یہاں خدا کی محبت اور آخرت طلبی کا ایسا غلبہ ہوتا ہے جو اس کی زندگی کو بہتر اور بامعنی بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص خدا کا محبوب ہو جائے گا۔ جو خدا کا ہو گیا لازماً خدا بھی اس کا ہو جائے گا۔

اسی طرح آدمی جب لوگوں کی دولت وثروت اور ان کی دوسری چیزوں سے اپنے کو بے نیاز کرلیتا ہے اور لوگوں سے وہ کوئی امید اور لالچ نہیں رکھتا تو لوگوں کی نگاہوں میں اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اسے اپنے دلوں میں جگہ دیں۔ ایسا شخص لوگوں سے قطع تعلق نہیں کرتا لیکن وہ لوگوں سے ملتا ہے تو اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے نہیں بلکہ وہ اسے لوگوں کا ایک حق سمجھتا ہے۔ اس کے تعلقات حرص وہوس اور خود غرضی کے عوارض سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے خود ان ہی کے لیے ملتا ہے۔ لوگوں کی بھلائی اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یقیناً ایسا شخص بڑی عظمت حاصل کرلے گا۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور کشش پیدا ہو جائے گی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: قَالَ اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَ اَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْاَمَلُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اس امت کی سب سے پہلی درستی اور بہتری یقین وزہد ہے اور اس کا پہلا بگاڑ اور خرابی بخل اور امل (امید اور دراز آرزو) ہے۔''

تشریح: امت مسلمہ کی صلاح وفلاح اور کام یابی کا تمام تر انحصار جن چیزوں پر ہے ان میں یقین اور زہد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ خصوصی اوصاف ہیں جو اس امت کو دنیا کی دوسری

امتوں اور قوموں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس امت کو یقین کی قوت بخشی گئی ہے۔ جو چیزیں عام نگاہوں کو دکھائی دیتی ہیں ان سے کہیں زیادہ اس امت کا بھروسہ اور یقین اس پر ہوتا ہے جس کو عام نگاہیں نہیں دیکھتیں۔ اہل ایمان اس کا شعور رکھتے ہیں کہ سب سے بڑی طاقت خدا کی ہے۔ سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں جا سکتا۔ اس لیے اس کا اصل بھروسہ اپنی قوت پر نہیں خدا کی ذات پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o (آل عمران: ۲۶) ”کہو، اے بادشاہی کے مالک، تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بے شک تجھے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔“

اس امت کا دوسرا امتیازی وصف وہ ہے جسے اس حدیث میں زہد سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ زہد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بے حوصلہ نہ ہو، اپنی نگاہ کو بلند رکھے اور دنیا اور اس کی ناپائیدار لذتوں اور راحتوں کو اپنا مقصود نہ بنائے۔ یقین اور زہد کی صفت صحیح معنی میں اگر کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو اس کی طاقت اور قوت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔ وہ قوم مقصد کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کر سکتی۔ مقصد کے لیے جان و مال کو قربان کرنا اس کے لیے ایک آسان بات ہوگی۔

لیکن یہ بنیادی وصف اگر امت میں باقی نہ رہے تو پھر اسے پستی اور بگاڑ سے کوئی بھی چیز بچا نہیں سکتی۔ یقین کی قوت اور زہد کے وصف سے عاری ہو جانے کے بعد اس کے اندر بخل اور امل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ آدمی کو مال خرچ کرنے کے بہ جائے مال سمیٹنے کی فکر لاحق ہوگی۔ راہِ حق میں جان دینے کے بہ جائے وہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ جینے کا حریص ہوگا۔ اس کے حرص و آز کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ وہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے اور اس سے بہرہ مند ہونے کا آرزو مند ہوگا۔ وہ خدا کو بھول جائے گا۔ اس کی امیدیں دنیا ہی سے وابستہ ہو کر رہ جائیں گی۔ بخل و امل نے جہاں دلوں میں گھر کیا اہلِ ایمان اپنے مقامِ بلند سے گرتے ہی جائیں گے۔ کوئی چیز نہ ہوگی جو انھیں ان کے برے انجام سے بچا سکے۔

(۳) وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ الزَّھَادَۃُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ

الْحَلاَلِ وَلاَ بِاِضَاعَةِ الْمَالِ وَ لٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لاَّ تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ وَ اَنْ تَكُوْنَ فِيْ ثَوَابِ الْمُصِيْبَةِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِهَا اَرْغَبَ مِنْكَ فِيْهَا لَوْ اَنَّهَا اُبْقِيَتْ لَكَ۔ (ترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دنیا کے سلسلے میں زہد یہ نہیں ہے کہ حلال کو اپنے اوپر حرام کرلیا جائے اور مال کو ضائع کیا جائے بلکہ دنیا کے سلسلے میں زہد یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھوں میں ہو اس سے کہیں زیادہ اعتماد اور بھروسہ تمھیں اس پر ہو جو اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ کہ تمھیں جو ناخوش گواری اور تکلیف پیش آئے تو مصیبت کا ثواب تمھیں اتنا مرغوب ہو کہ تم اس کی خواہش کرو کہ کاش یہ مصیبت باقی رہے۔''

تشریح: اس حدیث میں زہد کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور زہد کے بارے میں ناواقف لوگوں کے خیال کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ آپؐ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ زہد کا اصل تعلق آدمی کے ذہن اور اس کے نقطۂ نظر سے ہے۔ زہد کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ آدمی اللہ کی ان نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی ان راحتوں کو اپنے اوپر حرام کرلے جن کو اس نے انسانوں کے لیے جائز کر رکھا ہے۔ مثلاً اچھا کھانا، پینا، آرام واستراحت اور شادی بیاہ وغیرہ، بلکہ زہد یہ ہے کہ آدمی دنیا اور دنیا کی ناپائیدار چیزوں پر بھروسہ نہ کرے۔ اس کے پیش نظر آخرت کا دائمی عیش وراحت اور خدا کا وہ انعام ہو جس کا اس سے اس کے رب نے وعدہ فرمایا ہے۔ اس کی نگاہ خدا کے غیر فانی غیبی خزانوں پر ہو۔ خدا کے فضل وکرم پر اسے یقین اور اعتماد ہو، دنیا میں وہ مصائب اور آزمائش کا خواہاں نہ ہو بلکہ خدا سے عافیت ہی طلب کرتا رہے لیکن اگر خدا کے حکم سے کوئی مصیبت اور تکلیف اسے پہنچ جائے تو اس مصیبت اور تکلیف کا جو اجر وثواب خدا کے یہاں اسے ملنے والا ہے اس کے مقابلے میں اس تکلیف ومصیبت کو وہ ہیچ سمجھے اور اس تکلیف ومصیبت کے نہ پہنچنے کے مقابلہ میں اس پر خدا کے یہاں ملنے والا اجر اسے کہیں زیادہ محبوب ہو۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِيْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَا زَهِدَ عَبْدٌ فِي الدُّنْيَا اِلاَّ اَنْبَتَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فِيْ قَلْبِهٖ وَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ وَ بَصَّرَهٗ عَيْبَ الدُّنْيَا وَدَاءَ هَا وَ دَوَائَهَا وَ اَخْرَجَهٗ مِنْهَا سَالِمًا اِلٰى دَارِ السَّلاَمِ۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خداﷺ نے فرمایا: ''جس بندے نے دنیا میں زہد اختیار کیا تو لازماً خدا نے اس کے دل میں حکمت پیدا کی اور اس کی زبان پر حکمت کے کلمات جاری کر دیے اور دنیا کا عیب اور اس کا روگ اس پر عیاں کر دیا اور اس کا علاج بھی اسے سجھا دیا اور پھر صحیح سالم اسے دنیا سے نکال کر دار السلام کی طرف لے گیا۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ زہد اختیار کرنے والا کوئی خسارہ کا سودا نہیں کرتا۔ آخرت میں تو اسے کامیابی حاصل ہی ہوگی جس کے پیشِ نظر اس نے دنیا کے عیش و تنعم کو ہیچ سمجھا، اس دنیا میں بھی ایسے شخص کے حصے میں خیر کثیر آتا ہے۔ زہد کی وجہ سے اس کے دل کی زمین حکمت و دانائی کا کشت زار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے دل میں خدا حکمت پیدا فرماتا ہے اور اس کی زبان سے جو کلمات ادا ہوتے ہیں وہ حکمت سے پُر ہوتے ہیں، اس کی باتیں سطحی اور عامیانہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ حکمت و معرفت کے نور سے منور ہوتی ہیں۔ خدا اس کو دنیا کے معائب اور اس کے روگوں اور اس کے فتنوں وغیرہ سے اسے آگاہ کر دیتا ہے اور اسے ایسی سمجھ اور بصیرت عطا فرماتا ہے کہ وہ ان خرابیوں اور فتنوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا اور اپنے آپ کو ان سے محفوظ و مامون رکھنے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر دارِ آخرت کی طرف کوچ کرتا ہے تو وہ ہر طرح کی آلائشوں اور گندگیوں اور خرابیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس کی فطرت صحیح سالم ہوتی ہے۔ وہ ایک تباہ شدہ انسان نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں بھی ہے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ؕ (الشعرآء: ۸۸-۸۹) ''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد ہی بجز اس کے کہ کوئی سالم دل لے کر خدا کے پاس آیا ہو۔''

استغنا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دولت مندی و تونگری کا تعلق مال و اسباب سے نہیں دولت مندی تو دل کی دولت مندی ہے۔''

تشریح: ہر شخص دنیا میں اصلاً جس چیز کی تلاش میں ہے وہ ہے سکون اور اطمینانِ قلب۔ کوئی اس کو

مال و اسبابِ دنیا میں پانے کی امید رکھتا ہے اور کسی کو اس کی تلاش شہرت اور ناموری میں ہے۔ ہر شخص اپنے سے بے خبر ہو کر مطلوب شے کو خارج میں ڈھونڈ رہا ہے، حالاں کہ اطمینانِ قلب کا راز درحقیقت خود اپنے کو پانے میں پوشیدہ ہے۔ کسی نے اگر دنیا کے سارے ساز و سامان حاصل کر لیے لیکن خود کو دریافت نہ کر سکا یا دنیوی مال و اسباب کی فراہمی میں خود کو گنوا بیٹھا تو اسے اطمینان قلب کی دولت ہرگز میسر نہیں آسکتی۔ جس کو اطمینانِ قلب حاصل ہے حقیقت میں غنی اور تونگر وہی ہے۔

آدمی کا اصل اور بڑا حصہ وہ ہے جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ بہت تھوڑا ہے اور اس کا قیام بھی اس کا مرہونِ منت ہے جو غیر مرئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے دل اور اندرون کو غنی بنائے۔ اگر وہ سوچتا ہے کہ ظاہری ساز و سامان کی فراہمی اسے آسودہ کر دے گی تو یہ اس کی بنیادی غلطی ہے۔ غنا اور آسودگی کا تعلق اصلاً دل سے ہے۔ اگر کسی نے اپنی ذات کو پہچان لیا اور خدا کی ہدایت کی روشنی میں اس کی تکمیل کی تو اس سے بڑھ کر تونگر دوسرا کوئی نہ ہوگا۔ اہلِ نظر حقیقت کو پا لیتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ انھیں جو آسودگی، اطمینان اور سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے عام حالات میں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''میری جنت میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں بھی رہوں گا میری جنت میرے ساتھ ہوگی۔'' اس جنت سے ان کی مراد دل کا استغنا اور حلاوت ایمان ہی ہے۔ جو دل کے غنی ہوتے ہیں ان کے مزاج میں انتہا درجہ کی سادگی آجاتی ہے۔ نہ وہ دنیوی مال و دولت کے بھوکے ہوتے ہیں اور نہ ان کو ان چیزوں کی آرزوئیں ستاتی ہیں جن کے پیچھے دنیا پرست لوگ دوڑتے رہتے ہیں۔ وہ حیات کے اس لطیف و نازک مزاج سے آشنا ہو جاتے ہیں جس سے بڑھ کر بیش قیمت کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ كَانَ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الْاٰخِرَةِ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِیْ قَلْبِهٖ وَ جَمَعَ لَهٗ شَمْلَهٗ وَ اَتَتْهُ الدُّنْيَا وَ هِیَ رَاغِمَةٌ وَّ مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهٗ طَلَبَ الدُّنْيَا جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَ شَقَّتْ عَلَيْهِ اَمْرُهٗ وَلَا يَاْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ۔ (ترمذی، احمد، دارمی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کی نیت (اعمال

میں) طلبِ آخرت کی ہو خدا اسے غنائے قلبی سے بہرہ مند فرماتا ہے اور انتشار کو دور کر کے اسے خاطر جمعی عطا فرماتا ہے۔ دنیا اس کے پاس آتی ہے اور وہ اس کے نزدیک ذلیل و بے وقعت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جس شخص کی نیت (اعمال میں) طلب دنیا کی ہو خدا افلاس کو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے۔ اس کے کام میں انتشار اور پریشانی ڈال دیتا ہے اور اس سب کے باوجود دنیا اسے بس اسی قدر ملتی ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتی ہے۔''

تشریح: استغناء کے سلسلے میں یہ ایک بڑی اہم حدیث ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ استغناء کی دولت اس وقت تک کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ دنیا میں طالبِ دنیا بننے کے بہ جائے آخرت کا طالب بن کر زندگی نہ گزارنے لگے۔ طلبِ آخرت دراصل ہماری تمام تر ذہنی و فکری پراگندگی اور پریشانیوں کا علاج ہے۔ طلبِ آخرت میں آدمی کو وہ سکون اور جمعیتِ خاطر میسر آتی ہے جس کا عام آدمی تصوّر کرنے سے بھی قاصر ہوتا ہے۔ دنیا جو زوال پذیر، محدود و مختصر شے ہے اس کا پرستار ہونا ذہنی سکون و راحت کو غارت کرنے کے مترادف ہے۔ طلب کی چیز آخرت ہی ہے۔ دنیا کے طالب کو ہمیشہ فقر و افلاس کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس کا معاملہ کبھی درست نہیں ہوتا۔ انتشار اور پریشانی ہی اس کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے پیشِ نظر ہمیشہ آخرت کو رکھتا ہے خدا اس کو نقد انعام عطا فرماتا ہے کہ اس کے قلب کو استغناء سے نواز دیتا ہے جو زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے۔

صاف سینہ

(۱) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يُبَلِّغُنِیْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِیْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَ اَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''میرے ساتھیوں میں سے کوئی شخص مجھ تک کسی کی کوئی بات نہ پہنچائے کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں تمھارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوسروں کی طرف سے اپنے سینے کو صاف رکھنا مطلوب و محمود ہے۔ سلامتی صدر کے لیے ضروری ہے کہ کسی کے متعلق غیر ضروری باتوں کے سننے سے

پرہیز کیا جائے۔ دل کی ساری نظافتوں اور پاکیزگیوں کے باوجود اس کے متاثر ہونے کا خدشہ باقی رہتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں ایسی باتوں کے جاننے کا شوق انتہائی ناپسندیدہ ہے جس سے دل میں بدگمانی یا کدورت کے پیدا ہونے کا امکان پایا جاتا ہو۔ البتہ وہ مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں جہاں شرعی ضرورت اور اپنی مصلحت متقاضی ہو کہ کسی کے بارے میں کچھ کہا یا سنا جائے۔

توکّل

⟨۱⟩ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَ تَرُوْحُ بِطَانًا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”اگر تم اللہ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمھیں اس طرح رزق دے جس طرح کہ وہ پرندوں کو دیتا ہے۔ وہ صبح کو بھوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔“

تشریح: اس حدیث کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کی یہ آیات بھی پیش نظر رہنی چاہئیں: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود:٦) ”زمین میں چلنے پھرنے والی جو مخلوق بھی ہے اس کی روزی اللہ کے ذمّہ ہے۔“ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ ۖ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (العنکبوت:٦٠) ”کتنے ہی چلنے والے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے ہوئے نہیں پھرتے اللہ ہی انھیں رزق دیتا ہے اور تمھیں بھی! وہ سب کچھ سنتا، جانتا ہے۔“

انجیل متیٰ میں حضرت مسیحؑ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: ”میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمھارا آسمانی باپ (خدا) ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح

بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی شان وشوکت کے ان میں سے کسی کے مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو تم کو کیوں نہیں پہنائے گا؟ اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیوں کہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں۔ اور تمھارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی کو تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو۔ کیوں کہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کرلے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے (۶:۲۵-۳۴) حضرت مسیحؑ کی اسی طرح کی ایک تقریر لوقا (۱۲:۲۲-۳۴) میں بھی ملتی ہے۔

اس حدیث، قرآن کی آیتوں اور حضرت مسیحؑ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے فرماں بردار بندوں کا ولی اور کارساز ہے۔ وہ ان کی سرپرستی فرماتا ہے۔ وہ ان کی ضروریات کو بہ خوبی سمجھتا ہے۔ وہ ان کو یتیموں کی طرح بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ دنیا میں ان کا حاجت روا ہے۔ مادی ضروریات کی کفالت ہی نہیں وہ تو اپنے وفاداروں کو ایسی حیات عطا کرتا ہے جو نہایت پاکیزہ اور خوشتر ہوتی ہے۔ نہ تو ان کی موجودہ زندگی تاریک ہوتی ہے اور نہ ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ وہ آگاہ راز ہوتے ہیں۔ ان کی اصل کمائی خدا پرستانہ پاکیزہ زندگی کا شعور ہوتا ہے۔ وہ رزق طیب وحلال کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن ان کا اصل بھروسہ اپنی کوشش پر نہیں بلکہ اپنے خدا پر ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ قَلْبَ ابْنِ اٰدَمَ بِكُلِّ وَادٍ شُعْبَةٌ فَمَنْ اَتْبَعَ قَلْبَهُ الشُّعَبَ كُلَّهَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ بِاَىِّ وَادٍ اَهْلَكَهٗ وَ مَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ كَفَاهُ الشُّعَبَ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کے دل کے لیے ہر وادی میں ایک شاخ اور گوشہ ہے اب جس شخص نے اپنے دل کو ان شاخوں کی طرف متوجہ رکھا تو خدا کو مطلق اس کی پروانہ ہوگی کہ کون سی وادی اسے تباہ وبرباد کرتی ہے۔ اور جو شخص خدا

پر توکل کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہوگا کہ اسے ان وادیوں میں بھٹکتے رہنے سے بچالے۔''

تشریح: آدمی کی اندھی خواہشات اسے ہر وادی میں لیے پھرتی ہیں۔ وہ ہر جگہ اپنے لیے کشش اور جاذبیت پاتا ہے۔ اب جو شخص ان خواہشات ہی کو اپنا رہ نما بنا کر ان کے پیچھے دوڑتا اور ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے خدا کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ ایسا شخص کہاں اور تباہی کے کس گڑھے میں دم توڑتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اپنی ضروریات اور آرزوؤں کے سلسلہ میں اپنے کو خواہشات کے حوالہ کرنے کے بہ جائے خدا کی ہدایات کو اپنا رہ نما بناتے ہیں تو خدا نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کو ہر طرح کی تباہی سے بچا لیتا ہے بلکہ وہ ان کو یکسوئی اور سکونِ قلب کی دولت سے بھی نوازتا ہے اور ان کی فطری ضروریات کی تکمیل کا سامان بھی فراہم فرماتا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَعْقِلُهَا وَ اَتَوَكَّلُ اَوْ اُطْلِقُهَا وَ اَتَوَكَّلُ؟ قَالَ: اِعْقِلْهَا وَ تَوَكَّلْ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں اونٹنی کو باندھ کر توکل اختیار کروں یا اسے چھوڑ کر توکل کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اسے باندھو، پھر توکل اختیار کرو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ توکل کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور اس انتظار میں رہے کہ اس کے لیے غیب سے سب سامان ہو جائے گا۔ آدمی کا فرض یہ ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے اسباب و وسائل کو کام میں لائے اور نتائج خدا کے حوالہ کر دے۔ یہی توکل ہے۔ دیتا خدا ہی ہے لیکن اس کے دینے میں پردہ داری کی ایک شان پائی جاتی ہے۔ پردہ داری کی اس سنت کا احترام ضروری ہے۔ آدمی وسائل کو اختیار کرے لیکن اصل بھروسہ اس کا خدا ہی پر ہو۔ توکل اصل میں اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو مومن بندے کو اپنے خدا سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے: وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ٥ (التوبہ:۵۱) ''اور اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے'' ایک اور جگہ فرمایا: وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ٥ (الانفال:۴۹) ''اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو یقیناً خدا زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔'' یعنی اس کے لیے بندے کا کام بنا دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔

جذبۂ اطاعت

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: قَالَ رَبُّکُمْ عَزَّوَجَلَّ لَوْ اَنَّ عَبِیْدِیْ اَطَاعُوْنِیْ لَاَسْقَیْتُھُمُ الْمَطَرَ بِالَّیْلِ وَاَطْلَعْتُ عَلَیْھِمُ الشَّمْسَ بِالنَّھَارِ وَلَمْ اُسْمِعْھُمْ صَوْتَ الرَّعْدِ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھارے رب عزوجل کا ارشاد ہے کہ ’’اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں ان پر رات کو مینھ برساؤں اور دن میں ان پر دھوپ نکالوں اور انھیں بجلی کی کڑک کی آواز نہ سناؤں۔‘‘

تشریح: یعنی جب رات میں وہ سو رہے ہوں گے ہم بارش برسائیں گے تاکہ وہ سکون سے سوئیں اور ان کی کھیتیاں سیراب ہوسکیں۔ بادل کی گرج اور کڑک سے بھی ان کو محفوظ رکھیں گے تاکہ انھیں خوف اور وحشت نہ ہو اور نہ انھیں کوئی نقصان پہنچے۔ دن کے وقت دھوپ کردیں گے تاکہ وہ اپنے کاموں میں مصروف ہوسکیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ طاعت و بندگی کی برکات دنیا کی زندگی میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ قرآن میں بھی ہے:

وَ لَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَ لٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ○

(الاعراف:۹۶)

’’اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو لازماً ہم ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتیں کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جھٹلایا، تو جو کچھ کمائی وہ کرتے تھے اس کے بدلے میں ہم نے انھیں پکڑ لیا۔‘‘

〈۲〉 وَ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ الْکَافِرَ اِذَا عَمِلَ حَسَنَۃً اُطْعِمَ بِھَا طُعْمَۃً مِّنَ الدُّنْیَا وَ اَمَّا الْمُؤْمِنُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَدَّخِرُ لَہٗ حَسَنَاتِہٖ فِی الْاٰخِرَۃِ وَ یُعْقِبُہٗ رِزْقًا فِی الدُّنْیَا عَلٰی طَاعَتِہٖ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’کافر جب نیک عمل اختیار کرتا ہے تو اس کی وجہ سے دنیا کی روزی اور خوراک میں اس کے لیے کچھ کشادگی

ہو جاتی ہے۔ رہا مومن شخص تو اللہ اس کی نیکیوں کو آخرت کی خاطر اس کے لیے جمع کر کے رکھتا ہے اور اس کے بعد دنیا میں بھی اس کی طاعت پر اسے روزی عطا کرتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کافر کے اگر کچھ نیک اعمال ہیں تو ان کا بدلہ اسے دنیا ہی میں چکا دیا جاتا ہے، آخرت میں اس کے حصے میں عذاب کے سوا اور کچھ نہیں آ سکتا۔ لیکن مومن کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا مردِ مومن کے نیک اعمال کو جمع کرتا رہتا ہے۔ آخرت میں وہ اسے ان کا اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مومن کی زندگی دنیا میں محرومی کی زندگی ہوتی ہے اور اس کی طاعت و بندگی کا اثر اور نتیجہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا۔ دنیا میں بھی طاعت و بندگی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ یہاں بھی خدا اس کی وجہ سے اسے رزق سے نوازتا ہے۔

قناعت

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ رُزِقَ كَفَافًا وَّ قَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا اٰتَاهُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: "فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہو گیا وہ شخص جس نے اسلام کو اختیار کیا، رزق بھی بہ قدرِ ضرورت اسے ملا اور خدا نے اسے اس پر قانع بھی بنا دیا جو کچھ اسے عطا کیا۔"

تشریح: اس سے بڑھ کر کامیابی اور فلاح کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص خدا کو اپنا معبود اور حاکم مان کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ خدا نے اسے بہ قدرِ ضرورت رزق بھی دیا اور اس کو اس پر قانع ہو جانے کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، حالاں کہ اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دین و ایمان کی خاطر اسے اپنی جان کی قربانی دینی پڑتی یا کم از کم اسے مصائب، بھوک اور اِفلاس کا شکار ہونا پڑتا۔ اگر وہ قناعت کی دولت سے بہرہ مند نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ رنج میں مبتلا ہو جاتا کہ اسے دولت کی فراوانی حاصل نہیں۔ مگر خدا کے دیے ہوئے رزق پر قانع ہونے کی وجہ سے اسے کوئی رنج و غم چھو نہیں سکتا۔ ایمان و اسلام کے بعد جس شخص کو قناعت کی دولت ملی ہو، اسے تو ایمان اور تسلیم و رضا کے جذبہ سے خالی انسان سراپا افلاس دکھائی دے گا خواہ وہ کتنے ہی بڑے خزانہ کا مالک کیوں نہ ہو۔

خوش ذوقی

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ فَقَالَ رَجُلٌ: اِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ اَنْ یَّکُوْنَ ثَوْبُہٗ حَسَنًا وَّ نَعْلُہٗ حَسَنًا۔ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ، اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی کبر ہوگا۔“ ایک شخص نے عرض کیا کہ آدمی چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو (کیا یہ بھی کبر میں داخل ہے؟) فرمایا: ”اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ کبر تو یہ ہے کہ حق کو باطل کیا جائے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔“

تشریح: یعنی اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات، افعال وغیرہ ہر اعتبار سے جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے اس لیے اچھے لباس اور اچھے پاپوش کی خواہش کبر نہیں ہے۔ اللہ تو چاہتا ہے کہ آدمی ہر معاملہ میں حسن و زیبائش کا خیال رکھے۔ بے ڈھنگا پن اور بدنمائی اسے کیوں کر پسند ہو سکتی ہے، البتہ لوگوں کو دکھانے اور ان پر فخر جتانے کے لیے اگر کوئی عمدہ لباس زیب تن کرتا ہے تو بلاشبہ یہ کبر کی بات ہوگی۔ آدمی اگر متکبر نہیں ہے تو لوگوں کے سامنے ہی نہیں، تنہائی میں بھی اسے آراستگی اور زیبائش کا خیال ہوگا۔ اگر عمدہ لباس پہننے اور عمدہ طریقے سے رہنے میں اپنی خوش ذوقی کے علاوہ کسی کے پیشِ نظر یہ بھی ہو کہ اس سے دوسروں کو بھی ایک طرح کی خوشی ہوگی تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ کوئی قرآن خوش آوازی کے ساتھ پڑھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا خوش ہوگا اور سننے والے لوگوں کے دلوں کو بھی اس سے راحت اور سرور حاصل ہوگا تو یہ ریا میں شامل نہ ہوگا۔

جمال حقیقت میں حسن کثیر کو کہتے ہیں۔ جمال کا تعلق ظاہر و باطن اور اخلاق و اعمال ہر ایک سے ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا ۚ لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْھَا تَاْکُلُوْنَ ۝

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَ٥

(النحل:۵-۶)

''رہے جانور، انھیں بھی اسی نے پیدا کیا ہے جس میں تمھارے گرمی حاصل کرنے کا سامان بھی ہے اور دوسرے کتنے ہی فائدے ہیں اور ان میں بعض کو تم کھاتے بھی ہو، ان میں تمھارے لیے جمال (ایک شان خوش نمائی) بھی ہے، جب کہ تم شام کے وقت انھیں لاتے اور جیسا کہ تم انھیں چرانے لے جاتے ہو۔''

ایک دوسرے مقام پر قرآن میں آیا ہے:

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ط (یوسف:۱۸)

''اس نے کہا: نہیں، بلکہ تمھارے جی نے بہکا کر تمھارے لیے ایک بات بنادی ہے۔ اب صبر ہی خوب تر ہے۔''

معلوم ہوا کہ صبر جو ایک اخلاقی چیز ہے جمال کا تعلق اس سے بھی ہے۔ اس طرح اور آیات بھی ہیں مثلاً:

''وَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا''٥ (المزمل:۱۰)

''اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو، اور خوب صورتی کے ساتھ انھیں چھوڑ دو۔''

وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ٥ (الحجر:۸۵)

''اور وہ قیامت کی گھڑی تو لازماً آنے والی ہے۔ پس تم خوب تر درگزر سے کام لو۔''

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا٥ (الاحزاب:۲۸)

''اے نبیؐ، اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو، تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر خوش اسلوبی سے رخصت کردوں۔''

یہ آیتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ صبر ہی میں نہیں، کسی سے الگ ہونے، درگزر سے کام لینے اور کسی کو رخصت کرنے میں بھی جمال پایا جاسکتا ہے۔ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام ہی امور میں جمالیاتی پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ جمال میں موزونیت، بوقلمونی، جامعیت، پاکیزگی، فرحت اور سرور انگیزی وسکون بخشی کی کیفیت، ٹھنڈک ـــــ سبھی کچھ موجود ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اسلام بے ذوقی، بے حسی اور خشک مزاجی کا دین ہرگز نہیں ہے، چنانچہ ہم

دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام خشک مزاج نہ تھے۔ وہ صحیح معنی میں زندگی کے قدر شناس تھے اور اپنی زندگی میں اسلامی تہذیب کا پورا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ روایت موجود ہے:

عَنْ قَتَادَةَ رضؓ قَالَ سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ هَلْ كَانَ اَصحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَضْحَكُوْنَ؟ قَالَ: نَعَمْ وَالْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ اَعْظَمُ مِنَ الْجَبَلِ وَ قَالَ بِلَالُ بْنِ سَعْدٍ اَدْرَكْتُهُمْ يَشْتَدُّوْنَ بَيْنَ الْاِعْرَاضِ وَ يَضْحَكُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ فَاِذَا كَانَ اللَّيْلُ كَانُوْا رُهْبَانًا۔ (شرح السنہ)

''حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ کیا رسولِ خدا ﷺ کے صحابہ ہنستے تھے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایمان ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی زیادہ بڑھ کر پُر عظمت تھا۔ بلال بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے انھیں تیروں کے نشانے پر دوڑتے دیکھا ہے اس حال میں کہ ان میں سے بعض لوگ بعض سے ہنسی مذاق کر رہے ہوتے تھے۔ پھر جب رات ہوتی تو وہ راہب بن جاتے تھے۔'' مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کی دی ہوئی خبروں پر اس طرح ایمان رکھتے تھے جیسے کسی نے سامنے کے پہاڑ کے وجود کو تسلیم کیا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ نمایاں اور پرعظمت چیز کا اقرار کیا ہو۔ وہ کوئی خشک مزاج لوگ نہ تھے۔ ان کے ایمان نے ان کی فطرت کو مصلوب ومجروح نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ایمان فطری انداز میں حاصل کیا تھا۔ ان کا ایمان مضمحل ہرگز نہ تھا۔ ایمان ان کا پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری تھا جس کا بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ دوڑتے اور باہم مسابقت بھی کرتے اور باہم ایک دوسرے سے ہنسی اور مزاح بھی فرماتے تھے۔ اس لیے کہ یہ اجتماعیت اور بود وباش کا تقاضا تھا۔ ان کی معاشرت مصنوعی قسم کی نہ تھی۔ فطری سادگی نے ان کے رہن سہن میں بلا کی دل کشی اور جاذبیت پیدا کردی تھی۔ لوگوں کے درمیان ہوتے تو خشک زاہد کی طرح نہیں بلکہ زندہ دل انسان کی طرح رہتے تھے۔ وہ ایمان میں اور اس طرح کی زندگی میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایمان مثل تخم کے تھا جس نے شاداب شجر زندگی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ سوکھے اور بے برگ وبار کا روپ ان کے ایمان نے نہیں اختیار کیا تھا جس میں نہ پھول کھلتے ہیں اور نہ کوئی خوش بو ہوتی ہے۔ جب رات آکر عالمِ ظاہر پر چھا جاتی، دنیا کی ساری چیزیں نگاہوں سے اوجھل ہوجاتیں، دوست واحباب اور رفقاء اپنے گھروں کی راہ لیتے اس وقت وہ محسوس کرتے کہ وہ ہستی جو سرچشمۂ ہست وبود ہے اب اس سے ہمارا سابقہ ہے تو ان

کی ساری توجہ فطری طور پر اسی کی ذات کی طرف مبذول ہوکر رہ جاتی اور وہ انتہا درجہ مودب ہوجاتے۔ خدا کا خوف اور خشیت ان کے دل میں ابھر آتی۔ وہ اپنے رکوع اور سجود سے اس کے آگے اظہارِ عبودیت کرتے اور اسے راضی کرنے کی فکر میں لگ جاتے۔

گویا کہ ہر موقعہ و محل کے تقاضوں کو وہ بہ خوبی سمجھتے تھے۔ یہی رسولِ خدا (ﷺ) کی سنت بھی تھی۔ آں حضرتؐ کے بارے میں آتا ہے کہ آپؐ اہلِ خانہ سے محوِ گفتگو ہوتے لیکن نماز کا وقت آتا تو آپؐ کا حال یہ ہوتا کہ گویا کسی کو پہچانتے ہی نہیں ہیں۔ مسجد میں نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی چیز خدا کی جناب میں حاضر ہونے سے آپؐ کو باز رہ سکے۔

طہارت و نظافت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ مَالِکِ الْاَشْعَرِیِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”پاکیزگی اور طہارت ایمان کا نصف حصہ ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ایمان سراپا پاکیزگی ہے۔ وہ پاکیزگیِ نفس کے نتیجہ میں حاصل ہوتا اور ٹھہرتا ہے۔ اس کا اظہار بھی ہمیشہ پاکیزگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایمان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن دونوں پاک ہوں۔ نہ ہمارا ظاہر گندہ اور ناپاک ہو اور نہ باطن۔ ہماری زندگی اپنے ظاہر اور باطن دونوں ہی پہلوؤں سے پاکیزگی کی حامل ہو۔ قرآن نے اہلِ شرک کو نجس اسی لحاظ سے کہا ہے کہ وہ خواہ بہ اعتبار ظاہر کتنے ہی پاک صاف رہنے کا اہتمام کرتے ہوں لیکن باطن ان کا ہمیشہ ناپاک رہتا ہے۔ (توبہ:۲۸)

ایک شخص اگر اپنے جسم، لباس، گھر، دروازہ وغیرہ سبھی کو صاف ستھرا رکھتا ہے تو گویا اس نے ایمان کے آدھے تقاضے پورے کر لیے۔ آدھا ایمان اس کے حصے میں آ گیا۔ اور اگر ظاہر کے ساتھ اس نے باطن کی صفائی اور ستھرائی کا بھی اہتمام کر رکھا ہے، وہ نہ تو شرک کے قریب جاتا ہے اور نہ کبھی اپنے دل کو خدا کی عظمت اور اس کے معبود و محبوب ہونے کے احساس سے خالی ہونے دیتا ہے، دل میں حسد، خود غرضی، کینہ، کبر وغیرہ رزائل کو بھی جگہ نہیں دیتا تو ایسی صورت میں

کہا جائے گا کہ ایمان کے باقی نصف تقاضوں کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں ہے۔ اسے نصف نہیں بلکہ پورا ایمان حاصل ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ مُعَاذٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِتَّقُوا الْمَلَاعِنَ الثَّلٰثَةَ الْبَرَازَ فِي الْمَوَارِدِ قَارِعَةِ الطَّرِيْقِ وَالظِّلِّ۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”تین لعنت کے کاموں سے بچو اور وہ یہ ہیں: رفع حاجت کرنا دریا کے گھاٹوں پر، راستے میں اور سایہ کی جگہ۔“

تشریح: یہ تینوں مقامات ایسے ہیں جہاں عام طور پر لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ان مقامات کو رفعِ حاجت کر کے گندہ کرنے سے لوگوں کو جو تکلیف ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ مخلوق خدا کو اذیت اور تکلیف پہنچانی انتہا درجہ کا کمینہ پن ہے۔ پھر ان مقامات پر رفعِ حاجت کے لیے بیٹھنا بے شرمی اور خود غرضی کی بات بھی ہے۔ اس سے ذوق طہارت کو گھن آتی ہے۔ ان مقامات (Public-place) پر رفع حاجت کرنے والے کو لعنت کا مستحق قرار دے کر متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ حرکت خدا کی نگاہ میں قابلِ نفرت اور حد درجہ معیوب ہے۔ اس سے باز رہنا چاہیے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ: كَانَتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْيُمْنٰى لِطُهُوْرِهٖ وَ طَعَامِهٖ وَ كَانَتْ يَدُهُ الْيُسْرٰى لِخَلَآئِهٖ وَمَا كَانَ مِنْ اَذًى۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دایاں ہاتھ وضو اور کھانا کھانے میں استعمال فرماتے تھے اور بائیں ہاتھ سے استنجا اور اس جیسے کاموں کو انجام دیتے تھے۔“

تشریح: یہ نظافت اور نفیس الطبعی کا تقاضا ہے کہ پاکیزہ امور دائیں ہاتھ سے انجام دیے جائیں۔ رہے دوسرے امور مثلاً پاخانہ سے فارغ ہو کر آبِ دست لینا، ناک کا فضلہ صاف کرنا وغیرہ بائیں ہاتھ سے انجام دیے جائیں۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ هَاتَيْنِ الشَّجَرَتَيْنِ يَعْنِي الْبَصَلَ وَالثُّوْمَ وَ قَالَ: مَنْ اَكَلَهَا فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَ قَالَ: اِنْ كُنْتُمْ لَا بُدَّ اٰكِلِيْهِمَا فَاَمِيْتُوْهُمَا طَبْخًا۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت معاویہ بن قرہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان

دونبات لہسن اور پیاز سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ”جو شخص ان کو کھائے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔“ اور آپؐ نے فرمایا: ”اگر ان کا کھانا ناگزیر ہو تو پکا کر ان کی بوٗ کو ختم کر دینا چاہیے۔“

تشریح: یہ نفاست اور پاکیزگی کا تقاضا ہے کہ جن چیزوں کی بو ناگوار ہو ان کے کھانے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ ایسی چیزیں کھا کر کسی مجلس یا مسجد میں تو ہرگز نہیں جانا چاہیے کیوں کہ اس سے دوسروں کی طبیعت مکدّر ہوگی اور انھیں سخت اذیت پہنچے گی۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام میں ستھرائی، پاکیزگی اور نفاست کا کس حد تک لحاظ رکھا گیا ہے یہاں تک کہ اجتماعی آداب میں بھی اسے شامل کر دیا گیا ہے۔

دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں رکھی گئی ہے اسی لیے فرمایا کہ اگر پیاز اور لہسن کا کھانا کسی وجہ سے ضروری اور ناگزیر ہو تو ان کو پکا کر کھائے تا کہ ان کی بو مر جائے۔

سلیم الطبعی

﴿۱﴾ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ رَّضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ، رَضِيَ اللّٰهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص خدا کے دیے ہوئے تھوڑے سے رزق پر راضی ہو جائے تو خدا بھی اس سے تھوڑے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔“

تشریح: خدا کے یہاں اصلاً جس چیز کی قدر و قیمت ہے وہ ہے بندے کی طبیعت کی سلامتی۔ اگر کسی شخص کی فطرت اور مزاج میں کجی اور ٹیڑھ ہے تو اس کے بڑے سے بڑے کارناموں کی بھی خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے لیکن آدمی اگر کسی قسم کے نفاق میں مبتلا نہیں ہے، نہ اس کے اندر کوئی کجی پائی جاتی ہے اور نہ اس کی طینت میں کوئی خرابی ہے تو وہ اپنے لیے سب سے بیش قیمت، راحت بخش اور وجد انگیز سرمایہ اس کو سمجھے گا کہ اللہ اس کا رب ہے۔ اس کے بعد زندگی میں دوسری چیزوں کی کمی و بیشی کی اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اگر کسی شخص کے اندر یہ بات پیدا ہوگئی تو سمجھ لیجیے کہ اسے قلب سلیم حاصل ہے۔ صحت مند دل اور قلب سلیم ہمیں حاصل ہے یا نہیں اس کی ایک ایسی پہچان اس حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے جس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

کسی شخص کو اگر دنیا میں قلیل رزق ملا اور وہ اس پر راضی رہا، کوئی شکایت اسے نہیں ہوئی تو یہ اس کی پاک طینتی اور سلیم الطبعی کا بین ثبوت ہے۔ اسے لازماً خدا کی خوش نودی حاصل ہوگی خواہ دنیا کی زندگی میں وہ بہت زیادہ عمل نہ کرسکا ہو۔ اس کے اندر ایک ایسا وصف پایا جاتا ہے جس سے ہر چیز کی تلافی ہوجاتی ہے۔ اس وصف اور خوبی سے اگر کوئی شخص محروم ہے تو اس کی تلافی کسی بھی عمل سے ممکن نہیں۔

خوشی ومسرت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَا الْاِیْمَانُ؟ قَالَ: اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَآءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَا الْاِثْمُ؟ قَالَ: اِذَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ شَیْءٌ فَدَعْہُ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''جب تجھے اپنی نیکی سے مسرت اور اپنے برے کام سے آزردگی اور ناخوشی ہو تو تو مومن ہے۔'' اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! گناہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جب کوئی چیز تیرے دل میں تردّد اور کھٹک پیدا کرے تو اسے چھوڑ دے۔''

تشریح: ایمان کی پہچان اور اس کی علامت کیا ہے؟ ہم کس طرح سمجھیں کہ ہمارا دل کیفیتِ ایمان سے خالی نہیں ہے۔

ایمان کی پہچان یہ ہے کہ نیکی کر کے تجھے خوشی کا احساس ہو۔ ایمان کا تعلق برائی سے نہیں نیکی سے ہوتا ہے۔ ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ آدمی زندگی میں نیک اعمال اختیار کرے، خود ایمان سکون بخش اور وجد آگیں شے ہے، وہ کوئی ناخوش گوار چیز نہیں۔ اس لیے جب ایمان کے تقاضے پورے ہوں گے تو آدمی کی خوشی اور مسرت میں اضافہ ہی ہوگا۔ اور اگر بہ تقاضائے بشریت تجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوگا تو لازماً تجھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور تو پچھتائے گا کہ کاش یہ گناہ مجھ سے نہ ہوا ہوتا۔ یہ رنج اور یہ پچھتاوا اس بات کی دلیل ہے کہ تیرے اندر ایمان کی قوت موجود ہے اس لیے لازماً تو تائب ہوگا اور تلافیِ مافات کی کوشش میں لگ جائے گا۔ آپؐ کے اس ارشاد سے ہم بہ خوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ خدا کے رسولؐ ہمیشہ عمل کی بات کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ

اپنے ایمان و یقین کا جائزہ لینے میں بھی ہم اپنے اعمال اور ان کے ان اثرات پر نظر ڈالیں جو ہمارے دلوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

گناہ کی اصل پہچان کیا ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو گناہ کی فطرت میں داخل ہے؟ تاکہ گناہوں سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے میں ہم کامیاب ہوسکیں۔

آپؐ کے اس ارشادِ مبارک سے معلوم ہوا کہ گناہ کی فطرت یہ ہے کہ اس سے دلوں کو طمانینت اور سکون حاصل نہیں ہوتا۔ دل اگر مومن ہے تو گناہ ہی نہیں اسے تو وہ چیز بھی کھٹکے گی جو گناہ کے مشابہ ہوگی یا جو آدمی کو گناہ اور برائی سے قریب کرنے کی موجب ہوسکتی ہو۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ ہے اور یہ ایک بہترین پالیسی ہوگی کہ آدمی ہر اس چیز سے جو دل میں تکدّر و تردّد و خلش پیدا کرنے والی ہو اس سے اجتناب کرے۔ اس طرح انشاء اللہ وہ ہر قسم کی برائی اور گناہ سے مامون و محفوظ رہے گا۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلٰی مَالاَ یُرِیْبُکَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِیْنَۃٌ وَ اِنَّ الْکَذِبَ رِیْبَۃٌ (احمد، ترمذی، نسائی) ’’اس چیز کو چھوڑ دے جو تجھے شک میں ڈالے اور اس چیز کی طرف توجہ کر جو تجھے کسی شک میں مبتلا نہ کرے۔ اس لیے کہ سچائی طمانینت ہے اور جھوٹ سراپا شک و تردد۔‘‘

آپؐ نے صاف الفاظ میں واضح فرمایا کہ حق کا امتیاز یہ ہے کہ وہ سکون و اطمینان کا باعث ہوتا ہے جب کہ باطل اور جھوٹ کو اختیار کرنے والا کبھی بھی ترددات اور شکوک و شبہات سے اپنے دامن کو چھڑا نہیں سکتا۔ حسن و قبح کے پہچاننے کا جو قاعدہ آپؐ نے بیان فرمایا ہے اس میں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ قاعدہ ان لوگوں کے لیے بیان فرمایا ہے جن کے قلوب تقویٰ کی صفت سے متصف ہوں۔

فکر و غم

(۱) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ نَزَلَ بِحُزْنٍ فَاِذَا قَرَأْتُمُوْہُ فَابْکُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا وَ تَغَنَّوْا بِہٖ فَمَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے سنا کہ ’’یہ قرآن حزن و غم کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ پس جب اس کی تلاوت کرو تو روؤ اور اگر رونا

نہ آئے تو بہ تکلف روؤ اور اسے خوش الحانی کے ساتھ پڑھو۔ جس شخص نے قرآن کو خوش الحانی کے ساتھ نہ پڑھا وہ ہم میں سے نہیں۔"

تشریح: قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا دل دردوغم کی کیفیات سے خالی نہ ہو۔ قرآن ہمارے اندر دردوغم کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شاید درد اور سوز وغم کے ذریعہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے وہی زیادہ معتبر اور موثر ہوتی ہے۔ حق کے پانے اور حقیقت کی یافت کی علامت یہ ہے کہ آدمی کی آنکھیں اشک بار ہو جائیں۔ بے تابی اور انتہائی غم ہی نہیں، انتہائی قرب و مسرت کے موقع پر بھی ہماری دلی کیفیت کا کسی حد تک اظہار اگر ممکن ہوتا ہے تو آنسوؤں اور چشم پُرنم کے ذریعہ سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: وَ اِذَا سَمِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَى الرَّسُوۡلِ تَرٰۤى اَعۡيُنَهُمۡ تَفِيۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَـقِّ‌ۚ (المائدہ: ۸۳) "جب وہ اس کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا ہے، تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگتی ہیں، اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔" ایک دوسری جگہ فرمایا ہے: اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ (مریم: ۵۸) "جب انھیں رحمان کی آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔"

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهٖۤ اِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ يَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا ۙ‏ وَّيَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ كَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا‏ ۝ وَيَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ يَبۡكُوۡنَ وَيَزِيۡدُهُمۡ خُشُوۡعًا ۩ (بنی اسرائیل: ۱۰۹-۱۰۷) "جن کو اس کے پہلے سے علم حاصل ہے انھیں تو جب یہ پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عظیم برتر ہے ہمارا رب! ہمارے رب کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے، اور وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں، اور یہ (قرآن) ان کے عجز و نیاز کو اور بڑھا دیتا ہے۔"

قرآن انسانیت کو نجات و فلاح و کامرانی سے ہم کنار کرنے کے لیے حق کی تبلیغ و اشاعت اور دینِ حق کے قیام کی جو ذمّہ داری اپنے حاملین پر ڈالتا ہے اسے صحیح معنی میں اس وقت تک ادا کرنا ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے دلوں میں انسانوں کے لیے انتہائی محبت نہ پائی جاتی ہو اور ہمیں ان کی فکر اور غم دامن گیر نہ ہو۔ اس اہم اور عظیم ذمّہ داری کو ادا کرنے میں ہم اسی

صورت میں کام یاب ہو سکتے ہیں جب کہ ہمارے قلوب خشیتِ الٰہی کی کیفیت سے معمور ہوں اور بندگانِ خدا کی نجات کی فکر نے دل کا چین اور آرام ہم سے چھین لیا ہو۔

گویا تلاوتِ قرآن پاک کے آداب میں سے یہ ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے ہمارے دل پگھلے ہوئے ہوں اور ہم پر گریہ طاری ہو۔ قرآن سے پورے طور پر فیض یاب ہونے کے لیے صرف تدبّر ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ رونا بھی ضروری ہے۔ رونا نہ آئے تو بہ تکلف روئے کیوں کہ یہ چیز بھی دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

قرآن کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھے۔ رِقّت کے ساتھ اور درد آمیز آواز میں اس کی تلاوت کرے۔ یہ قرآن کا ایک بڑا حق ہے۔ اس سے کلام کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ وہ شیریں سے شیریں تر ہو جاتا ہے۔ خشیتِ الٰہی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قرآن کو درد آمیز آواز میں پڑھا جائے۔ اس سے حضوری کی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے قلب کی قساوت اور سختی دور ہوتی ہے اور وہ نہایت نرم ہو جاتا ہے۔

اصل میں لفظ یَتَغَنَّ آیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ قرآن اسے لوگوں سے بے نیاز کر دے۔ قرآن جیسی نعمت پا کر بھی جن لوگوں کے قلوب غنی نہ ہو سکے وہ صحیح معنی میں حضور اکرم (ﷺ) کے طریقے پر نہیں ہیں۔ لیکن پہلے مفہوم کی تصدیق بعض دوسری واضح روایات سے ہوتی ہے مثلاً نبی اکرم (ﷺ) کا ارشاد ہے: زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ) ''زینت دو قرآن کو اپنی آوازوں سے'' دوسرے مفہوم کی تائید میں بھی حدیثیں لائی جاسکتی ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ وَّ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّهُمَا سَمِعَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: مَا یُصِیْبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ وَّصَبٍ وَّلَا نَصَبٍ وَّلَا سَقَمٍ وَّلَا حَزَنٍ حَتَّی الْهَمَّ یُهِمُّهٗٓ اِلَّا کُفِّرَ بِهٖ مِنْ سَیِّاٰتِهٖ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ''مومن کو جو تکلیف، تعب، بیماری اور رنج ہو یہاں تک کہ وہ فکر بھی جو اسے ہوتی ہے، لازماً اس کے سبب سے اس کی برائیاں اور گناہ مٹ جاتے ہیں۔''

تشریح: مومن کی کوئی چیز بھی رائگاں نہیں جاتی۔ اس کے اعلیٰ کردار اور اس کے نیک اعمال تو

موجب خیر و برکت اور باعث اجر وثواب ہوتے ہی ہیں وہ اپنی زندگی میں جن مصائب اور بیماریوں سے دو چار ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ فکر وغم اور پریشانیاں بھی جن سے دنیا میں ہر کس و ناکس کو سابقہ پیش آتا ہی ہے مومن کو ان سب سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کی وجہ سے خدا کتنی برائیوں کے اثرات اس کے دل سے زائل کر دیتا ہے اور ان کی وجہ سے وہ اس کے کتنے ہی گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ یہ امتیاز جو مومن کو حاصل ہے کوئی معمولی بات ہرگز نہیں ہے۔ اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل ایمان پر خدا کتنا مہربان ہے اور اس کی عنایتیں اور رحمتیں مومن پر کتنی زیادہ ہیں۔

ترکِ لایعنی

﴿۱﴾ عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ۔ (مؤطاء مالک، احمد)

ترجمہ: حضرت علی بن حسین روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے ہے اس کا اس چیز کو چھوڑ دینا جو بے فائدہ ہو۔“

تشریح: یہ صحیح حدیث ہے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں یہ حدیث مختلف راویوں سے مروی ہے۔ ابن ماجہ نے اسے ابوہریرہؓ سے اور ترمذی، بیہقی اور احمد نے علی بن حسین (حضرت زین العابدین) اور ابوہریرہؓ دونوں سے روایت کیا ہے۔ حاکم اسے ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی میں اسلام اپنے پورے حسن وکمال کے ساتھ داخل و شامل ہوگا وہ اسلام کی برکات سے پورے طور پر فیض یاب ہوگا۔ اسلام کا حسن اس کی زندگی کو بھی حسن و خوبی سے بھر دے گا۔ مثلاً ایسا شخص ایسی باتوں، ایسے کاموں اور ایسے افکار سے اپنے کو دور رکھے گا جن کا حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جو نہ دنیا کے لیے فائدہ مند ہیں اور نہ آخرت میں ان سے کوئی نفع پہنچنے والا ہے۔ ایسے شخص کی قوت اور اس کا وقت ان کاموں میں صرف ہوگا جو نیکی کے کام ہیں اور جن سے خدا کی خوش نودی اور اس کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ ایسا ہی شخص اپنے وقت اور قوت اور اپنے مال کو ضائع ہونے سے بچا سکتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اسے جو یک سوئی، سکون و طمانینت حاصل رہے گی اس کا اندازہ ان لوگوں کو نہیں ہوسکتا جن کی قوتیں لایعنی کاموں میں

ضائع ہوتی ہیں اور یہ لایعنی کام ان کے لیے ذہنی و قلبی انتشار کا سبب بنتے ہیں اور ان کے دل وحشتوں، حسرتوں اور ویرانیوں کی پناہ گاہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: تُوُفِّیَ رَجُلٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ فَقَالَ رَجُلٌ اَبْشِرْ بِالْجَنَّةِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَوَلاَ تَدْرِیْ فَلَعَلَّهٗ تَکَلَّمَ فِیْمَا لاَ یَعْنِیْهِ اَوْ بَخِلَ بِمَا لاَ یَنْقُصُهٗ۔

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا تو ایک شخص نے کہا کہ تجھے بشارت ہو جنت کی! اس پر رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”کیا کہہ رہا ہے جب کہ حقیقتِ حال سے تو واقف نہیں ہے۔ شاید اس نے لایعنی گفتگو کی ہو یا ایسی چیز میں بخل سے کام لیا ہو جو اس کے لیے باعثِ نقصان نہ تھی۔“

تشریح: مرنے والے صحابی کو مخاطب کر کے کہا تجھے جنت کی خوش خبری ہو۔ تو کتنا خوش بخت ہے، جنت تیری منتظر ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین و اخلاق کا معاملہ کس درجہ نازک ہے۔ کوئی شخص جرم عظیم کا مرتکب نہ بھی ہوا ہو اس کی لایعنی اور بے فائدہ گفتگو بھی جنت کے داخلہ میں مخل ہو سکتی ہے۔ لاطائل اور بیہودہ گفتگو سے بھی آدمی کی پوزیشن خراب ہو سکتی ہے اور وہ گرفتارِ مصیبت ہو سکتا ہے اس لیے پورے جزم و یقین کے ساتھ کسی کے سیدھے جنتی ہونے کا اعلان کرنا تقویٰ کے منافی ہے۔

آدمی ایسی چیزوں میں بخل سے کام لے کر اپنی پستی اور کم ظرفی کا ثبوت فراہم کرتا ہے جس میں اس کے لیے نقصان کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مثلاً سلام کرنا، خندہ پیشانی کے ساتھ بھائی کا استقبال کرنا، اپنے علم کے ذریعہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچانا وغیرہ۔ یہ بخل آدمی اور اس کی جنت کے درمیان روک بن سکتا ہے۔

قرآن و حدیث سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ صدقہ سے بھی آدمی کے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ صدقہ اور بھلائی کے دوسرے کاموں میں خدا نے برکتیں ہی رکھی ہیں۔ قرآن میں ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ج (سبا: ۳۹) ”اور تم جو بھی خرچ کرو وہ اس کی جگہ تمھیں اور دے گا۔“

حدیث ہے: وَمَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ (مسلم) ''صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی۔'' اَنْفِقْ يُنْفَقْ عَلَيْكَ (بخاری، مسلم) ''خرچ کرو تم پر خرچ کیا جائے گا۔''

﴿۳﴾ وَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ ذُكِرَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ الْفُرُشُ فَقَالَ: فِرَاشٌ لِّلرَّجُلِ وَ فِرَاشٌ لِّلْمَرْأَةِ وَ فِرَاشٌ لِّلضَّيْفِ وَالرَّابِعُ لِلشَّيْطَانِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے فرش کا ذکر آیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ایک فرش تو آدمی کو اپنے لیے درکار ہے اور ایک فرش بیوی کے لیے اور ایک فرش مہمان کے لیے چاہیے۔ اب چوتھا شیطان کے لیے ہوگا۔''

تشریح: غیر ضروری سامان واسباب کے اہتمام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے وقت اور دولت کے ایک بڑے حصے کو وہاں خرچ کر رہا ہے جہاں خرچ کرنے کی فی الواقع کوئی ضرورت نہ تھی۔ شیطان یہی چاہتا بھی ہے کہ وہ آدمی کو اصل کاموں سے ہٹا کر اس کے اموال اور اس کے اوقات کو دوسرے غیر ضروری کاموں میں صرف کرائے اور اسے فضول مشغولیات میں الجھائے رکھے۔ حقیقی ضرورت سے زیادہ سامان اسراف اور تکبر کے اسباب میں داخل ہے۔ اس سے مومن کو حذر ہونا چاہیے۔ البتہ اگر واقعی ضرورت ہے۔ مثلاً مہمانوں کی کثرت رہتی ہے تو ایک سے زیادہ بستر وغیرہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضور اکرم (ﷺ) کا مقصد درحقیقت اس ذہنیت کی اصلاح ہے جو ذہنیت بالعموم دنیا پرستوں کی ہوا کرتی ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَاْمُرْنَا فِيْمَا رَزَقَنَا اَنْ نَّكْسُوَ الْحِجَارَةَ وَاللَّبِنَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ جو کچھ اس نے ہمیں بہ طور رزق عطا کیا ہے اس سے ہم پتھروں اور اینٹوں پر کپڑے آویزاں کریں۔''

تشریح: یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ حضور اکرم (ﷺ) جہاد کے کسی سفر پر تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپؐ کی منتظر تھیں۔ انھوں نے مکان پر ایک کپڑا آویزاں کر دیا تھا۔ نبی اکرم (ﷺ) واپس ہوئے اور آپؐ کی نظر اس پر پڑی تو آپؐ کے چہرے سے ناگواری

ظاہر ہوئی اور آپؐ نے اس کپڑے کو اتار دیا اور وہ بات فرمائی جو یہاں نقل کی گئی ہے۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کا یہ کوئی صحیح مصرف نہیں ہے کہ اسے ہم اینٹ اور پتھر کو کپڑے سے سجانے میں صرف کریں۔ جو روپے ہم اس کام میں خرچ کریں گے وہ دوسرے نیک کاموں میں خرچ کیے جاسکتے ہیں۔ اسلام میں سادگی کو اسی لیے پسند کیا گیا ہے۔ اس میں اِسراف کا اندیشہ نہیں ہوتا اور اس سے یہ خیال بھی ہمیشہ تازہ رہتا ہے کہ آسائش و آرائش وعشرت کی اصل جگہ دنیائے فانی نہیں بلکہ آخرت کی دنیا ہے۔ اس آرائش سے کیا حاصل جو عارضی ہے۔ اس بہار پر کیا خوشی منائی جائے اور اس پر کیوں فدا ہوا جائے جو بہت جلد خزاں میں بدل کر رہے گی۔

شہرت سے پرہیز

⟨۱⟩ عَنْ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تقویٰ شعار، غنی اور گم نام بندے کو پسند فرماتا ہے۔“

تشریح: یعنی خدا اپنے ایسے بندے کو پسند کرتا ہے جس کے اندر یہ تین خوبیاں موجود ہوں۔ پہلی یہ کہ وہ ہر معاملہ میں خدا سے ڈرتا اور حق و ناحق کا لحاظ رکھتا ہو۔ دوسری خوبی اس کی یہ ہو کہ وہ غنی یعنی خوددار اور قناعت پسند ہو۔ غنائے نفس کی دولت اسے حاصل ہو۔ اصل تونگری یہی ہے۔ یوں اسلام کی نگاہ میں مال و ثروت بھی بری شے نہیں بہ شرطیکہ آدمی متقی اور خدا کا شکر گزار ہو۔ تیسری خوبی جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی گم نامی اور پوشیدگی کو محبوب رکھتا ہو۔ وہ شہرت کا بھوکا نہ ہو۔ جو نیک عمل بھی کرتا ہو محض خدا کی خوش نودی کے لیے کرتا ہو۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے نہیں۔ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ جو مال بھی وہ خدا کی راہ میں صرف کرتا ہے یا جس نیک کام کی اسے توفیق حاصل ہوتی ہے اس کی لوگوں کو خبر نہ ہوسکے۔

جو شہرت اور ناموری کا بھوکا شخص یہ چاہے گا کہ لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچ جائے کہ اس نے یہ نیک کام انجام دیے ہیں تو لوگوں کو اس کے اس عمل کی اطلاع تو ہوجائے گی

مگر ساتھ ہی لوگوں کو اس بات کی بھی خبر ہو جائے گی کہ وہ ریاکار، شہرت کا دل دادہ اور ذلیل و حقیر آدمی ہے۔ اس کے عمل سے لوگوں پر نیک بختی اور سعادت مندی کے بہ جائے اس کی کم ظرفی اور رذالت ہی ظاہر ہوگی۔ اس طرح خدا ایسے لوگوں کو ذلیل و رسوا کر کے رہتا ہے۔ انھیں سچی ناموری، ہر دل عزیزی اور محبوبیت کبھی بھی حاصل نہیں ہوتی۔

تعظیم

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یَعْرِفْ حَقَّ کَبِیْرِنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں۔“

تشریح: ”وہ ہم میں سے نہیں“ یعنی اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ چھوٹوں کا حق ہے کہ ان کے ساتھ رحم اور مہربانی کے ساتھ پیش آیا جائے۔ وہ ہماری شفقت و محبت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑوں کا بھی ہم پر حق ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا ادب و احترام کریں۔ ان کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ ہرگز ہماری زبان سے نہ نکلے۔ جہاں تک ممکن ہو ان کی خدمت بجالائیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی توقیر و تعظیم نہ کرے۔“

تشریح: اس مفہوم کی روایات حدیث کی مختلف کتابوں، احمد، حاکم، طبرانی وغیرہ میں مختلف اسناد سے مروی ہیں۔ بعض روایتوں میں لم یؤقر کی جگہ لم یُجِل آیا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

احترام قدر

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا قَاتَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَجْتَنِبِ

الْوَجْهَ؛ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کسی کو قتل کرے تو اس کے چہرے کو بچائے، اس لیے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔''

تشریح: اس لیے چہرے کا احترام کرے۔ نہ اس کو بگاڑے اور نہ اسے زخم پہنچائے۔ چہرہ آدمی کی شخصیت اور اس کے تمام ظاہری و باطنی اوصاف کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ درحقیقت خدا نے اپنی صفات کا ایک پرتو انسان پر ڈالا ہے۔ اس لیے انسان مخلوق ہونے کے باوجود اپنے صانع اور خالق کی صفاتِ جمال وجلال دونوں کا مظہر ہے۔

بعض اہلِ علم عَلٰى صُوْرَتِهٖ میں ضمیر کو آدم کی طرف راجع قرار دیتے ہیں۔ یعنی آدم کو آدم کی صورت پر پیدا فرمایا۔ اسے مخلوقات میں امتیازی شان بخشی۔ اس لیے اس کا احترام کرنا چاہیے، لیکن دوسری روایت سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔ دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اِذَا ضَرَبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ فَاِنَّ صُوْرَةَ الْاِنْسَانِ عَلٰى صُوْرَةِ الرَّحْمٰنِ (دارقطنی) ''جب تم میں سے کوئی مارے تو چہرے کو بچائے کیوں کہ انسان کی صورت رحمٰن کی صورت پر (تخلیق ہوئی) ہے۔'' انسان حیات، علم و ارادہ اور قدرت وغیرہ صفات سے متصف ہے۔ وہ دیکھتا، سنتا اور کلام کرتا ہے۔ یہ خدا کی صفات بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی صفات خدا ہی کی صفات کا عکس اور پرتو ہیں۔

صورت و جمال ظاہر جو انسان کو حاصل ہے وہ درحقیقت جمال معنوی کا مظہر ہے۔ اس دنیا میں حسن معنوی کی معرفت مشابہات کے بغیر محال ہے۔ مشابہات کے ذریعہ سے ہی اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال رنگ و نور کی ہے۔ بہ صورت رنگ حقیقت میں نور ہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر رنگ ولون میں وہ مخفی و مستتر ہوتا ہے۔ نور یا روشنی کا مجرد ظہور نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہمیں نور کا وقوف بہ واسطہ رنگ ولون ہو جاتا ہے۔

صورۃ کا استعمال حدیث میں خدا کے لیے ایک دوسری حدیث میں بھی ملتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: رَاَيْتُ رَبِّىْ عَزَّوَجَلَّ فِىْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ۔ (دارمی، ترمذی) ''میں نے اپنے رب عزوجل کو اچھی صورت میں دیکھا۔'' جمال میں ظہور کے باوجود خدا کی شانِ تنزیہی میں فرق واقع نہیں ہوتا۔

وقار و عظمت

علوِّ ہمت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ وَ فِیْ کُلٍّ خَیْرٌ، اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَ اِنْ اَصَابَکَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ کَانَ کَذَا وَ کَذَا وَ لٰکِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَآءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”قوی مومن خدا کے نزدیک ضعیف مومن سے بہتر ہے اور ہر ایک میں بھلائی پائی جاتی ہے۔ جو چیز تمھیں نفع پہنچائے اس کے حریص ہو اور خدا سے استعانت و توفیق کے طالب ہو اور عاجز نہ ہو۔ اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پیش آئے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہوتا بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے یہی مقدّر کیا تھا اور اس نے جو چاہا کیا۔ کیوں کہ یہ لفظ ”اگر“ شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔“

تشریح: یعنی بھلائی اور خوبی سے خالی تو کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا خواہ وہ ضعیف اور کم زور ارادے ہی کا کیوں نہ ہو۔ وہ مومن ہی نہیں جس کے اندر سرے سے کوئی بھلائی نہ پائی جاتی ہو۔

شر اور ہر قسم کی برائیوں سے جس طرح اجتناب ہمارے لیے ضروری ہے اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے اندر ایسی چیزوں اور ایسے کاموں کی طمع اور آرزو پائی جائے جو دنیا و آخرت کی زندگی میں ہمارے لیے سود مند اور نفع بخش ہوں۔ اس سلسلے میں خدا سے توفیق و استعانت کی طلب بھی ضروری ہے۔ اس میں کبھی سستی نہیں دکھانی چاہیے۔ کام خدا کی مدد اور استعانت ہی سے درست ہوتے ہیں۔ خدا کی عنایت سے ہی بندے کو اس کی توفیق حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس فتنہ بھری دنیا میں اپنے آپ کو مختلف قسم کی فکری و عملی گم راہیوں سے محفوظ رکھ سکے۔

قرآن میں بھی ہے: قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَاۚ هُوَ مَوْلٰنَاۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ (توبہ:۵۱) ''کہہ دو، جو کچھ اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا اس کے سوا ہمیں کچھ بھی پیش نہیں آسکتا، وہی ہمارا آقا ہے اور اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْۚ (آلِ عمران:۱۵۴) ''کہہ دو، اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے، تو بھی جن لوگوں کا قتل ہونا مقدر تھا وہ نکل کر اپنی آخری خواب گاہوں تک پہنچ کر رہتے۔''

جو گزر جائے اس پر رنج و تاسف کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنا عقل مندی کی بات نہیں ہوسکتی۔ آدمی کو چاہیے کہ خدا کے فیصلے پر راضی رہتے ہوئے اپنی قوت اور توانائی مستقبل کی فکر میں صرف کرے۔ شیطان تو چاہتا ہی ہے کہ آدمی مصائب میں اپنی بے تدبیری پر الزام لگا کر اپنے آپ کو کوسے اور اپنے ماضی پر ماتم کناں رہے۔ صبر و تحمل کو بالائے طاق رکھ کر خدا کی رضا اور اس کی مشیت سب کو فراموش کردے۔ البتہ طاعتِ الٰہی میں کسی کوتاہی پر تاسف ہونے میں مضائقہ نہیں، بہ شرطیکہ آدمی تاسف ہی نہ کرتا رہے بلکہ اپنی کوتاہی کی تلافی کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرے نہ یہ کہ اپنی پچھلی کوتاہی یا گناہ کے رنج و غم ہی میں پڑا رہے۔ اپنی کسی غلطی یا کوتاہی پر سرے سے رنج و غم نہ ہونا تو ایمان کے منافی ہے۔

حدیث میں ہے: اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَ سَآءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔ ''جب نیکی کرکے تجھے خوشی محسوس ہو اور برائی کرکے تجھے پچھتاوا ہو تو تو مومن ہے''۔۔۔۔ علامہ سیوطیؒ نے جامع میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جس شخص نے دنیا کے فوت ہونے پر تاسف کیا وہ دوزخ کے قریب ہوگیا حالاں کہ اس کی مسافت ہزار برس کی ہے اور جس کسی نے آخرت کے فوت ہونے پر تاسف کیا وہ جنت کے قریب ہوگیا حالاں کہ اس کی مسافت بھی ہزار برس کی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ يَّأْخُذُ مِنِّيْ هٰذَا فَمَنْ يَّأْخُذُ بِحَقِّهٖ يَعْنِيْ سَيْفًا فَاَخَذَهٗ اَبُوْ دُجَانَةَؓ قَالَهٗ يَوْمَ اُحُدٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کون مجھ سے یہ تلوار لے گا۔ اور اس کو وہ شخص لے جو اس کا حق ادا کرے۔'' اسے ابودجانہؓ نے لیا۔ آپؐ نے یہ بات جنگ احد کے دن فرمائی تھی۔

تشریح: یعنی جو خوب شجاعت کے ساتھ اہل باطل سے لڑے اور ہرگز کم زوری نہ دکھائے۔ غزوۂ احد کے موقع پر کفار سے سخت مقابلہ پیش آیا تھا۔ آپؐ نے اعلان فرمایا کہ کون مجھ سے تلوار لیتا ہے۔ سبھی لوگوں کے ہاتھ آپؐ کی طرف بڑھے۔ آپؐ نے فرمایا، اس کو وہی شخص لے جو اس کا حق ادا کرے۔ یہ تلوار حضرت دجانہؓ نے لی اور خوب دادِ شجاعت دی۔

عزت نفس

(۱) عَنْ حُذَیْفَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَهٗ. قَالُوْا وَ كَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَهٗ؟ قَالَ: یَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَآءِ لِمَا لَا یُطِیْقُ.

(ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن کے لیے زیبا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ وہ خود کو کیسے ذلیل کرسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ایسی آزمائش میں خود مبتلا ہوجائے جس کے متحمل ہونے کی اس میں طاقت نہ ہو۔''

تشریح: ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالنا جس کا انجام ذلت و رسوائی ہو مومن کے شایانِ شان نہیں۔ صحابۂ کرامؓ کو ذلت سے شدید نفرت تھی۔ اسلام نے عزتِ نفس کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہوئے انھیں رسوائی اور احساس کم تری کے جذبات سے محفوظ رہنے کی مزید تاکید کی۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو اگر حساب میں مہارت حاصل نہ ہو تو اسے ہرگز حساب کے امور اپنے ذمہ نہ لینا چاہیے۔ جس چیز کے ہم متحمل نہیں ہوسکتے اپنے حق میں اس کی دعا کرنی بھی درست نہیں ہے۔

اگر ہم اسلام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلامی تعلیمات کی پیروی ہی سے عزتِ نفس کی حفاظت ممکن ہے۔ عزتِ نفس کو پامال کیے بغیر اسلامی احکام کی خلاف ورزی اور خدا کی نافرمانی ممکن نہیں۔ عزتِ نفس کی محافظت درحقیقت اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔

حلم و متانت

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لِاَشَجِّ عَبْدِ

الْقَیْسِ ''اِنَّ فِیْکَ لَخَصْلَتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ: اَلْحِلْمُ وَالْاَنَاۃُ۔ (مسلم، ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: ''تم میں ۲ دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں: بردباری اور متانت۔''

تشریح: عبدالقیس بحرین کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اس قبیلے کا ایک وفد ۹ ھ میں نبی ﷺ کے پاس آیا تھا۔ رئیسِ وفد منذر بن عائذ تھے۔ حضورؐ نے انھیں اشج کا لقب مرحمت فرمایا۔ وفد جب مدینہ پہنچا تو وفد کے افراد فوراً ہی نبی اکرم (ﷺ) کی ملاقات کے لیے دوڑ پڑے لیکن منذر نے ایسا مظاہرہ نہ کیا۔ وہ نہایت اطمینان سے سواری پر سے اترے، اسباب اور سامان کو قرینے سے رکھا۔ سواریوں کو چارہ پانی دیا اور پھر غسل کیا، کپڑے بدلے، مسجد میں جاکر دوگانہ نماز ادا کی اور پھر نہایت وقار و ادب کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نبی اکرم (ﷺ) کو ان کی وضع بے حد پسند آئی اور ان کے متعلق وہ بات کہی جو اس حدیث میں نقل کی گئی ہے۔ وفد کے دوسرے افراد کو نہ تو آپؐ نے ان کی اظہارِ بے تابی پر ٹوکا اور نہ انھیں برا کہا۔ البتہ آپؐ نے منذر کی تعریف کی۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب حضورؐ کی زبان مبارک سے منذر نے اپنی تعریف سنی تو عرض کیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَا اَتَخَلَّقُ بِھِمَا اَمِ اللّٰہُ تَعَالٰی جَبَلَنِیْ عَلَیْھِمَا؟ قَالَ: بَلِ اللّٰہُ جَبَلَکَ عَلَیْھِمَا فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَبَلَنِیْ عَلٰی خَلَّتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ۔ ''یارسول اللہ! میں بہ تکلف ان خصلتوں کو اختیار کرتا ہوں یا خدا نے میری جبلت میں پیدا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: بلکہ خدا نے ان کو تیری جبلت میں پیدا فرمایا ہے۔ اس پر (منذر) نے کہا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان دو صفتوں پر پیدا کیا جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ یعنی چوں کہ یہ جبلی ہیں اس لیے ان کے زوال کا احتمال اور اندیشہ نہیں ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلتُّؤَدَۃُ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ خَیْرٌ اِلَّا فِیْ عَمَلِ الْاٰخِرَۃِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تاخیر اور ڈھیل ہر چیز میں بہتر ہے سوائے عملِ آخرت کے۔''

تشریح: دنیوی امور میں آدمی نہیں جانتا کہ ان کے انجام دینے کا نتیجہ اچھا نکلے گا یا برا اس لیے

ان میں احتیاط و تامّل سے کام لینا انسب ہے۔ ان میں جلد بازی ہرگز نہ دکھائے۔ اس کے برعکس وہ امور آخرت میں جن کے موجب خیر و برکت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا، جن کے محمود ہونے پر قرآن و حدیث کی تصریحات موجود ہیں ان میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ معلوم نہیں پھر آدمی کو ان کی توفیق مل سکے یا نہ ملے۔ قرآن میں بھی ہے: سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لا اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ط (الحدید:۲۱) ''اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف بڑھنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جاؤ جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت جیسی ہے، جو ان لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا: فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا (المائدہ:۴۸) ''پس بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھو، تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔''

اگر خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کا داعیہ ہو تو توقف نہ کرے۔ ممکن ہے شیطان دل میں وسوسے ڈال کر انفاق سے روک دے۔ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ج وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ لا صلے (البقرہ:۲۶۸) ''شیطان تمھیں قول دیتا ہے کہ (خرچ کرو گے تو) مفلسی آجائے گی اور وہ تمھیں شرمناک طرزِ عمل (بخل) کی ترغیب دیتا ہے جب کہ اللہ اپنی مغفرت اور فضل کا تم سے وعدہ کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

دنیوی معاملات میں جلد بازی کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم غلط اقدام کر بیٹھتے ہیں اور پھر بعد میں اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ کوئی کام ہو سنجیدگی سے اس کے ہر پہلو پر نظر ڈالنا چاہیے اور اس کے نتائج کے بارے میں اطمینان حاصل کر لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں دوسرے لوگوں سے مشورہ کرنا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے ایسا طریقہ اور ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہیے جو سب سے بہتر اور نتیجہ خیز ہو۔

ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ آدمی محض آئندہ کے امکان کے پیش نظر کسی معاملہ میں بلا ضرورت وقت سے پہلے جلد بازی میں ایسا اقدام کر بیٹھتا ہے جو اس کے لیے انتہائی پریشانی اور پشیمانی کا سبب بن جاتا ہے۔ جس امکان کو دیکھتے ہوئے اس نے اقدام کیا تھا وقت آنے پر معلوم ہوتا ہے

کہ حالات اب دوسرے ہیں اور وہ امکانی چیز محض ایک خواب و خیال ثابت ہوتی ہے۔ وقت سے پہلے کسی شدید مجبوری کے بغیر قدم اٹھانا اپنے آپ کو شدید خطرے میں ڈالنا ہے۔

سطح بینی و کم نظری، حرص و ہوس اور فکر صحیح کا فقدان جلد بازی اور عجلت پسندی کے اہم وجوہ ہیں۔ کشادہ دل اور کشادہ نظر شخص ہی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر کر کسی معاملہ میں سنجیدگی سے غور کر سکے اور وہ طریقہ اختیار کرے جس میں خیر ہو۔ خیر پسند شخص محض خیر اور بھلائی ہی اختیار نہیں کرتا بلکہ اس طرح وہ خدا سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ خیر کا یہ پہلو خیر سے بھی بڑھ کر خوشتر اور وجد آگیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح شر اور برائی اختیار کر کے آدمی صرف یہی نہیں کہ شر میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ اس کا خدا سے وابستگی کا رشتہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ شر کا یہ پہلو اس شر سے بھی زیادہ افسوس ناک ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے: یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکَیْنِ مَالَمْ یَخُنْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ فَاِذَا خَانَهٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِهِمَا۔ (ابوداؤد) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”میں دو شریکوں میں تیسرا ہوں جب تک ان میں سے کوئی خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ مگر جب کوئی ایک خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔“

وسعتِ ظرف

〈۱〉 عَنْ اَبِی الْاَحْوَصِ الْجُشَمِیِّ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ: قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَیْتَ اِنْ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ فَلَمْ یَقْرِنِیْ وَلَمْ یُضِفْنِیْ ثُمَّ مَرَّ بِیْ بَعْدَ ذٰلِکَ اَقْرِیْهِ اَمْ اَجْزِیْهِ؟ قَالَ: بَلْ اِقْرِهٖ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوالاحوص جشمی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اگر میں کسی شخص کے پاس سے گزروں اور وہ نہ تو میرے ملنے کا حق ادا کرے اور نہ میری ضیافت کرے اور اس کے بعد اس کا گزر میرے پاس سے ہو تو میں اس کی مہمان داری کروں یا میں اس سے (اس کی کم ظرفی) کا بدلہ لوں؟ آپؐ نے فرمایا: ”نہیں، بلکہ تم اس کی مہمانی کا حق ادا کرو۔“

تشریح: ”میں اس کی مہمان داری کروں۔“ اصل میں اقریہ آیا ہے۔ حاکم کے مخطوطہ میں اَ اَقْرِیْهِ آیا ہے (یعنی کیا میں اس کی مہمان داری کروں) لیکن بعد کے نسخہ میں ہمزہ استفہامیہ نہیں ملتا۔

سوال یہ کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ وہی معاملہ کروں جو اس نے میرے ساتھ کیا۔ میں بھی بے رخی سے پیش آؤں اور اس کی ضیافت نہ کروں؟

آپؐ نے تعلیم یہ فرمائی کہ تمھیں تو ہر حالت میں اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ کوئی تمھارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے تمھیں چنداں اس کی پرواہ نہ ہونی چاہیے۔ کسی شخص کی تنگ دلی اور کم ظرفی سے متاثر ہو کر تم اپنے اخلاق کو ہرگز نقصان نہ پہنچاؤ۔

اسلام کی تعلیمات پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں یہی چاہتا ہے کہ وسعتِ ظرف سے کام لیں اور اپنی کشادہ دلی اور وسیع النظری کا ثبوت دیں اور ہرگز کسی کم ظرفی کو اپنے لیے قابلِ تقلید تصور نہ کریں۔ پیروی کریں تو انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے پیروؤں کی کریں جو ہمیشہ کردار کی عظمت اور بلندی پر قائم رہے اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی پسند نہ کیا کہ اس مقام بلند سے نیچے اتر آئیں جس پر خدا کے فضل خاص نے انھیں فائز کیا تھا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَمرِو بْنِ عَبَسَةَ رضؓ **قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْإِيْمَانُ؟ قَالَ الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ.** (مسلم)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے (حضورؐ کی خدمت میں) عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: صبر اور سماحت۔"

تشریح: یعنی ایمان کو صرف عقیدہ اور نظریہ بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ ایمان تو وہی ہے جو انسان کا کردار بن جائے۔ ایمان کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی دنیا میں صبر و استقلال کو اپنا شعار بنائے۔ وہ جانتا ہو کہ خدا علیم و حکیم ہے۔ وہ ہمارے حالات سے بے خبر کیسے رہ سکتا ہے، اور بے بسی و بے چارگی کی حالت میں وہ ہمیں کیسے چھوڑ سکتا ہے اس لیے اگر مشکلات اور مصائب پیش آئیں تو وہ صبر اور حوصلہ سے کام لے اور خدا کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو نہایت مستعدی سے پورا کرنے میں لگا رہے۔

پھر ایک مومن شخص یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کی اصلی کامیابی وہ ہے جو اسے آخرت میں حاصل ہوگی۔ کسی بھی عمل کا آخری نتیجہ آخرت ہی میں دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص آخرت کا انتظار نہیں کر سکتا اور سب کچھ دنیا ہی میں دیکھ لینا چاہتا ہے تو اس کی یہ خواہش خدا کے منصوبہ سے ہم آہنگ نہیں، اس کے خلاف ہے۔ ایمان کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی میں

ہمارے پیش نظر ہمیشہ خدا کا منصوبہ اور اس کی اسکیم ہو۔ خدا کی اسکیم ایک بڑے عرصہ کو محیط ہے جس کا پاس ولحاظ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہمارے اندر صبر کی صفت بہ درجۂ اتم موجود ہو۔

سماحت ایک اعلیٰ وصف ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کی وجہ سے آدمی ان تمام باتوں سے خواہ ان کا تعلق علم سے ہو یا عمل سے، دور رہتا ہے جن کو وہ اصل مقصود حیات کی راہ میں مزاحم سمجھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں سماحت یہ ہے کہ انسان بہیمی داعیات کا غلام بن کر نہ رہے بلکہ وہ اعلیٰ قسم کے ذوق کا حامل ہو۔ اس میں نرم خوئی بھی ہو اور اعلیٰ ظرفی بھی۔ مال و دولت کے معاملہ میں فیاض ہو۔ اپنی کمائی میں سے محتاجوں اور ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنا جانتا ہو۔ جنسی خواہشات کے معاملہ میں وہ عفت اور پاکیزگی کا حامل ہو۔ اس سلسلہ میں بے راہ روی کا روادار ہرگز نہ ہو۔ اسی طرح گناہ اور معاصی کے کاموں میں خواہ دوسروں کے لیے کتنی ہی کشش کیوں نہ ہو وہ ان امور میں ہمیشہ تقویٰ کو ملحوظ رکھتا ہو۔ مصائب پیش آتے ہیں تو وہ صبر سے کام لیتا ہو۔ عافیت اور کشادگی کی صورت میں خدا کا شاکر اور اس کے بندوں پر مہربان ہو۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَنْ تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَرَاحَمُوْا قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! کُلُّنَا رَحِیْمٌ۔ قَالَ: اِنَّہٗ لَیْسَ بِرَحْمَۃِ اَحَدِکُمْ صَاحِبَہٗ وَ لٰکِنَّھَا رَحْمَۃُ الْعَامَّۃِ۔ (طبرانی)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایک دوسرے پر رحم نہ کرو۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم میں سے ہر ایک رحیم ہے۔ فرمایا: ''میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے ساتھی پر رحم کرے بلکہ میری مراد رحمت عامہ سے ہے۔''

تشریح: یعنی اس کا ترحم اور اس کی مہربانیاں سب کے لیے ہوں۔ صرف اپنے ہی لوگوں پر وہ مہربان نہ ہو۔ ساری انسانیت اس کی نگاہ میں خدا کے کنبہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں اسے یہی حیثیت دی بھی گئی ہے۔

وزن

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِنَّہٗ لَیَاتِی الرَّجُلُ الْعَظِیْمُ

السَّمِيۡنُ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ لاَ يَزِنُ جَنَاحَ بَعُوۡضَةٍ اِقۡرَءُوۡا فَلاَ نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ رسولِ خدا ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''قیامت کے دن ایک بڑا ہی موٹا تازہ آدمی آئے گا لیکن (خدا کے نزدیک) مچھر کے بازو کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا۔ یہ آیت پڑھو ہم قیامت کے دن انھیں کچھ بھی وزن نہ دیں گے۔''

تشریح: اس حدیث میں ایک نہایت ہی بنیادی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ظاہر پرست نگاہوں میں آدمی کے لیے عزت اور وقعت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی ظاہری حیثیت کے لحاظ سے خوش حال اور تن درست وتوانا ہو لیکن حقیقت کی نگاہ میں عزت و وقار کا معیار کچھ اور ہی ہے۔ ایک آدمی اپنے ظاہر کے لحاظ سے بڑا جسیم اور ڈیل ڈول اور قد و قامت والا ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے عام نگاہیں اس سے مرعوب بھی ہوتی ہوں لیکن یہ چیز اس کی بڑائی اور عزت و عظمت کے لیے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک شخص اپنے ظاہر کے لحاظ سے ایک بڑے جثہ کے ساتھ قیامت کے دن آئے گا لیکن خدا کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ مچھر کے پر کے برابر بھی خدا کی نگاہ میں اس کا وزن نہ ہوگا۔ اس لیے کہ خدا کے نزدیک عزت کا معیار اخلاق واعمالِ نیک ہیں نہ کہ دنیوی جاہ وحشمت اور جسمانی صحت وتوانائی۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق و اعمالِ نیک سے عاری شخص آخرت میں ذلیل ورسوا ہوگا۔ خدا کے یہاں تو عزت واکرام کے مستحق وہی لوگ قرار پائیں گے جو فی الواقع اس کے مستحق ہوں گے۔ جن کی زندگی میں قابلِ لحاظ چیز مال و دولت اور روپ و رنگ نہ تھا بلکہ جنھوں نے ایمان اور اخلاقِ حسنہ کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا۔ دنیا کی کوئی بھی چیز جن کی بلندیِ نگاہ کو زیر نہ کرسکی۔ دنیا کی کوئی دوسری شے ایمان اور اخلاقِ حسنہ کے مقابلہ میں جن کے لیے باعثِ کشش نہ بن سکی۔

عزت کا معیار کیا ہے؟ اس کو ہم اسلام کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں لیکن جن کو اسلامی تعلیمات کا کوئی پاس ولحاظ ہی نہیں یا جن کے دلوں میں اسلام ابھی اترا ہی نہیں ان کا عزت کی اصل حقیقت اور اس کی قدر و قیمت سے آشنا ہونا بے حد مشکل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں عزت کی تلاش مختلف جگہوں پر لے جاتی ہے لیکن وہ اس سے محروم ہی رہتے ہیں، اس شخص کی طرح جو دل کا اطمینان اور آسودگی مال میں ڈھونڈتا ہے لیکن یہ چیز اس کے لیے ہمیشہ عنقا ہی رہتی ہے۔

حقیقت کی نگاہ میں عزت کا معیار وہ نہیں ہے جس کو دنیا پرست لوگوں نے عزت کا اصل معیار سمجھ رکھا ہے۔ روایت میں ہے: مَآ اَعَزَّ اللّٰہُ بِجَھْلٍ قَطُّ وَلَآ اَذَلَّ اللّٰہُ بِحِلْمٍ قَطُّ ''اللہ نے کبھی جہالت کو کسی کے لیے سببِ عزت نہیں بنایا اور نہ کبھی حلم و بردباری کی وجہ سے کسی کو ذلیل کیا۔''

ایک اور روایت ہے: وَلاَ عَفٰی رَجُلٌ عَنْ مَظْلَمَۃٍ اِلَّا زَادَہُ اللّٰہُ بِھَا عِزًّا۔ ''جس کسی شخص نے ظلم کو معاف کیا خدا نے اس سے اس کی عزت ہی میں اضافہ کیا۔''

ایک دوسری روایت ہے: مَنْ یَّشْتَہِ کَرَامَۃَ الْاٰخِرَۃِ یَدَعُ زِیْنَۃَ الدُّنْیَا۔ ''جو آخرت کی عزت چاہتا ہو وہ دنیا کی زینت چھوڑ دے'' یعنی زینتِ دنیا کا پرستار نہ بنے، اس کا دل دادہ نہ ہو۔

ایک روایت میں آتا ہے: مَنِ اعْتَزَّ بِالْعَبِیْدِ اَذَلَّہُ اللّٰہُ۔ ''جو غلاموں سے عزت چاہے گا خدا اسے ذلیل کرے گا۔''

ایک اور روایت ہے: شَرَفُ الْمُؤْمِنِ قِیَامُہٗ بِاللَّیْلِ وَ عِزُّہٗ اِسْتِغْنَآءُہٗ عَنِ النَّاسِ۔ ''مومن کی شرافت قیامِ لیل میں ہے اور عزت اس کی لوگوں سے بے نیازی اختیار کرنے میں ہے۔''

ان روایتوں سے بہ خوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ عزت اور شرف کا اصل تعلق انسان کی ذاتی خوبیوں اس کی آخرت پسندی اور تقویٰ سے ہے نہ کہ کسی دوسری چیز سے۔

قرآن میں ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ ''حقیقت میں اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔''

عزت اور شرف درحقیقت خدا کی امانت ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل ہونے سے بچائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں روایت کے یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں: مَا وَقّٰی بِہِ الْمَرْءُ عِرْضَہٗ کَتَبَ اللّٰہُ بِہٖ صَدَقَۃً۔ ''آدمی جس چیز کے ذریعہ سے اپنی عزت کو بچائے خدا اسے اس کے لیے صدقہ لکھے گا۔''

عزت و ذلت کا اصل معیار جان لینے کے بعد یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ انسان خود اپنی عزت و ذلت کا ذمہ دار ہے۔ آدمی اپنی زندگی میں جو روش بھی اختیار کرتا ہے اس کے نتیجہ میں یا تو وہ اپنی عزت کو بڑھاتا ہے یا وہ اپنے آپ کو پستی کی طرف لے جا کر خود کو ذلیل

ٹھہراتا ہے دنیا میں مومن کی بصیرت اس کو پورے طور پر محسوس کر لیتی ہے کہ باعزت کون ہے اور ذلیل کون، عالمِ آخرت میں چوں کہ حقیقتوں کا انکشاف ہوگا اس لیے وہاں یہ سب ہی پر عیاں ہو جائے گا کہ کس شخص نے نفع کا سودا کیا اور کس نے خسارہ اٹھایا۔ آدمی دنیا میں خواہ کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے لیکن در حقیقت وہ خود اپنے ساتھ معاملہ کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ہر خیال و عمل سے اس کی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں رہتا کہ ہمیں اپنی زندگی کس درجہ باخبری کے ساتھ گزارنی چاہیے۔

حدیث کے آخر میں حوالے کے طور پر قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی گئی ہے کہ قیامت کے دن خدا کے نافرمانوں کے لیے کوئی وزن قائم نہ ہوگا۔ اس دن وہ بے وزن ہوں گے۔ ان کے حصے میں رسوائی اور ذلّت کے سوا کوئی دوسری چیز نہ آئے گی۔ جو چیز انھیں اس دن باوزن بنا سکتی تھی وہ اخلاق و کردار کا وزن تھا جس کی طرف سے وہ غافل ہو کر زندگی بسر کرتے رہے۔ دنیا میں بھی در حقیقت وہ بے وزن اور مردہ تھے آخرت میں بھی وہ بے وزن قرار پائیں گے۔ ایسے لوگوں کی حیثیت ملبہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ قرآن میں اس حقیقت کو مختلف مقامات پر واضح فرمایا گیا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ وَمَآ اَدْرٰكَ مَاهِيَهْ ؕ نَارٌ حَامِيَةٌ ۠ (القارعۃ: ۶-۱۱) ”پس رہا وہ شخص جس کے اعمال باوزن ثابت ہوئے تو وہ پسندیدہ زندگی میں رہے گا۔ اور رہا وہ شخص جس کے اعمال بے وزن و بے قدر نکلے تو اس کی ماں کھڈ ہوگی۔ اور تجھے کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟ دہکتی ہوئی آگ ہے۔“

اس حدیث میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔ ہم کو اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہمارے دین و ایمان نے اخلاق و کردار اور فکر و خیال کے لحاظ سے ہم کو کتنا باوزن بنایا ہے۔ اگر ہم دین کے ظاہری اعمال و رسوم کو ادا کرنے کے باوجود اپنی شخصیت کے اعتبار سے کچھ بھی بلند نہ ہو سکے بلکہ پستی ہی میں پڑے رہے۔ عالی ظرف ہونے کے بہ جائے رذیل ہی بنے رہے تو اس سے کچھ ہونے کا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہم اپنی نمازوں اور تسبیحات کا حساب کرتے رہیں اس سے کیا فرق واقع ہوگا۔ اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حساب تو ہمیں اپنے آپ کا کرنا چاہیے۔

وقار و سنجیدگی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوةُ فَلَا تَاْتُوْهَا تَسْعَوْنَ وَاْتُوْهَا تَمْشُوْنَ وَ عَلَیْکُمُ السَّکِیْنَةُ فَمَا اَدْرَکْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَکُمْ فَاَتِمُّوْا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب نماز کی اقامت کہی جائے تو تم اس کی طرف بھگدڑ مچاتے ہوئے مت آؤ بلکہ تم طمانینت کے ساتھ آؤ۔ پھر جس قدر نماز تمھیں مل جائے ادا کرلو اور جو نہ پاؤ اسے پوری کرلو۔''

تشریح: یعنی نماز کے لیے اس طرح آؤ کہ اس سے وقار اور سنجیدگی کا اظہار ہو۔ رکعتیں چھوٹنے کے خوف سے بھاگ دوڑ مت کرو۔ جو رکعتیں مل جائیں پڑھ لو، باقی امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کرلو۔ بھگڈر مچانا نماز کے وقار کے منافی ہے اور یہ چیز خود مومن کے وقار کے بھی خلاف ہے یہ بات پیش نظر رہنے کی ہے کہ طاعت وعبادت کا مدار سکینت وطمانینت پر ہے۔ عبادت کے اصل مقصود یعنی الحضور مع المعبود کے لیے جو چیز درکار ہے وہ ہے سنجیدگی اور توجہ الی اللہ، نہ کہ غیر سنجیدہ حرکات۔

قرآن میں یہ جو آیا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ط (الجمعہ:۹) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔'' تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ جب نماز کے لیے بلایا جائے تو غفلت کی حالت میں پڑے مت رہو بلکہ سارے کاموں کو چھوڑ کر نماز کے لیے چل پڑو۔ کاروبار میں خود کو اس طرح نہ لگاؤ کہ فریضۂ نماز اور خدا کی یاد سے بے گانہ ہو جاؤ۔ مومن کی زندگی نہ تو یہود کی طرح مادہ پرستانہ ہوتی ہے اور نہ وہ تارک الدنیا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں اعتدال پایا جاتا ہے۔ وہ نہ تو دنیا کو ترک کرتا ہے اور نہ خدا سے بے گانگی اختیار کرتا ہے۔ وہ عین دنیوی امور میں مصروف ہوتا ہے لیکن اذان کی آواز سنتے ہی سب کاموں کو چھوڑ کر نماز کے لیے مسجد کا رُخ اختیار کرتا ہے۔ اور نماز کے لیے مسجد کی طرف جانے میں وہ کسی بے دلی اور بے کیفی کا اظہار نہیں کرتا۔ مسجد کی جانب اس کے قدم اٹھتے ہیں تو پورے ذوق وشوق کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: فَاِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا کَانَ یَعْمِدُ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَھُوَ فِی الصَّلٰوۃِ۔ ''کیوں کہ تم میں سے جب کوئی شخص نماز کا قصد وارادہ کرتا ہے تو وہ اسی وقت سے نماز میں داخل ہو جاتا ہے۔'' یعنی نماز کا قصد کرتے ہی وہ ایک طرح سے نماز کی حالت میں ہو گیا۔ اس لیے اسے حتی الامکان نماز کے آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اور طمانینت اور سکون و وقار نماز کے آداب میں شامل ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لِاَشَجِّ عَبْدِ الْقَیْسِ: اِنَّ فِیْکَ لَخَصْلَتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ اَلْحِلْمُ وَ الْاَنَاۃُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ عبدالقیس کے وفد کے قائد اشجّ سے فرمایا: ''تمھارے اندر دو ایسے وصف پائے جاتے ہیں جو اللہ کو پسند ہیں اور وہ ہیں بردباری اور وقار و برداشت۔''

تشریح: روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قبیلۂ عبدالقیس کے وفد کے لوگ مدینہ پہنچے تو وہ پہنچتے ہی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملنے کے لیے دوڑ پڑے لیکن اشج نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ وہ اطمینان سے سواری سے اترے، سامان کو ڈھنگ سے رکھا، اونٹوں کو چارہ پانی دیا، پھر غسل کر کے نہایت سکون و وقار کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کا یہ طریقہ بہت پسند آیا اور انھیں خطاب کر کے وہ بات فرمائی جو اس حدیث میں نقل ہوئی ہے۔

متانت وشائستگی

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم لَمْ یَکُنْ یَسْرُدُ الْحَدِیْثَ کَسَرْدِکُمْ کَانَ یُحَدِّثُ حَدِیْثًا لَوْ عَدَّہُ الْعَادُّ لَاَحْصَاہُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری طرح ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے کہ الفاظ باہم نہایت ملے ہوئے اور متصل ہوں۔ آپؐ گفتگو اس طرح فرماتے تھے کہ اگر کوئی گننے والا گننا چاہتا تو وہ آپؐ کے جملے گن سکتا تھا۔''

تشریح: ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: کَانَ یَتَکَلَّمُ بِکَلَامٍ بَیْنَہٗ فَصْلٌ یَحْفَظُہٗ مَنْ جَلَسَ اِلَیْہِ۔ ''آپ ایسی گفتگو کرتے تھے کہ جملوں کے درمیان فصل ہوتا تھا (یعنی

جملے الگ الگ ہوتے تھے) کہ جو شخص آپؐ کے پاس بیٹھتا وہ اسے یاد رکھ سکتا۔‘‘

کسی آدمی کی بات چیت اور گفتگو سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ آدمی کیسا ہے۔ شائستہ اور متین شخص کی گفتگو بھی باوقار ہوتی ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گفتگو آپؐ کی متانت اور شائستگی کا پتہ دیتی تھی۔ ایسی گفتگو آپؐ ہرگز نہیں فرماتے تھے جس میں کہیں ٹھہراؤ نہ ہو۔ اور نہ آپؐ کی گفتگو میں ایسی نامناسب روانی اور تیزی ہوتی تھی کہ الفاظ اور جملے باہم ایسے مل جائیں کہ سننے والے کو ان کے سننے اور اخذ کرنے میں دشواری پیش آئے۔ سننے والا اگر چاہتا تو وہ بہ آسانی آپؐ کی باتوں کو یاد رکھ سکتا تھا بلکہ آپؐ کے الفاظ اور جملے تک شمار کیے جا سکتے تھے۔ ذمہ دارانہ گفتگو کی یہی شان ہوتی ہے۔ جو گفتگو حقیقی احساس اور شعور کے ساتھ کی جائے گی اس میں کسی طرح کی بدنمائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور سننے والے کے لیے اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہ ہوگی۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الجھی ہوئی گفتگو یا تقریر الجھے ہوئے ذہن و دماغ کی غماز ہوتی ہے۔ اگر ذہن میں کوئی تناؤ اور فکری الجھاؤ ہے تو گفتگو یا تقریر میں بھی اس کا اثر نمایاں ہوگا۔ سننے والے کو کبھی بھی اس سے کامل سکون واطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَرْجِسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلسَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَةُ وَالْاِقْتِصَادُ جُزْءٌ مِّنْ اَرْبَعٍ وَ عِشْرِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سرجس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اچھا طور وطریق، متانت اور میانہ روی، نبوّت کا چوبیسواں حصہ ہے۔‘‘

تشریح: یعنی یہ اوصاف خصائص نبوّت میں سے ہیں۔ نبی انسانیت کے لیے کامل نمونہ ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں خواہ اس کا تعلق معاشرے سے ہو یا اس کا تعلق سیاسی و معاشی زندگی سے ہو وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جو عدل و انصاف، حقیقت پسندی، کامل دیانت اور کامل فہم وفراست کا تقاضا ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی متانت اور شائستگی سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں کسی قسم کی انتہا پسندی کی بات نہیں پائی جاتی۔ وہ اس راہ کو اختیار کرتے ہیں اور اسی پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں جو زندگی کی فطری اور سیدھی راہ ہے۔ جس کو اختیار کر کے انسان مشکلوں میں گرفتار نہیں ہو جاتا بلکہ جس پر چلنے سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ انبیاء تو جاہلیت کی ان تمام ہی بندشوں کو کھولتے ہیں جن میں انسانیت جکڑی ہوئی ہوتی ہے اور وہ ان تمام ناروا و ناخوش گوار

بوجھوں کو اتار پھینکنے کے لیے دنیا میں آتے ہیں جن کے تلے دب کر انسانیت کراہ رہی ہوتی ہے۔
چنانچہ قرآن میں حضور (ﷺ) کے بارے میں صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے: یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (الاعراف:۱۵۷) ''اور جو انھیں بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا ہے۔ ان کے لیے اچھی، پاکیزہ چیزوں کو حلال اور بری، ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اتارتا ہے جو اب تک ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔''

نبیوں کے پسندیدہ اوصاف و خصائل کو ہی اختیار کرنے میں ہماری کام یابی ہے۔ خدا کی رحمت کو اپنی جانب ملتفت کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہیں ہے۔ زندگی میں صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے آدمی کا تعلق بنیادی اور آخری حقیقت (Ultimate Reality) سے قائم ہو جاتا ہے جو انسان کی کام یابی کا اصل ضامن ہے۔ اس مادّی دنیا میں رہتے ہوئے بھی حقیقت سے تعلق قائم ہو سکتا ہے گرچہ حقیقت مادی اور کوئی محدود شے نہیں ہے۔ نبوّت وہ اصل ذریعہ ہے جس سے اس مادی دنیا کا ربط اس عالم سے قائم ہوتا ہے جو حقیقی اور مادی تنگ دامانیوں سے یکسر پاک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سچے خواب کی کوئی مادّی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اس کا تعلق بھی غیب سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں سچے خوابوں کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے اس لیے ان میں بھی شانِ نبوّت کی تھوڑی سی جھلک ہم دیکھ لیتے ہیں۔

اعتدال و میانہ روی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَّ لَنْ يُّشَآدَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَ قَارِبُوْا وَ اَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغُدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَ شَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے: ''دین آسان ہے۔ اور دین کے سلسلے میں جو کوئی سختی کا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے لازماً دین اس پر غالب آجاتا ہے۔ پس درست اعتدال کی روش اختیار کرو، خوش رہو اور صبح و شام اور کچھ رات کے کچھ حصے کے ذریعے سے (اطاعتِ الٰہی میں) مدد کے طالب ہو۔''

تشریح: دین اسلام ایک فطری دین ہے۔ اس میں سختی اور بے جا مشقت بہ ذاتِ خود مطلوب نہیں ہے۔ دین کو ہم اسی صورت میں دینِ فطرت کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت نہ ہو بلکہ اس سے ہماری روحیں آرام پائیں اور وہ بے جا بندشوں اور سختیوں سے ہمیں نجات دے۔ جو شخص دین کو فطری طور پر اختیار کرنے کے بہ جائے دینی امور میں غلو اور شدت پسندی کی روش اختیار کرتا ہے وہ بالآخر شکست کھا جاتا ہے۔ دینی امور میں مقاومت اور استقامت کی توفیق اسے حاصل نہیں ہوسکتی۔ دین میں اعتبار استقامت کا ہے، وقتی جوش و خروش کی کوئی خاص وقعت اور اہمیت نہیں۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ درست اور ٹھیک طریقہ اختیار کرو۔ اپنی قوت اور طاقت کے مطابق عمل کرو۔ اس کے خلاف کوئی طرز اختیار کرو گے تو دین تمھارے لیے کوئی مسرت بخش چیز نہ رہے گی۔ دینِ حق سے آشنا کر کے خدا تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ تمھیں افسردہ خاطر اور پریشان دیکھنا اسے ہرگز مطلوب نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے: هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ (مسلم عن ابن مسعودؓ) "ہلاک ہوئے تعمق اور (بے موقع) شدت اختیار کرنے والے۔"

تمھیں چاہیے کہ نشاط اور فراغِ قلب کے اوقات میں اعمالِ نیک اور عبادت کے ذریعہ سے طاعت الٰہی کے سلسلہ میں مدد طلب کرو۔ یہ اوقات ہیں صبح و شام اور آخر شب۔ قلب کو نشاط اور فراغ اگر حاصل نہیں تو عبادت اور قیام اور رکوع و سجود میں لذت حاصل نہیں ہوسکتی۔ ایک سمجھ دار مسافر مناسب اوقات میں راہِ سفر طے کرتا ہے اور دوسرے اوقات میں خود کو اور اپنی سواری کو آرام کا موقعہ دیتا ہے۔ اس طرح وہ بغیر تعب و مشقت کے اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے: رَوِّحُوا قُلُوْبَكُمْ سَاعَةً فَسَاعَةً (ابوداؤد) "اپنے دلوں کو وقتاً فوقتاً آرام پہنچاؤ۔"

〈۲〉 وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْهَدْىَ الصَّالِحَ وَالسَّمْتَ الصَّالِحَ وَالْاِقْتِصَادَ جُزْءٌ مِّنْ خَمْسٍ وَّ عِشْرِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "نیک عادت و طریقہ اور سمتِ حسن اور میانہ روی نبوّت کا پچیسواں حصہ ہیں۔"

تشریح: سمتِ حسن سے مراد آدمی کے باطن اور اس کے ظاہری اخلاق و اعمال کی درستی اور صالحیت ہے۔ قرآن اور احادیث میں میانہ روی اور اعتدال پسندی پر بہت زور دیا گیا ہے۔

مثلاً قرآن میں ہے: وَلاَ تَجعَلُ یَدَکَ مَغلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلاَ تَبسُطھَا کُلَّ البَسطِ (بنی اسرائیل: ۲۹) ''اور اپنا ہاتھ نہ تو اپنی گردن سے باندھے رکھو اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ و۔'' یعنی خرچ کے معاملہ میں اعتدال پر قائم رہو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنفَقُوا لَم یُسرِفُوا وَلَم یَقتُرُوا وَ کَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًاo (الفرقان: ۶۷) ''اور جو خرچ کرتے ہیں، تو اسراف نہیں کرتے اور نہ تنگی سے کام لیتے ہیں بلکہ وہ خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے وَّ کُلُوا وَاشرَبُوا وَلاَ تُسرِفُوا اِنَّہٗ لاَ یُحِبُّ المُسرِفِینَo (الاعراف: ۳۱) ''اور کھاؤ اور پیو، البتہ حد سے آگے نہ بڑھو، یقیناً وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ہر ایک معاملہ میں صحیح روش اعتدال ہی کی ہوتی ہے۔ انتہا پسندی اور شدت اور غلو کسی اعتبار سے بھی درست نہیں بلکہ وہ خود اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی مصیبت محض ہے۔ اسی بات کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: خَیرُ الاُمُورِ اَوسَاطُھَا۔ (البیہقی)

سمت حسن اور میانہ روی معمولی چیزیں نہیں ہیں۔ جس کسی شخص نے ان چیزوں کو اختیار کیا اس نے در حقیقت طریق نبوّت کی پیروی کی۔ نبوت اپنی کیفیت و حقیقت کے لحاظ سے اتنی بلند و برتر شے ہے کہ اس کی تشریح و توضیح ممکن نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان صفات کا تعلق جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے نبوّت سے ہے۔ اس لیے کہ نبوّت کیف و حال بھی ہے اور خلقِ عظیم بھی۔

خاموشی و کم گوئی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ، وَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلاَ یُؤْذِ جَارَہٗ وَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اچھی بات کہے یا پھر خاموش رہے اور جو کوئی اللہ اور

یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور جو شخص اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی تکریم کرے۔"

تشریح: یعنی اللہ کی رضا اور آخرت میں کام یابی کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ہدایات پر عمل کرے جو اس حدیث میں دی گئی ہیں۔ آگے جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اخلاقِ حسنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں ہمارے لیے بہتر گھر کی تعمیر جس سبب سے ہوگی وہ اخلاق کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا جس چیز سے خوش ہوتا ہے وہ اصل میں حسن اخلاق ہی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اخلاق کا تصور اسلام میں کوئی محدود تصوّر نہیں ہے بلکہ اسلام نے دنیا کے سامنے اخلاق کا نہایت وسیع تصوّر پیش کیا ہے۔

بے ضرورت بات کرنی پسندیدہ نہیں۔ بات اسی وقت کرے جب ضروری ہو۔ باتوں کے ساتھ کتنی ہی آفتیں لگی ہوتی ہیں جن کا آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی باتیں جن میں نہ ثواب ہو اور نہ عذاب، ان کے مقابلہ میں بھی خاموشی کو ترجیح حاصل ہے۔ گفتگو میں معلوم نہیں کب آدمی حدود سے تجاوز کر جائے۔ فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص بات کو بھی ایک عمل سمجھے گا وہ بے فائدہ بات کم کرے گا۔ قرآن میں ہے: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌo (قٓ:۱۸) "کوئی بات اس نے کہی نہیں کہ اس کے پاس ایک نگراں تیار رہتا ہے۔" اس لیے آدمی کو اس معاملہ میں بے پرواہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

ایک روایت میں اس حدیث کے اس فقرے کے بہ جائے جس میں پڑوسی کا ذکر کیا گیا ہے یہ فقرہ آیا ہے: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ "جو شخص اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔"

امام ابن زید مالکیؒ نے کہا ہے کہ تمام آداب اور اخلاق حسنہ چار حدیثوں سے نکلتے ہیں: ایک حدیث تو یہی ہے۔ دوسری ہے: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ۔ (مالک، احمد، ابن ماجہ، ترمذی، البیہقی فی شعب الایمان) "آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے لیے بے فائدہ ہو۔" تیسری حدیث ہے: لَا تَغْضَبْ (بخاری عن ابی ہریرہؓ) "غصہ نہ کر" اور چوتھی حدیث ہے: لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ اَوْ قَالَ لِجَارِهٖ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (مسلم عن انس بن مالکؓ) "تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی

کے لیے یا فرمایا اپنے ہم سایہ کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ صَمَتَ نَجَا۔

(احمد، ترمذی، دارمی، بیہقی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "جس نے خاموشی اختیار کی، نجات پائی۔"

تشریح: خاموشی سے کتنی ہی بھلائیاں وابستہ ہیں اور اس کے ذریعہ سے آدمی دنیا و آخرت کی کتنی ہی آفتوں اور برائیوں سے مامون و محفوظ رہتا ہے۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی دوزخ میں زیادہ تر زبان ہی کی بے باکیوں کی وجہ سے اوندھے منہ گرائے جاتے ہیں۔ یہ حدیث "من صمت نجا" بہت ہی جامع ہے۔ الفاظ کے لحاظ سے یہ حدیث نہایت مختصر ہے لیکن مفہوم اور مطالب اس کے بہت وسیع ہیں۔ اس حدیث میں سکوت کے بہ جائے صمت لفظ آیا ہے جو نہایت بلیغ ہے۔ صمت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بولنے پر قادر ہے لیکن وہ قصداً خاموشی اختیار کرتا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: یَا اَبَا ذَرٍّ اَلاَ اَدُلُّکَ عَلٰی خَصْلَتَیْنِ هُمَا اَخَفُّ عَلَی الظَّهْرِ وَ اَثْقَلُ فِی الْمِیْزَانِ؟ قَالَ: قُلْتُ بَلٰی، قَالَ: طُوْلُ الصَّمْتِ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا۔

(البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے ابوذر! کیا میں تمھیں دو ایسی خصلتیں نہ بتاؤں جو بہت ہی ہلکی ہیں پشت پر اور بہت ہی باوزن ہیں میزان میں؟" انھوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپؐ ضرور بتائیں۔ آپؐ نے فرمایا: "درازی خاموشی کی اور حسن اخلاق۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، خلق نے ان کے مثل کوئی عمل نہیں کیا۔"

تشریح: نبی ﷺ نے جن دو پسندیدہ چیزوں کا ذکر فرمایا وہ کتنی آسان ہیں، وہ کسی کے لیے کوئی گراں بار بوجھ نہیں ہیں لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے ان کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ وہ خود تو ہلکی اور آسان ہیں مگر اپنے اختیار کرنے والے کو وہ نہایت باوزن بنا دیتی ہیں۔

ایک خصلت ہے زیادہ خاموش رہنے کی عادت۔ جو شخص بھی بے ضرورت زبان نہیں کھولے گا، نامناسب اور ناپسندیدہ باتوں سے احتراز کرے گا، لازماً وہ زیادہ خاموش رہے گا، بولے گا کم۔ حضور (ﷺ) کے بارے میں صحابہؓ کا بیان ہے: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَوِيْلَ الصَّمْتِ۔ ''رسولِ خدا (ﷺ) زیادہ خاموش رہتے تھے۔''

وَلاَ يَتَكَلَّمُ اِلَّا فِيْمَا يَرْجُوْ ثَوَابَهٗ۔ ''آپ وہی بات کرتے تھے جس میں آپ کو اجر و ثواب کی امید ہوتی تھی۔''

یہ حدیث اس کا بین ثبوت ہے کہ لوگوں کے اعمال میں یہ دونوں چیزیں یعنی زیادہ خاموشی اور حسنِ اخلاق بے مثل ہیں۔ کوئی عمل درجہ میں ان سے فائق و برتر نہیں۔

(۴) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ وَ اَبِیْ خَلَّادٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: قَالَ: اِذَا رَأَيْتُمُ الْعَبْدَ يُعْطٰى زُهْدًا فِى الدُّنْيَا وَ قِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ۔

(البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو خلادؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اسے دنیا کی طرف سے بے رغبتی و بے رخی اور کم گوئی نصیب ہے تو اس کا قرب اختیار کرو کیوں کہ اسے حکمت کا القاء ہوتا ہے۔''

تشریح: یعنی وہ حقیقت آشنا ہوتا ہے۔ خدا کی جانب سے اس کے دل میں حکمت القا ہوتی ہے اس کی زبان ترجمانِ حق بن جاتی ہے۔ اس کے منہ سے جو کلمات نکلتے ہیں وہ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ خدا کی اس پر خاص عنایت ہے۔ خدا نے اسے بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑا ہے بلکہ وہ اس کی رہ نمائی فرماتا رہتا ہے۔ اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے صحیح اور فائدہ بخش ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی صحبت پُر اثر ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو ہی نہیں، اس کی خاموشی اور اس کی نگاہ میں بھی جادو کا سا اثر ہوتا ہے جس سے زندگیاں بدل سکتی ہیں۔

(۵) وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ مِنَ الْوَحْدَةِ وَ اِمْلَاءُ الْخَيْرِ خَيْرٌ مِّنَ السُّكُوْتِ وَالسُّكُوْتُ خَيْرٌ مِّنْ اِمْلَاءِ الشَّرِّ۔ (بیہقی)

ترجمہ: حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے

ہوئے سنا ہے کہ برے ہم نشین سے اکیلے رہنا اچھا ہے۔ اور نیک ہم نشین تنہائی سے بہتر ہے۔ اور بھلائی کی باتیں سکھانا خاموشی سے بہتر ہے اور سکوت و خاموشی بری باتیں سکھانے سے بہتر ہے۔"

تشریح: آدمی اپنے ہم نشینوں کے اثرات قبول کرتا ہے۔ ساتھی اگر اچھے ہیں تو آدمی پر اس کے اچھے اثرات پڑیں گے اور اگر ساتھی برے ہیں تو وہ ان کے برے اثرات قبول کرے گا۔ اچھے ہم نشین کا بدل برے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اگر اچھے ساتھی میسر نہیں ہیں تو برے لوگوں کی ہم نشینی سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ آدمی ان سے اپنے کو دور ہی رکھے۔ لیکن اچھے لوگوں کی موجودگی میں تنہائی اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا کیوں کہ اس طرح اچھے لوگوں کے فیض سے وہ محروم رہ جائے گا۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ وہ لوگ جو ایمان و کردار کے لحاظ سے اتنے مضبوط اور پختہ ہو چکے ہیں کہ برے لوگوں کی برائیوں کا اثر قبول نہیں کر سکتے وہ اگر بروں کی اصلاح کی غرض سے ان سے ربط و تعلق رکھتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے روابط رکھیں تاکہ اپنے شخصی اثرات اور اپنی کوششوں کے ذریعہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لاسکیں۔

بھلائی کی اشاعت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ شخص جو خیر اور بھلائی سے لوگوں کو باخبر کرنے کی غرض سے بات کرتا ہے وہ اس شخص سے بہتر ہے جو خاموش رہتا ہے۔ البتہ اُس گفتگو سے جو برے مقاصد کے لیے ہو خاموشی ہی بہتر ہے۔ معلوم ہوا کہ خاموشی یا گفتگو بہ ذات خود مطلوب نہیں بلکہ ہماری گفتگو کو بامقصد ہونا چاہیے اور ہماری خاموشی بھی معنی رکھتی ہو۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِی ذَرٍّؓ قَالَ: دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَذَکَرَ الْحَدِیْثَ بِطُوْلِہٖ اِلٰی اَنْ قَالَ قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اَوْصِنِیْ۔ قَالَ: اُوْصِیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ اَزْیَنُ لِاَمْرِکَ کُلِّہٖ۔ قُلْتُ: زِدْنِیْ، قَالَ: عَلَیْکَ بِتِلَاوَۃِ الْقُرْاٰنِ وَ ذِکْرِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّہٗ ذِکْرٌ لَّکَ فِی السَّمَآءِ وَ نُوْرٌ لَّکَ فِی الْاَرْضِ۔ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: عَلَیْکَ بِطُوْلِ الصَّمْتِ فَاِنَّہٗ مُطْرِدَۃٌ لِّلشَّیْطَانِ وَ عَوْنٌ لَّکَ عَلٰی اَمْرِ دِیْنِکَ۔ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: اِیَّاکَ وَ کَثْرَۃَ الضِّحْکِ فَاِنَّہٗ یُمِیْتُ الْقَلْبَ وَ

يَذْهَبُ بِنُوْرِ الْوَجْهِ. قُلْتُ: زِدْنِیْ. قَالَ: قُلِ الْحَقَّ وَ اِنْ كَانَ مُرًّا. قُلْتُ: زِدْنِیْ. قَالَ: لاَ تَخَفْ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لاَئِمٍ. قُلْتُ: زِدْنِیْ. قَالَ: لِيُحَجِّزْكَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُ مِنْ نَّفْسِكَ. (بیہقی)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر انھوں نے طویل حدیث بیان کی یہاں تک کہ انھوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”میں تمھیں خدا کا ڈر رکھنے کی نصیحت کرتا ہوں کیوں کہ یہ چیز تمھارے سارے ہی کاموں کے لیے سب سے زیادہ زینت بخش ثابت ہوگی۔“ میں نے عرض کیا: کچھ مزید مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”تم پر قرآن کی تلاوت اور اللہ عزّ وجل کا ذکر لازم ہے، کیوں کہ یہ آسمان میں تمھارے ذکر کا موجب ہوگا اور زمین میں تمھارے لیے نور کا سبب بنے گا۔“ میں نے عرض کیا: کچھ مزید فرمائیں۔ فرمایا: ”تم پر طویل خاموشی لازم ہے، اس لیے کہ یہ چیز شیطان کو دور کرنے والی اور تمھارے کارِ دین میں تمھاری مددگار ہے۔“ میں نے عرض کیا: کچھ اور فرمائیں۔ فرمایا: ”زیادہ ہنسنے سے بچو، کیوں کہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہوجاتا ہے اور اس سے چہرے کا نور زائل ہوجاتا ہے۔“ میں نے عرض کیا: کچھ اور فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”سچی بات کہو اگرچہ وہ تلخ ہو۔“ میں نے عرض کیا: کچھ مزید فرمائیں۔ فرمایا: ”اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو۔“ میں نے گزارش کی: میرے لیے کچھ اور فرمائیں۔ فرمایا: ”لوگوں کی عیب گیری سے تمھیں وہ علم روک دے جو تمھیں خود اپنے بارے میں حاصل ہے۔“

تشریح: آپؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ ہمارے سارے ہی کاموں کی درستی کا انحصار تقویٰ پر ہے۔ دنیا اور آخرت کے تمام امور کی درستی کی کنجی تقویٰ ہی ہے۔ تقویٰ کے بغیر سارے کام بگڑ جاتے ہیں۔ لوگ اگر تقویٰ اختیار کرلیں تو ان کے باہمی معاملات میں بھی کسی قسم کی کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ لوگوں کے سارے جھگڑے اور شکایتیں ختم ہوجائیں۔

تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کے ذریعہ سے آدمی کا رشتہ وتعلق عالم بالا اور حقیقت کی دنیا سے قائم ہوجاتا ہے۔ اس طرح زمین میں رہ کر بھی آدمی، عالمِ بالا کا باشندہ ہوجاتا ہے۔ وہ عالمِ بالا میں معروف ہوجاتا ہے اور دنیا کی زندگی میں یہ چیز اس کے لیے نور ثابت ہوتی ہے۔ اس

کی زندگی روشن اور منوّر ہو جاتی ہے۔ زندگی میں کوئی بے رونقی اور خرابی باقی نہیں رہتی۔ زندگی کی صحیح راہ انسان پر واضح ہو جاتی ہے۔

آپؐ کے ارشاد سے خاموشی کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتنی ہی دینی اور دنیوی آفات کا شکار آدمی زیادہ بولنے اور کثرتِ گفتار کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب زیادہ بولنے اور بولتے رہنے کی عادت آدمی کو ہو جاتی ہے تو صحیح اور غلط کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ تزئینِ گفتگو کے لیے بہت سی بے بنیاد باتیں اسے تصنیف بھی کرنی پڑتی ہیں۔ بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ زیادہ بولنے والوں کی گفتگو بے وزن اور بکواس ہوتی ہے۔ غیبت، بدزبانی، کذب بیانی کے مرتکب بھی وہ اکثر ہو جاتے ہیں۔

کم گوئی اور خاموشی جب کسی کا شعار ہوگا تو وہ جو کچھ کہے گا سوچ کر اور حق کی میزان میں تول کر کہے گا، پھر غلطی اور گناہ کا امکان بھی کم رہے گا۔ زیادہ بولنے سے بولنے والے کا وقار گھٹ جاتا ہے۔ وہ خود اپنے رویّہ سے اپنی باتوں کی قیمت گھٹاتا ہے۔ قیمتی چیز آدمی اس طرح بے دریغ تو خرچ نہیں کرتا بلکہ سوچ سمجھ کر اور موقع و محل دیکھ کر کرتا ہے۔

کم بولنے کی وجہ سے آدمی غور و فکر کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ غور و فکر کے بعد وہ جو کچھ زبان سے نکالے گا اس میں وزن ہوگا اور لوگوں پر اس کا اثر بھی مرتب ہوگا۔

زیادہ بولنے والے بالعموم یہ نہیں دیکھ پاتے کہ کون سی بات کہنے کی ہے اور کون سی بات کہنے کی نہیں ہے۔ کبھی سننے والوں کی محض دل چسپی اور ان کی مانگ کی رعایت کرنا ہی ان کا پیشہ بن جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ جس ذوق اور تقاضے کی رعایت کرتے چلے جا رہے ہیں وہ ستھرا ذوق ہے یا بگڑا ہوا۔ ان کا تقاضا صحیح ہے یا غلط۔ اس قسم کے زیادہ بولنے والے لوگوں کے لیے کتابِ الٰہی اور دینی کتب کا مطالعہ بارگراں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے سستے جذبات کی تسکین کا سامان تو یاوہ گوئی میں ہوتا ہے۔ ان کا بگڑا ہوا ذوق دوسرے لوگوں کے ذوق کو بھی بگاڑ دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بھی ان کے زیرِ اثر آ کر تلاوت اور مطالعہ، غور و فکر اور تدبّر کی دولت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یاوہ گو کے زمرے میں وہ صحافی اور خاکہ نگار بھی آتے ہیں جو اسلامی ذوقِ ادب ـــــ جس کا بہترین نمونہ قرآن و حدیث کی شکل میں ہمارے سامنے ہے ـــــ کو مجروح کرتے ہوئے لوگوں کے سستے اور نامہذّب جذبات سے کھیلنے اور اپنا رنگ جمانے کی سعیِ نامحمود کرتے ہیں۔

خاموشی کی دولت پا کر آدمی ان تمام ہی آفات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس طرح شیطان کو اپنے سے دور کرنے میں اسے پوری کام یابی حاصل ہوتی ہے۔

منفی انداز سے ہی نہیں، مثبت طور پر بھی یہ خاموشی دین میں آدمی کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسے غور و فکر کا موقع میسر آتا ہے۔ پھر وہ بولتا ہے تو اس کا بولنا ذکر بن جاتا ہے۔ نطق، ذکر اسی صورت میں بنتا ہے جب صَمۡت (خاموشی) فکر بن جائے۔ جہاں نطق ہی نطق ہو وہاں اوّل تو ذکر سرے سے پایا ہی نہیں جائے گا، کیوں کہ ذکر خود صمت کا متقاضی ہوتا ہے۔ دوسرے جہاں نطق ہی نطق ہے وہاں اگر ذکر ہوگا بھی تو روح و اثر سے خالی ہوگا۔

زیادہ بولنے والا اس کا موقعہ ہی نہیں دیتا کہ غیب سے فیوض و برکات کا اس پر نزول ہو سکے اور اس کا دل علم و معرفت کا سرچشمہ بن جائے۔ زہد و خاموشی جن کا شعار ہوتا ہے ان ہی کے دلوں میں حکمت اگتی ہے یعنی دین کے حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر خدا ان کی رہ نمائی فرماتا ہے، اسے قوت فیصلہ حاصل ہوتی ہے۔ خدا اس کا حامی و ناصر ہو جاتا ہے۔ خدا کی یہ حمایت اسے ذہنی و فکری مسائل سے لے کر میدانِ عمل تک حاصل رہتی ہے۔ اس طرح ایک خاموشی بے شمار برکتوں اور بھلائیوں کی حامل ہوتی ہے۔ صحیح فرمایا مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہ ''خاموشی دین کے معاملہ میں تمھاری مددگار رہے۔''

یاوہ گو کی مثال اس نادان شخص کی ہے جو ادھر ادھر کی خبریں لیتا پھرتا ہو اور کبھی بھول کر بھی اپنی خبر نہیں لیتا۔ خاموشی آدمی کی خود اپنے آپ سے ملاقات کی حیثیت رکھتی ہے۔ خدا کی جانب کامل طور پر متوجہ ہونے کا اسے موقعہ حاصل ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان کے یہاں خاموشی ویرانی و بے مائگی کا نام ہرگز نہیں ہے۔ اہلِ ایمان کی خاموشیاں عرفانِ حقائق سے معمور ہوتی ہیں لیکن خاموشی کی لذتوں سے ناآشنا لوگ اس کو کم ہی سمجھ پاتے ہیں۔

ہنسی مذاق کی و در حقیقت انسان کی غفلت کی دلیل ہے۔ زیادہ ہنسی مذاق کا مشغلہ دل کو سخت بنا دیتا ہے۔ یہ قساوت قلبی دل کی موت ہے۔ موت سے جس طرح آدمی کا جسم بے حس ہو جاتا ہے اسی طرح دل کے مردہ ہو جانے کے بعد بھلائی و برائی کا احساس جاتا رہتا ہے۔ زندگی کے لطیف و نازک اشارے اور حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: اِنَّ اَبۡعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰہِ الۡقَلۡبُ الۡقَاسِیُ (ترمذی) ''وہ لوگ جو خدا سے بہت زیادہ دور ہیں سخت دل والے ہیں۔''

دل کی حالت اور کیفیت کا اثر چہرے سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔ دل کی موت چہرے کی رونق بھی چھین لیتی ہے۔ چہرے کی جاذبیت ختم ہوجاتی ہے۔ وہ بے وقار ہوجاتا ہے۔

آپؐ فرماتے ہیں کہ حق تجھے ہر پس و پیش سے بے گانہ کردے اور تیرے اندر وہ جرأت پیدا ہوجائے کہ تیرے لیے کوئی بھی چیز اظہارِ حق کی راہ میں مانع نہ ہوسکے۔ ملامت کرنے والے بے جا ملامتیں کرتے رہیں لیکن اس سے بے پرواہ ہوکر ہمیشہ تجھے اللہ کی عظمت اور اس کے حقوق کا پاس و لحاظ ہو۔ اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش ہی میں تجھے اپنی عزت محفوظ نظر آئے۔

آپؐ کی آخری نصیحت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کی عیب گیری کوئی پاکیزہ مشغلہ ہرگز نہیں ہے۔ جب کسی کی عیب گیری کا دل میں خیال پیدا ہو تو اپنے عیبوں پر نگاہ ڈالو کہ خود میرے اندر کتنی ہی کمزوریاں موجود ہیں، میں دوسرے کی عیب گیری اور اس کے عیوب کی تشہیر کیا کروں۔

قوت و شجاعت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ وَ فِیْ کُلٍّ خَیْرٌ اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَ اِنْ اَصَابَکَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ کَانَ کَذَا وَ کَذَا وَ لٰکِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَآءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مومنِ قوی بہتر اور خدا کے نزدیک محبوب تر ہے مومنِ ضعیف سے۔ اور یوں تو ہر ایک میں بھلائی اور خیر پایا جاتا ہے۔ جو چیز تیرے لیے نافع ہو اس کا حریص ہو اور خدا سے استعانت طلب کر اور عاجز نہ ہو۔ اور اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہہ کہ اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہوتا بلکہ کہہ کہ خدا نے یہی مقدّر فرمایا اور اس نے جو چاہا کیا، کیوں کہ ''اگر'' شیطان کے کام کا دروازہ کھولتا ہے۔''

تشریح: مومنِ ضعیف سے وہ مومن بہتر اور خدا کی نگاہ میں زیادہ پسندیدہ ہے جو قوی ہو یعنی کسی معاملہ میں جو کمزور ثابت نہ ہو۔ جس کا ایمان قوی ہو۔ جس کے عزم و ارادہ میں بھی کوئی ضعف نہ پایا جاتا ہو۔ جو خدا پر سب سے بڑھ کر بھروسہ رکھتا ہو۔ جو لوگوں کی ایذا رسانیوں سے بے پروا

ہو کر بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائے گی میں پیش پیش ہو۔ امورِ دین میں اور لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینے میں کوئی دشواری اس کے عزم و حوصلہ کو شکست دینے میں کام یاب نہ ہو سکے۔

بھلائی اور خیر سے کوئی بھی مومن خالی نہیں ہو سکتا۔ کم زوروں میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی لازماً پائی جاتی ہے جسے دین کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مومن قوی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

جو چیز نفع بخش ہو خاص طور سے جو دینی امور میں نافع ہو اس کی طرف سے ہرگز غافل نہ ہونا چاہیے بلکہ ایسی چیز کا تو آدمی کو حریص ہونا چاہیے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کی مدد سے کون سی چیز ہے جس کا حصول ناممکن ہو۔ اس لیے نہ تو کسی کو مطلوب شے کے حاصل کرنے میں کم زوری دکھانی چاہیے اور نہ اس کے سلسلے میں خدا سے طلبِ استعانت میں عاجز ہونا چاہیے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ یہ کہنا کہ اگر ہم نے ایسا کیا ہوتا تو ہم پریشانی میں نہ پڑتے صحیح نہیں ہے۔ اس سے آدمی کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور شیطان ہمیں بے حوصلہ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وساوس سے ہم کبھی نجات نہ پا سکیں۔ مصیبت اور پریشانی کے موقعہ پر ہمیں کہنا چاہیے کہ خدا نے ہمارے لیے یہی مقدّر کیا تھا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی مشیت حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ ہم اس کے فیصلہ پر راضی ہیں۔ بہرحال تقدیرِ الٰہی پر معارضہ کسی طرح سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں بھی آیا ہے: قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَاۚ هُوَ مَوْلٰىنَاۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○ (التوبہ:۵۱) ”کہہ دو، جو کچھ اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے اس کے سوا کچھ بھی پیش نہیں آ سکتا۔ وہی ہمارا آقا ہے اور اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

معلوم ہوا کہ جہاں تاسف کرنا بے فائدہ اور بے معنی ہو وہاں تاسف کرنا غلط ہے۔ ایسے موقع پر بندے کو خدا کے فیصلہ پر اپنی رضامندی ظاہر کرنی چاہیے۔ البتہ تاسف اگر طاعتِ الٰہی میں کسی کوتاہی پر ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ رنج و تاسف آئندہ کے لیے ایک انتباہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس تاسف کی بھی ایک حد ہے۔ اس رنج و تاسف کو اس درجہ ہرگز نہ بڑھنے دے کہ آدمی اسی میں گھلتا رہے اور کسی کام کا نہ رہ جائے۔ اپنی غلطی کے احساس ہو جانے پر آدمی توبہ و استغفار سے کام لے اور آئندہ کے لیے پختہ ارادہ کرے کہ وہ دینی امور میں اپنے یہاں کسی غفلت اور تساہل کا روادار نہ ہوگا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ یَّأْخُذُ مِنِّیْ ھٰذَا فَمَنْ یَّأْخُذُ بِحَقِّہٖ یَعْنِیْ سَیْفًا فَاَخَذَہٗ اَبُوْ دُجَانَۃَؓ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''کون مجھ سے یہ یعنی یہ تلوار لے گا؟ اس کو وہ شخص لے جو اس کا حق ادا کرے۔'' پھر اس کو ابودجانہؓ نے لیا۔

تشریح: غزوۂ احد کے موقعہ پر جب کہ حق و باطل کے درمیان سخت معرکہ پیش آیا، نبی ﷺ نے ہاتھ میں ایک تلوار لے کر فرمایا تھا کہ اسے کون لے گا ــــ کتنے ہی ہاتھ اسے لینے کے لیے بڑھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے وہی شخص لے جو اس کا حق ادا کر سکے یعنی جو داد شجاعت دے۔ معلوم ہوا کہ خیر و شر کی کشمکش میں شجاعت اور جواں مردی ہی کام آتی ہے۔ اسی لیے دین میں شجاعت کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

ذمہ دارانہ حیثیت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اِنَّ الْعَبْدَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَۃِ مِنْ رِّضْوَانِ اللّٰہِ لاَ یُلْقِیْ لَھَا بَالاً یَّرْفَعُ اللّٰہُ بِھَا دَرَجَاتٍ وَّ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَۃِ مِنْ سَخَطِ اللّٰہِ لاَ یُلْقِیْ لَھَا بَالاً یَّھْوِیْ بِھَا فِیْ جَھَنَّمَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''کبھی بندہ خدا کی رضامندی کی کوئی بات کرتا ہے اور وہ اس (بات) کی شان و وقعت کو نہیں جانتا جب کہ اس کی وجہ سے خدا اس کے درجات کو بلند فرماتا ہے۔ اور کبھی کوئی بندہ زبان پر ایسی بات لاتا ہے جو خدا کو ناراض کرنے والی ہوتی ہے اور وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا جب کہ وہ اس کے سبب سے جہنم میں گر جاتا ہے۔''

تشریح: ایسا ہوتا ہے کہ کبھی آدمی کو اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ اسے جو بات کہنے کی توفیق ہوئی ہے وہ کتنی بیش قیمت ہے۔ خدا کی رضامندی کی بات یعنی ایسی بات جس سے وہ خوش ہوتا ہے، کہنے سے اس کے درجات بلند ہوجاتے ہیں۔ کسی کی زبان سے نکلی ہوئی بات درحقیقت اس شخص کی حیثیت متعین کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا ان ہی باتوں سے خوش ہوسکتا ہے جو نازیبا، پست قسم کی گری ہوئی نہ ہوں۔ اس لیے خدا کی خوشنودی کی بات کرنے والا شخص پستی

میں نہیں رہ سکتا۔ اس کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اور اسے درجات میں بلندیاں بات کی قدرو قیمت کے لحاظ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور اس کے درجات بلند کرنے والا کوئی اور نہیں خود خدا ہوتا ہے۔ اب یہ بندے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ بلندی سے گر کر وہ پھر پستی میں نہ جا پڑے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی بات نہایت ہی غلط، نازیبا اور خدا کے غیظ وغضب کو بھڑکانے والی ہوتی ہے۔ لیکن اسے اس کی سنگینی کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ اور یہ چیز اسے لے ڈوبتی ہے۔ وہ جہنم میں گر جاتا ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔۔۔ یَھْوِیْ بِھَا فِی النَّارِ اَبْعَدَ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ ''وہ کلمہ اسے جہنم کی آگ میں اتنی دوری پر ڈال دیتا ہے جتنی دوری مشرق ومغرب کے درمیان پائی جاتی ہے۔'' غرضیکہ وہ جہنم کی انتہائی گہرائی میں جا گرتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَةِ مِنَ الْخَیْرِ مَا یَعْلَمُ مَبْلَغَھَا یَکْتُبُ اللّٰہُ لَہٗ بِھَا رِضْوَانَہٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاہُ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَا یَعْلَمُ مَبْلَغَھَا یَکْتُبُ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْہِ سَخَطَہٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاہُ۔ (شرح السنۃ، مالک، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت بلال بن حارثؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کبھی کوئی کلمۂ خیر زبان سے ادا کرتا ہے اور وہ اس کی قدر ومنزلت کو نہیں جانتا حالاں کہ اس کے سبب سے خدا اپنی خوش نودی اس کے لیے اس دن تک کے لیے لکھ دیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملاقات کرے گا۔ اور آدمی کبھی کوئی کلمۂ شر زبان پر لاتا ہے اور وہ اس کی حقیقت کو نہیں جانتا حالاں کہ اس کی وجہ سے خدا اس پر اپنے غیظ وغضب کو اس دن تک واجب کر دیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملاقات کرے گا۔''

تشریح: خدا کی خوش نودی اور خدا کی رضامندی کوئی وقتی اور عارضی چیز نہیں ہوتی، روزِ حشر تک کے لیے خدا اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد تو وہ خدا کی جنت کا مستحق ہوتا ہی ہے۔ اس کی شرح میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ ایسے شخص کو دنیا میں نیکی کی توفیق ملتی ہے۔ وہ قبر کے فتنوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کی قبر منوّر اور فراخ کر دی جاتی ہے۔ فرشتے اس سے کہتے ہیں: نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّتِیْ لَا یُوْقِظُھَآ اِلَّآ اَحَبُّ اَھْلِھَآ اِلَیْھَا حَتّٰی یَبْعَثَھَا اللّٰہُ مِنْ مَّضْجِعِھَا

(ترمذی) ''اس دلہن کی طرح محو خواب ہو جاؤ جس کو اس کے اہل میں سے سب سے محبوب شخص ہی جگا سکتا ہے، یہاں تک کہ خدا اسے اس کی خواب گاہ سے اٹھائے گا۔'' ترمذی کی اس حدیث کی سند حسن ہے یہ مسلم کی شرط پر پوری اترتی ہے۔

البتہ جس پر خدا کی خفگی ہوئی اس کا معاملہ اس شخص سے بالکل برعکس ہوگا جس کی پسندیدہ بات کی وجہ سے خدا اس سے راضی ہوگا۔

اس حدیث میں یہ جو فرمایا: اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاہُ (اس دن تک کے لیے جب کہ وہ خدا سے ملاقات کرے گا) اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ رضا اور غضب کا سلسلہ بس روزِ حشر تک کے لیے ہی ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ خدا کا جو فیصلہ کسی کے حق میں ہوگا وہ تو آخرت میں برقرار ہی رہے گا، اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں شیطان کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وَ اِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْٓ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِo (ص: ۷۸) ''اور یقیناً روزِ جزا تک تجھ پر میری لعنت ہے۔'' ظاہر ہے یومِ جزا کے بعد یہ لعنت ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ مراد یہ ہے کہ قیامت تک تو پھٹکار اور لعنت اس پر برستی رہے گی اور اس کے بعد لعنت کے ساتھ گرفتارِ عذاب بھی ہوگا تاکہ وہ اپنے جرم کی سزا بھی بھگتے۔

رائے کی مضبوطی

(۱) عَنْ حُذَیْفَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تَکُوْنُوْا اِمَّعَۃً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَ اِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَ لٰکِنْ وَّطِّنُوْا اَنْفُسَکُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَ اِنْ اَسَاءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اِمَّعہ نہ بنو کہ کہنے لگو کہ لوگ نیکی اور بھلائی کریں گے تو ہم بھی نیکی اور بھلائی کی روش اختیار کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ بلکہ اپنے دلوں کو ٹکا دو، اگر لوگ نیکی کریں تو تم پر لازم ہے کہ نیکی کرو اور اگر وہ برائی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔''

تشریح: اِمَّعہ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنی رائے پر قائم نہ ہو بلکہ عقل میں دوسروں کا تابع ہو کر ہو رہے۔ امعۃ میں 'ۃ' مبالغہ کے لیے ہے۔ عورت کو امعۃ نہیں کہتے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ یہ طرزِ عمل ہرگز درست نہیں ہے کہ تمھارا فیصلہ دوسروں کے فیصلوں کے تابع ہو اور تم یہ کہو کہ لوگ ہمارے ساتھ جیسا طرزِ عمل اختیار کریں گے وہی طرزِ عمل ہمارا ان کے ساتھ ہوگا۔ بلکہ تمھاری اپنی کوئی رائے اور سوچا سمجھا طریقہ ہونا چاہیے جس پر تم مضبوطی سے کاربند ہو۔ غلط کار لوگوں کی غلط کاری ہرگز پیروی کے لائق نہیں ہوسکتی۔

برائی سے پیش آنے والوں کے ساتھ تمھیں ظلم کی روش ہرگز اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ اگر تم پر کوئی ظلم کرتا ہے تو تم حد سے تجاوز نہ کرو۔ اگر ظلم کا بدلہ لینا ہی ہے تو اس بات کا خیال رہے کہ بدلہ لینے میں کسی قسم کا ظلم اور زیادتی ہرگز روا نہیں ہے۔ اس معاملہ میں شریعت کا پورا پاس و لحاظ رکھو۔ پسندیدہ بات تو یہ ہوگی کہ ظلم کے جواب میں عفو و درگزر سے کام لو اور ظلم کرنے والے کو معاف کردو۔ حضور اکرم (ﷺ) نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ اور اگر تم اسے صرف معاف ہی نہ کرو بلکہ مزید اس پر احسان بھی کرو تو یہ سب سے بلند مرتبہ کی بات ہوگی۔ اور یہ مرتبہ صدیقین کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ قرآن میں بھی ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الشوریٰ: ۴۰) ''برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، مگر جو معاف کردے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ یقیناً وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ حدیث ان الفاظ میں بھی مروی ہے: لَا يَكُنْ اَحَدُكُمْ اِمَّعَةً يَّقُوْلُ اَنَا مَعَ النَّاسِ، اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنْتُ وَ اِنْ اَسَآءُوْا اَسَأْتُ وَ لٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَ اِنْ اَسَآءُوْا اَنْ تَجْتَنِبُوْآ اِسَآءَ تَهُمْ۔ (ترمذی) ''تم میں سے کسی کو امّعہ (ڈھل مِل) نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہے کہ میں تو لوگوں کے ساتھ ہوں، اگر وہ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کام کروں گا۔ اور اگر وہ برا کرتے ہیں تو میں بھی برا طرزِ عمل اختیار کروں گا۔ نہیں، بلکہ اپنے آپ کو ایک بات پر قائم رکھو۔ اگر لوگ اچھا کام کریں تو تم اچھا کام کرو اور اگر وہ برا کام کریں تو ان کی برائی سے کنارہ کشی اختیار کرو۔''

آج کتنے ہی برے کام لوگ بگڑے ہوئے سماج کے بگڑے ہوئے لوگوں کی اندھی پیروی میں کرتے ہیں۔ آدمی کو خود ہر ایک کام کے حسن و قبح پر غور کرکے ایک سنجیدہ فیصلہ کرنا چاہیے اور پھر اس فیصلہ پر استقلال کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اور اگر کوئی کام برا ہے تو لوگوں

کے اسے اختیار کرنے کے بعد بھی وہ براہی رہے گا۔ ایسے کام سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی فلاح وکامیابی کی صحیح راہ ہے۔

اس حدیث میں کردار سازی کی اہم تعلیم دی گئی ہے۔ کردار سازی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا اپنی زندگی کے بارے میں ایک سوچا سمجھا سنجیدہ فیصلہ ہو۔ یہ نہیں کہ اس کا اپنا کوئی ارادہ اور فیصلہ ہی نہ ہو اور وہ دوسروں کے پیچھے دوڑنے پر مجبور ہو۔ ایسا شخص بے کردار ہوگا۔ کردار کے لیے لازم ہے کہ آدمی کی مختلف خواہشات کے مابین وحدت قائم ہو اور اس کے اعمال اسی وحدت کے آئینہ دار ہوں Ospunskey نے یہ بات بہت صحیح کہی ہے کہ جب تک انسان اس طرح کی وحدت قائم نہ کرلے اسے اپنے کو 'انا' کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس کا تو اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔ ارادہ ہمیشہ خواہشات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس شخص کی خواہشات مستقل اور کسی دائمی قدر کے تابع نہ ہوں وہ اپنے جذبات اور خارجی تاثرات کا محض کھلونا ہوگا۔ ایسے شخص کی زندگی اتفاقات کے پردوں میں گم ہوتی ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ آئندہ کیا اقدام کرے گا اور دوسرے سانس میں اس کی زبان پر کیا بات آئے گی۔

جب تک زندگیوں میں توافق اور وحدت کی جلوہ گری نہ ہو معاشرہ میں بھی توافق اور وحدت کی جلوہ گری ممکن نہیں۔ اخلاق وکردار کی تعمیر اور خواہشات وجذبات میں وحدت وتوافق قائم کرنے کے لیے کچھ بنیادی چیزیں درکار ہیں:

۱- زندگی کی کچھ مستقل اور دائمی قدریں ہوں اور آدمی کو ان کا علم ہو اور وہ ان پر ایمان لائے۔

۲- زندگی کی کوئی بنیادی غرض وغایت ہو جو مادی اور افادی نقطۂ نگاہ سے بلند ہو۔ کائنات اور کائنات میں پائی جانے والی اشیاء کی حیثیت درحقیقت محض ایسے سامان واسباب کی ہے جس کے ذریعہ سے روح انسانی اپنے اصل مقصد کو حاصل کرسکے۔

۳- اس سلسلہ میں تیسری مطلوب چیز یہ ہے کہ انسان کا تسلسل حیات پر یقین ہو۔ دائمی حیات کے بغیر دائمی اور مستقل قدروں کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک آدمی اس پر یقین نہ رکھتا ہو کہ اس کے افکار واعمال اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں اس وقت تک کسی مستحکم سیرت وکردار کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جس معاشرے کے افراد کا منتہائے خیال قریبی اور فوری مفاد کا حصول ہو ان سے کسی اعلیٰ کردار کی توقع ممکن نہیں۔

۴- ان تمام بنیادی چیزوں کا وجود خدا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ کردار و اخلاق کو استحکام اسی صورت میں میسر آسکتا ہے جب کہ یہ دنیا بے خدا نہ ہو۔ خدا نے انسان کو بامقصد زندگی عطا کی ہو اور دائمی اقدارِ حیات سے اسے آگاہ فرمایا ہو اور اس سے باخبر کیا ہو کہ دنیا کی زندگی ہی زندگی نہیں ہے۔ انسان ابدی حیات کا مستحق ہو سکتا ہے اگر وہ خدا کے عطا کردہ مقصدِ حیات سے گریز اختیار نہ کرے بلکہ اپنے کو اعلیٰ اخلاق و کردار کا پابند بنائے۔

انبیاء علیہم السلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لیے وہ ساری مطلوبہ چیزیں فراہم کر دیتے ہیں جن کی ضرورت سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے پیش آتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کا فرض ہے کہ وہ انبیاء کی تعلیمات کو اختیار کرے اور خود کو اور اپنے معاشرہ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ انبیاء کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں ان کا ایمان اس کا متقاضی ہے کہ وہ مضبوط کردار کے حامل ہوں۔ غافل اور بھٹکے ہوئے لوگوں کا اتباع کرنے کے بہ جائے وہ ہمیشہ سچائی کی پیروی کریں اور اس کردار کو ہرگز داغ دار نہ ہونے دیں جو ان کے ایمان کا آئینہ دار ہے۔ لوگ اگر زندگی میں صحیح طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں تو مطلوب بھی یہی ہے لیکن اگر وہ غلط طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں تو ان کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں ہر حال میں بھلائی اور نیکی کی راہ پر چلنا ہے۔

سماج میں لوگوں میں عام طور پر یہ کم زوری پائی جاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی کم زوریوں کو اپنے لیے بہانہ بناتے ہیں کہ فلاں شخص تو پیچھے ہے تو ہم کیوں خدمتِ حق میں آگے بڑھیں۔ فلاں شخص تو قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تو آخر ہم ہی اپنی جان کیوں کھپائیں۔ فلاں شخص تو کاروبار میں ناجائز طریقہ اپنا کر اپنی آمدنی میں غیر معمولی اضافہ کر رہا ہے، آخر ہم کیوں اپنے کو محروم رکھیں۔ یہ اندازِ فکر اہلِ ایمان کا نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص تو اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ابھی تک ایمان و یقین کی حقیقت و کیفیت سے نا آشنا ہے۔ ابھی ایمان اس کے دل میں ٹھیک سے اترا ہی نہیں ہے۔

اس حدیث کے یہ الفاظ لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہیں: وَطِّنُوْا اَنْفُسَکُمْ۔ ''اپنے دل کو ایک چیز پر ٹکا دو'' ایسا نہیں کرتے تو ہماری حالت خانماں برباد کی ہوگی۔ جس کا کوئی وطن (Native land) نہ ہو۔ جو بے گھر ہو کر ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا ہو۔ حق نے ہمارے

لیے جو نظریات وتصوّرات فراہم کیے ہیں ان کی حیثیت ہماری رُوح کے لیے ایک بہترین جائے قرار اور وطن کی ہے۔ ہمیں اسی وطن کی شہریت اختیار کرنی چاہیے۔

ثبات واستقامت

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِکْلَفُوْا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰہَ لاَ یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا فَاِنَّ اَحَبَّ الْعَمَلِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُہٗ وَ اِنْ قَلَّ وَ کَانَ اِذَا عَمِلَ عَمَلاً اَثْبَتَہٗ۔ (ابوداوٗد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم عمل اپنی طاقت کے مطابق اختیار کرو کیوں کہ خدا (اجر دینے میں) نہیں تھکتا جب تک کہ تم (عمل کرتے کرتے) نہ تھک جاؤ۔ تم یہ طرزِ عمل اس لیے بھی اختیار کرو کہ خدا کو وہ عمل پسند ہے جس پر مداومت اختیار کی جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔'' اور آپؐ جب کوئی عمل اختیار کرتے تو ہمیشہ اس کی پابندی فرماتے۔

تشریح: آدمی اپنی قوت واستطاعت کے لحاظ سے ہی مکلّف ہے۔ اس کو اعمال میں وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جو اس کی سیرت کا مظہر بن سکے۔ وقتی جوش وخروش میں آکر کوئی شخص ایسا کام کرنے لگ جاتا ہے جس کی طاقت واستطاعت اس کے اندر نہیں ہے۔ وہ دیر تک اس پر قائم نہ رہ سکے گا۔ اس لیے عبادت وزہد وغیرہ اسی قدر پسندیدہ ہے جس پر مداومت اختیار کرنے پر آدمی قادر ہو۔ خدا اجر وثواب دینے میں نہیں تھکتا لیکن آدمی عمل کرنے سے تھک سکتا ہے۔ اس لیے اسے اپنی طاقت کو دیکھتے ہوئے عمل کرنا چاہیے تاکہ اس کے لیے اس کی پابندی ممکن ہو سکے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خود حضور اکرم (ﷺ) کی سنت یہی رہی ہے کہ آپ کسی عمل کو اختیار فرماتے تو اسے ترک نہیں کرتے تھے۔

بخاری ومسلم میں یہ حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: خُذُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰہَ لاَ یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا۔ ''اعمال میں سے جتنا کرسکو اتنا ہی اختیار کرو کیوں کہ خدا نہیں تھکتا جب تک تم نہ تھکو۔'' یعنی تنگ آکر عمل کرنا نہ چھوڑ دو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْھَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا وَ اِنْ قَلَّ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک بہترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔''

تشریح: جو عمل ہمیشہ کیا جاتا ہے وہی عمل معتبر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ آدمی کا اصل عمل وہی ہے جس پر وہ قائم رہتا ہے، وہی اس کے کردار اور اس کی سیرت کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔ پھر جو عمل استقلال کے ساتھ کیا جاتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو وہی نتیجہ خیز بھی ہوتا ہے۔ جس کام کو کر کے آدمی ہمیشہ کے لیے یا طویل مدت کے لیے چھوڑ دے اس سے کسی خاص نتیجہ واثر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ آدمی کا اصل عمل وہی ہے جو اس نے بے دلی کے ساتھ نہیں بلکہ خوش دلی اور نشاط کے ساتھ کیا ہو۔ کیوں کہ اس کے بغیر حقیقت میں ہم عمل کے ساتھ نہ ہو کر کہیں اور ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا ہے: لِيُصَلِّ اَحَدُكُمْ نِشَاطَهٗ وَ اِذَا فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ۔ (بخاری ومسلم) ''تم میں سے کوئی جب تک نشاط کے ساتھ نماز پڑھ سکے پڑھے، جب سست ہو جائے تو اسے بیٹھ جانا چاہیے۔''

﴿۳﴾ وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّؓ قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلاً لَّا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ وَ فِيْ رِوَايَةٍ غَيْرَكَ۔ قَالَ: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اسلام کے بارے میں آپؐ مجھے کوئی ایسی بات بتادیں کہ پھر آپؐ کے بعد اس کے متعلق کسی سے کچھ دریافت کرنے کی مجھے حاجت نہ ہو۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ پھر آپؐ کے سوا کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت مجھے پیش نہ آئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اسی پر قائم رہو۔''

تشریح: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ کا منشاء یہ تھا کہ انھیں ایسی بات بتادی جائے جو اتنی جامع اور بامعنیٰ ہو کہ وہی اسلام کا ماحصل ہو اور وہی میرے لیے زندگی کی رہنما بن جائے۔ پھر مجھے اسلام کی حقیقت کو سمجھنے اور اس کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ

متعین کرنے اور اپنی سیرت اور کردار کی تعمیر کے سلسلے میں کسی سے مزید کچھ رہ نمائی حاصل کرنے کی کبھی کوئی ضرورت پیش نہ آئے۔

آپؐ کے ارشادِ مبارک سے معلوم ہوا کہ ایمان باللہ یعنی ایک خدا پر ایمان ہی اسلام کا اصل ماحصل ہے۔ باقی جتنے عقائد و احکام کی تعلیم اسلام میں دی گئی ہے وہ درحقیقت ایک خدا پر ایمان ہی کا مقتضا ہے۔ خدا پر ایمان یعنی اس کی ربوبیت، الوہیت اور محبوبیت کے اقرار سے زندگی وہ شکل اختیار کر لیتی ہے جس سے بہتر اور جس سے حسین تر اور سکون بخش زندگی کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ وہی زندگی ہے جسے مومن کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حدیث میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ خدا کی کتاب قرآن سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ؕ (الاحقاف:۱۳)

”یقیناً جنھوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے، تو انھیں نہ کوئی خوف ہوگا ـــــ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

حقیقت یہ ہے کہ زندگی جس چیز سے عبارت ہے وہ بس یہی ہے کہ انسان اپنے منبع حیات یعنی خدا سے آشنا ہو۔ اس کی اصل وابستگی خدا ہی سے ہو۔ وہی اس کا سہارا اور اس کی ساری تمناؤں کا مرکز و محور ہو۔ وہی اس کے جذبۂ شوق کی پناہ گاہ ہو۔ اس سے ملنے کی آرزو ہی میں وہ جیتا ہو اور اسی کے لیے وہ خاک میں ملنے کی تمنا رکھتا ہو۔ اسی کی رضا و خوش نودی کی طلب اسے میدانِ عمل میں سرگرم رکھتی ہو۔ اسی کی عظمت اور بڑائی سے وہ دنیا کو باخبر کرنے کے لیے کوشاں ہو۔ اسی کے احکام کے نفاذ کی آرزو اسے باطل سے نبرد آزما رکھتی ہو۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۝ۙ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ (یونس:۷-۸) ”وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا ہی کی زندگی پر راضی ہو کر رہ گئے ہیں اور اسی پر وہ مطمئن ہو گئے اور وہ جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا اس کے بدلہ میں جو وہ کماتے رہے، آگ ہے۔“

اس میں شبہ نہیں کہ لقائے رب کی تمنا مومن کے لیے حرارت حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اس کی قوت اور اس کی زندگی کی آبرو ہے۔

غصّہ پر قابو

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ يَّكْظِمُهَا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی بندے نے کوئی گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ عزوجل کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جسے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوش نودی کی خاطر پی جائے۔''

تشریح: غصہ کا انجام نہایت خطرناک ہوا کرتا ہے، اسی لیے غصّہ کا گھونٹ پینا خدا کے نزدیک دوسری ہر چیز کے گھونٹ پینے سے بہتر ہے، بہ شرطیکہ یہ گھونٹ آدمی محض خدا کی رضا کی خاطر پیے۔ اس کا کوئی دوسرا محرک نہ ہو۔ غصّہ کو وہی شخص ضبط کرنے پر قادر ہوسکتا ہے جس کے اندر لوگوں کے قصور اور ان کے ظلم و ستم کو معاف کرنے کی سکت پائی جاتی ہو اور جسے خدا کی خوش نودی دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب ہو۔ قرآن میں اہلِ تقویٰ کی صفات کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے:
وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (آل عمران: ۱۳۴) ''اور وہ غصہ کو ضبط کرتے اور لوگوں سے درگزر کا معاملہ کرتے ہیں۔''

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَوْصِنِيْ۔ قَالَ: لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ ذٰلِكَ مِرَارًا، قَالَ: لَا تَغْضَبْ۔ (بخاری، موطا، امام مالک)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپؐ مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''غصہ نہ کر۔'' اس شخص نے کئی بار یہی درخواست کی اور آپؐ نے ہر دفعہ یہی ارشاد فرمایا: ''غصہ نہ کر۔''

تشریح: نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر ایک شخص کو اس کے سوال کا جواب اس کے مناسب حال دیتے تھے۔ سائل کے اندر غصہ کا غلبہ تھا۔ اسی لیے آپؐ نے اسے غصہ نہ کرنے کی تاکید فرمائی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ غصہ میں اکثر لوگ اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں اور انھیں حدود کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہیں

رہتا۔ غصہ میں زبان پر نازیبا الفاظ تو آتے ہیں آدمی کبھی اس سے بڑھ کر ایسا اقدام کر بیٹھتا ہے جس کا انجام نہایت ہول ناک شکل میں سامنے آتا ہے۔ اور اگر آدمی کوئی ایسا اقدام نہ بھی کرے تو بھی دل تو اس کا بغض و کینہ سے بھر ہی جاتا ہے۔

نبی اکرم (ﷺ) کی یہ نصیحت ایسی ہے کہ اگر کوئی اس پر عمل پیرا ہو تو وہ بہت جلد اخلاقی خوبیوں کا پیکر بن سکتا ہے۔ غصہ آنے پر ہمیں سوچنا چاہیے کہ خدا کا غضب اور غصّہ تو سب سے بڑا ہے پھر بھی درگزر سے کام لیتا ہے۔ کتنے ہی لوگ دن رات اس کی نافرمانیاں کرتے رہتے ہیں لیکن وہ درگزر فرماتا ہے اور ان کی نافرمانی پر انھیں فوراً نہیں پکڑتا۔

〈۳〉 وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”پہلوان اور طاقت ور وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ شہ زور اور پہلوان تو حقیقت میں وہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔“

تشریح: اس حدیث میں غصّہ میں ضبط و تحمل سے کام لینے والوں کی تحسین فرمائی گئی ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت کا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدمی کو کسی بات پر غصّہ آئے ہی نہیں۔ نازیبا باتوں پر غصّہ کا آنا فطری ہے۔ شریعت کا اصل مقصود یہ ہے کہ غصّہ میں آدمی حدود سے ہرگز تجاوز نہ کرے، بلکہ اس حالت میں بھی اسے اپنے نفس پر پورا قابو ہو۔ وہ غصّہ سے مغلوب ہو کر ایسی حرکتیں کرنے سے جو مومن کے شایانِ شان نہیں ہوتیں باز رہے۔

〈۴〉 وَ عَنْ سَهْلِ بْنِ مَعَاذٍ عَنْ اَبِيْهِ ؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَّ هُوَ يَقْدِرُ عَلٰی اَنْ يُّنَفِّذَهٗ دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰی رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰی يُخَيِّرَهٗ فِیْ اَیِّ الْحُوْرِ شَآءَ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سہل بن معاذؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص غصّہ کو پی جائے حالاں کہ اسے اس پر قدرت حاصل ہے وہ اپنے غصّہ کو نافذ اور اس کے تقاضے کو پورا کر سکتا ہے۔ اللہ اسے قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے بلائے گا یہاں تک کہ اس کو اختیار دے گا کہ وہ جس حور کو بھی چاہے اپنے لیے منتخب کر لے۔“

تشریح: ساری مخلوق کے سامنے بلانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں اس کی توقیر بڑھائے گا، اسے شہرت دے گا اور اس پر فخر کرے گا۔

اپنے غصہ پر کوئی اقدامی کارروائی نہ کرنا جب کہ آدمی کو اس کی پوری قوت حاصل ہو اس سے اس کے جس جمالِ ذاتی اور اخلاقی حسن کا اِظہار ہوتا ہے اس کو اہلِ بصیرت بہ خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ جب اس شخص نے زندگی میں حسنِ اخلاق کو جو درحقیقت حیات کی اصل رعنائی و زیبائی ہے پسند کیا تو اس کا صلہ وہی کچھ ہونا چاہیے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ خدا اس سے فرمائے گا کہ تم نے دنیا میں قبیح طرزِ عمل اختیار نہ کر کے اپنے حسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے تو اب یہاں بھی پوری آزادی سے جنت کی جس خوب صورت سے خوب صورت حور کو چاہو اپنے لیے منتخب کر لو۔ عمل اور اس کی جزا میں مماثلت اور ہم آہنگی ہونی ہی چاہیے۔

اس حدیث میں غصہ پی جانے والے شخص کے مقامِ بلند کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ضبطِ غضب کے ساتھ اپنے مخالف شخص پر احسان بھی کرے تو اس کا کیا مرتبہ ہوگا۔ یہ ہمیں خود سوچنا چاہیے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ وَ هُوَ قَائِمٌ فَلْیَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَ اِلَّا فَلْیَضْطَجِعْ۔ (احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی شخص کو غصہ آئے تو چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے پھر اگر غصہ جاتا رہا تو خیر ورنہ چاہیے کہ لیٹ جائے۔“

تشریح: یہ غصہ پر قابو پانے کی ایک کارگر نفسیاتی تدبیر ہے۔ غصہ میں آدمی سے جو بے جا حرکات اور لغویات سرزد ہوتی ہیں بیٹھ جانے پر ان کا امکان بہت ہی کم باقی رہتا ہے۔ اور اگر وہ لیٹ جائے تو اس حالت میں تو وہ فطری طور پر لغو حرکتوں سے بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔ قوی امید ہے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی بتائی ہوئی اس تدبیر کو اختیار کر کے آدمی اپنے غصہ پر بہ آسانی قابو پالے گا۔

﴿۶﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَلِّمُوْا وَ یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْکُتْ وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْکُتْ وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْکُتْ۔ (احمد، الطبرانی فی الکبیر)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو۔ اور جب تم میں سے کسی کو غصّہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کر لے اور جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کر لے اور جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کر لے۔''

تشریح: یعنی لوگوں کو دین کی تعلیم دو اور انھیں دین کے تقاضوں سے باخبر کرو لیکن یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہے کہ دینِ حق کا اصل مقصود لوگوں کو مشکلات اور دشواریوں میں مبتلا کرنا ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ تو انھیں دشواریوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے آیا ہے (الاعراف: ۱۵۷) اس لیے حکمتِ تعلیم و دعوت یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے دین کی تعلیمات اس طرح پیش کی جائیں کہ وہ ان کو باعثِ زحمت و مصیبت نہیں بلکہ وہ ان کو اپنے لیے باعث رحمت تصوّر کریں۔ دین انھیں ایک ناخوش گوار بوجھ اور ایک دشوار گزار گھاٹی محسوس نہ ہو جسے عبور کرنا انھیں مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آئے۔

غصّہ آنے پر خاموشی اختیار کرنا غصہ پر قابو پانے کی یہ ایک بہترین عملی تدبیر ہے۔ اسی لیے آپؐ نے تین دفعہ یہ بات فرمائی کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کر لے۔ غصّہ کی حالت میں آدمی زبان کھولے گا تو اس کا پورا امکان ہے کہ وہ اپنے غصّہ پر قابو نہ پا سکے۔ کیوں کہ جب وہ ردِعمل میں کچھ کہے گا تو دوسرا فریق بھی چپ نہیں رہ سکتا، وہ بھی کچھ نہ کچھ کہے گا۔ اس سے غصّہ مزید بھڑکے گا اور بات کشت وخوں ریزی تک پہنچ سکتی ہے۔ اور پھر آپس کے تعلقات کی درستی کے امکانات بہت ہی کم باقی رہ سکیں گے۔

صبر

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ اِلْخُدْرِیِّ ؓ اَنَّ نَاسًا مِّنَ الْاَنْصَارِ سَأَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوْهُ فَأَعْطَاهُمْ، ثُمَّ سَأَلُوْهُ فَأَعْطَاهُمْ حَتّٰى نَفِدَ مَا عِنْدَهٗ فَقَالَ: مَا يَكُوْنُ عِنْدِىْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ اَدَّخِرَهٗ عَنْكُمْ، وَ مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ، وَ مَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ، وَ مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ، وَمَا اُعْطِىَ اَحَدٌ عَطَآءً خَيْرًا وَّ اَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ طلب کیا تو آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، انھوں نے پھر طلب کیا تو آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، انھوں نے پھر طلب کیا تو آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، یہاں تک کہ جو کچھ آپؐ کے پاس تھا ختم ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''میرے پاس جو مال بھی ہوگا میں تم سے بچا کر اسے نہیں رکھوں گا اور جو کوئی سوال سے بچنا چاہتا ہے خدا اسے مانگنے (کی ذلت) سے بچا دیتا ہے اور جو کوئی استغناء چاہتا ہے خدا اسے مستغنی کر دیتا ہے اور جو شخص صبر اختیار کرنا چاہتا ہے خدا اسے صبر دے دیتا ہے۔ اور کسی کو کوئی عطا صبر سے بہتر اور زیادہ وسیع نہیں بخشی گئی۔''

تشریح: نبی (ﷺ) نہایت فیاض تھے۔ اسی لیے فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے کچھ بھی اٹھا کر نہیں رکھ سکتا۔ مانگو گے تو تمھیں محروم نہیں لوٹاؤں گا۔ لیکن اسی کے ساتھ آپؐ کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ آپؐ کے رفقاء اخلاقی محاسن کے پیکر ہوں۔ ان کے اندر اخلاق و کردار کے لحاظ سے کوئی نقص باقی نہ رہے۔ ان کی تربیت کے پیشِ نظر یہاں جو تعلیم آپؐ نے انھیں دی وہ اس وقت جب کہ آپؐ کا ہاتھ خالی تھا۔ انھیں دینے کو آپؐ کے پاس کچھ نہ تھا، تا کہ کسی کے دل میں شیطان یہ وسوسہ نہ ڈال سکے کہ یہ صبر و استغناء کی تعلیم نہ دینے کا ایک بہانہ ہے۔

عفت، استغناء اور صبر بہترین اخلاقی اوصاف ہیں لیکن یہ اوصاف آدمی میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ اس کو ان کی قدر و قیمت کا صحیح احساس ہو اور وہ ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہو اور اسے خدا پر کامل بھروسہ ہو کہ وہ بندے کا اصل کفیل ہے اور اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ کسی کو دوسروں سے بے نیاز اور ان اعلیٰ اوصاف سے آراستہ کر دے۔

یہ فقرہ کہ صبر سے بہتر اور وسیع تر شے کسی کو عطا نہیں ہوئی، نہایت جامع فقرہ ہے۔ جس کسی کو صبر کی دولت ملی تو سمجھ لو کہ وہ سب سے بہتر شے کا مالک ہوگیا جو تمام بھلائیوں اور محاسن و محامد کو اپنے میں سمیٹ لینے والی ہے۔ اگر کسی کو صبر کی طاقت حاصل ہوگئی تو پھر دوسرے محاسن کا حصول اس کے لیے دشوار نہیں رہا۔ وہ زندگی کے اصل مزاج سے آشنا ہوگیا۔ صبر کے بغیر زندگی کی اعلیٰ قدریں کبھی ہاتھ نہیں آتیں۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ (حٰمٓ السجدہ: ۳۵) ''اور یہ چیز صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں اور یہ صرف اسے حاصل ہوتی ہے جو بڑا نصیبے والا ہوتا ہے۔'' صبر کے بغیر کسی اعلیٰ تہذیب کا تصوّر نہیں

کیا جا سکتا۔ اعلیٰ زندگی میں صبر دیگر خوبیوں کے ساتھ ایک جمالیاتی احساس بن کر ابھرتا ہے جس پر کسی دوسری چیز کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ صبر سے ہر طرح کی تنگی رفع ہو جاتی ہے۔ اس سے ذہن و فکر اور سعی و عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ صبر اپنا مددگار خود ہوتا ہے۔ مادّی ضروریات کو ہرگز اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ اخلاقی اقدار کا احساس ہی باقی نہ رہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مَالِکِ نِ الْاَشْعَرِیِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَاٰنِ اَوْ تَمْلَأُ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوۃُ نُوْرٌ وَّالصَّدَقَۃُ بُرْھَانٌ وَّالصَّبْرُ ضِیَآءٌ وَّالْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْا فَبَایِعٌ نَّفْسَہٗ فَمُعْتِقُھَا اَوْ مُوْبِقُھَا۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’طہارت آدھا ایمان ہے۔ اور الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے، سبحان اللہ والحمد للہ جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان ہے اس کو بھر دیتے ہیں۔ نماز نور ہے صدقہ دلیل و برہان ہے، صبر روشنی ہے اور قرآن تیرے حق میں یا تیرے خلاف حجت ہے ہر شخص صبح اٹھتا ہے پھر اپنے نفس کا سودا کرتا ہے، پھر یا تو اسے آزاد کرتا ہے یا اسے تباہ و ہلاک کرتا ہے۔‘‘

تشریح: ایمان اس کا متقاضی ہے کہ ہمارا ظاہر اور ہمارا باطن دونوں پاک ہوں۔ جس کسی نے اپنے جسم و لباس اور اپنے مکان وغیرہ کو صاف ستھرا رکھا اس نے ایمان کے نصف تقاضے پورے کر لیے۔ اسی لیے فرمایا کہ طہارت آدھا ایمان ہے۔ اب صرف یہ باقی رہتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر کی طرح اپنے باطن یعنی اپنے افکار و جذبات اور اپنے اخلاق و کردار کے اندر بھی پاکیزگی لائے تاکہ ایمان کے جملہ تقاضے پورے ہو سکیں۔

انسان کا اصل سرمایۂ تسکین و حیات عرفان حق ہے جس کا اظہار سبحان اللہ والحمد للہ جیسے کلماتِ مقدسہ کے ذریعہ سے کیا گیا ہے۔ یہ کلمات جن حقیقتوں کے ترجمان ہیں ان ہی حقیقتوں کے اثبات و اعتراف سے کائنات میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ ان ہی کی وجہ سے کائنات کی تمام چیزیں آیاتِ الٰہی قرار پاتی ہیں۔

نماز نور ہے۔ جس کی زندگی میں نماز نہ ہو اس کی زندگی بے نور ہوگی۔ اس کی زندگی میں

تاریکی ہی تاریکی ہوگی خواہ اسے اس کی خبر نہ ہو۔ نماز ہی سے آدمی کی اصل حیثیت کا اظہار ہوتا ہے اور اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی حیثیت اور مقام کو پہچان لیا ہے۔ یہ مقام اتنا بلند و برتر ہے کہ اس سے محروم ہونا کسی کو بھی گوارا نہیں ہوسکتا۔ برا ہو جہل و بے حسی کا جو لوگوں کو محروم ہی نہیں رکھتی بلکہ ان سے زیاں کا احساس بھی چھین لیتی ہے۔ تاریکی درحقیقت محرومی اور موت کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس روشنی کام یابی اور زندگی کا مظہر ہے۔ ہماری نماز اگر صحیح معنی میں نماز ہوتو ہماری زندگی کی راہ کبھی تاریک نہیں ہوسکتی۔ اور نہ ہم کبھی اپنی منزل سے ناآشنا ہوسکتے ہیں۔ نماز کے بغیر ہمارا سفر بے منزل اور ہماری راہ تاریک سے تاریک تر ہوکر رہ جاتی ہے۔

زندگی ہمیشہ فیاضی کی متقاضی ہوتی ہے کیوں کہ خدا کی فیاضی نے اسے وجود بخشا ہے۔ بخل موت ہے، کسی چیز کی توقع اور امید زندہ شخص سے کی جاسکتی ہے مردہ سے نہیں۔ صدقہ سے جہاں کسی کی زندگی کا پتہ چلتا ہے وہیں صدقہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ بندہ اپنے خدا کا مقرب اور اس کی مغفرت اور نجات کا مستحق ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ساری سرفرازیاں اور کام یابیاں ان ہی لوگوں کے لیے ہیں جو انفاق اور صدقہ کے ذریعہ سے اپنے صادق اور سچے ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔

صدقہ کا تعلق محض مال سے نہیں ہے۔ صدقہ حقیقت کے اعتبار سے ایک کردار ہے۔ مومن بھلائی کے جو کام بھی کرتا ہے وہ سب صدقہ کے زمرہ میں داخل ہیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ وہ شخص تاریکی اور اندھیرے ہی میں بھٹک رہا ہے جس کی زندگی صبر کی صفت سے ناآشنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حیات باکردار کا نمایاں وصف صبر ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

آدمی اگر قرآن کے حقوق کو پہچانتا اور ان کو ادا کرتا ہے تو قرآن اس کی کام یابی اور فلاح کا ضامن اور اس کی نجات کی دلیل ہے۔ لیکن کوئی شخص اگر قرآن کے حقوق کا پاس ولحاظ نہیں رکھتا بلکہ ان حقوق کو بے دردی سے پامال کرتا ہے۔ وہ نہ خود قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے اور نہ دوسروں کو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے تو یہی قرآن اس کے مجرم ہونے کی سب سے بڑی شہادت قرار پاتا ہے۔

حدیث کے آخری حصے میں اس صورتِ حال کی بہترین عکاسی کی گئی ہے جس صورتِ حال سے دنیا میں ہم دوچار ہیں۔ ہمارا ہر روز ہمارے لیے یوم العمل اور یوم الجزاء دونوں بن کر آتا ہے۔ ہر روز ہم خدا کی سب سے بڑی عطا یعنی زندگی کے ساتھ لازماً دو میں سے کوئی ایک طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ایک طرزِ عمل تو وہ ہے جسے اختیار کر کے ہم خود کو تباہی سے بچا لیتے ہیں اور دوسرا طرزِ عمل وہ ہے جو حقیقت میں زندگی کے ساتھ ایک طرح کی بدسلوکی ہے۔ اسے اختیار کرنے کے بعد زندگی اعلیٰ مفہوم سے عاری ہو جاتی ہے اور ہم اس کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جائیں۔ گو بہ ظاہر ہم اس کے بعد بھی جی رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ہم ہلاک ہو چکے ہوتے ہیں۔ دنیا میں جب تک ہم ہوتے ہیں تلافیِ مافات کی گنجائش باقی رہتی ہے لیکن عمر تمام ہونے کے ساتھ تلافی کی مہلت بھی تمام ہو جاتی ہے۔

یہ حدیث متنبہ کرتی ہے کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا مطلب محض زندگی بسر کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک طرح سے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا ہوتا ہے... اس میں کام یابی یا ناکامی کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ہم زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔ ہماری زندگی خدا کی اطاعت و بندگی میں گزرتی ہے یا اس کی نافرمانی اور مخالفت میں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا ہر دن خدا کی رضا طلبی میں بسر ہوتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ہر روز درحقیقت اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کی تنگی و سختی اور گرفت سے آزادی حاصل کر لی اور وہ ہر قسم کی ہلاکتوں سے نجات پا گئے۔

صبر مصائب میں

〈۱〉 عَنْ صُهَيْبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَّ لَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا تو ہر معاملہ اس کے حق میں سراپا خیر ہوتا ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو شکر ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہوتا ہے

اور اگر اسے کوئی تکلیف و مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے سرتا سر خیر ہوتا ہے۔"

تشریح: آدمی کی زندگی دو حال سے خالی نہیں ہوتی۔ یا تو اسے آرام اور عیش حاصل ہوگا یا اسے کسی تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ ان میں سے جو حالت بھی پیش آئے مومن اس سے خیر ہی سمیٹتا ہے۔ اور یہ خصوصیت صرف مومن ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ غیر مومن شخص نہ خوشیوں اور آرام و راحت سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ رنج و مصیبت سے۔ اسے اگر آرام و راحت کی زندگی میسر ہوتی ہے تو وہ متکبر بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں سرکشی اور ناسپاسی کے سوا آپ کچھ نہیں دیکھیں گے۔ اور اگر کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ بے قرار ہوکر جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ پھر ایک بندۂ شاکی کے سوا آپ اسے کچھ نہیں پائیں گے۔

لیکن مومن کا طرزِ عمل اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ خوشی اور راحت میں وہ اپنے خدا کا شکر گزار ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کا دامن تھام لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی بھلائی ہوگی۔ وہ اپنے رب کے فیصلے پر راضی ہوتا ہے۔ یہ شکر و صبر درحقیقت زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں ہیں جن کے بغیر ہم کسی اعلیٰ کردار کا تصور نہیں کر سکتے۔

(۲) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَا یَزَالُ الْمُؤْمِنُ یُصَابُ فِیْ وَلَدِهٖ وَ حَامَّتِهٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰهَ وَ لَیْسَتْ لَهٗ خَطِیْئَةٌ۔ (مؤطا امام مالک)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مومن کو اپنی اولاد اور اپنے اعزّہ کے سلسلے میں رنج و مصیبت پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے اس حالت میں ملتا ہے کہ اس کا کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔"

تشریح: اولاد ہو یا اعزّہ و اقرباء، ان کے جدا ہونے کا غم فطری ہے۔ دنیا میں رنج و غم کا یہ سلسلہ زندگی کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔ دنیا میں اس غم سے مفر نہیں۔ مومن بھی اس رنج و غم سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس پر خدا کی خاطر صبر سے کام لیتے ہیں۔ یہ رنج و مصیبت جس پر اہل ایمان صبر کرتے ہیں خدا اسے ان کے عام گناہوں اور کوتاہیوں کا کفارہ بنا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندۂ مومن جب دنیا سے جاتا ہے تو وہ گناہوں کی آلائشوں سے بالکل پاک و صاف ہوتا ہے۔ مصائب پر صبر اختیار کرنے کا اجر و ثواب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے۔

ترمذی میں یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے: مَا یَزَالُ الْبَلَآءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَةِ

فِیْ نَفْسِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَ مَالِهٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰهَ تَعَالٰی وَمَا عَلَیْهِ خَطِیْئَةٌ۔'' مومن مردوں اور مومن عورتوں پر آزمائشیں آتی رہتی ہیں۔ کبھی خود اس پر کوئی مصیبت آتی ہے، کبھی اس کی اولاد پر اور کبھی اس کے مال پر (اور وہ صبر اختیار کرتا ہے جس سے اس کا قلب صاف ہوتا رہتا ہے اور برائیاں اس سے دور ہوتی رہتی ہیں) یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔''

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَهٗ فَاِنْ کَانَ لَا بُدَّ فَاعِلاً فَلْیَقُلِ اللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیٰوةُ خَیْرًا لِّیْ وَ تَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاةُ خَیْرًا لِّیْ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس تکلیف وضرر کی وجہ سے جو اسے پہنچی ہو موت کی تمنا نہ کرے۔ اور اگر یہ تمنا کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو تو اسے یہ کہنا چاہیے: اے اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو اور مجھے موت دے اس وقت جب کہ مرنا میرے لیے بہتر ہو۔''

تشریح: ضرر مالی بھی ہوسکتا ہے اور جسمانی بھی۔ موت کی تمنا کرنا کسی حال میں صحیح نہیں ہے۔ کسی کو اگر کوئی ضرر پہنچا ہے تو اس کا اجر وثواب بھی غیر معمولی ہے۔ پھر بھی اگر ناگزیر ہو تو دعا کا وہ انداز اختیار کرنا چاہیے جس کی تعلیم اس حدیث میں دی گئی ہے۔ خدا سے موت طلب کرنا تو درست نہیں ہے لیکن خدا کے راستے میں شہید ہونے کی آرزو مستحب ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: یَقُوْلُ اللّٰهُ مَا لِعَبْدِی الْمُؤْمِنِ عِنْدِیْ جَزَآءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِیَّهٗ مِنْ اَهْلِ الدُّنْیَا ثُمَّ احْتَسَبَهٗ اِلَّا الْجَنَّةَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ فرماتا ہے: ''میرے اس مومن بندے کی میرے پاس جنت ہی جزا ہے جس کے کسی عزیز ترین فرد کو اہلِ دنیا میں سے میں اٹھالوں اور وہ اس پر میری خاطر صبر کرے۔''

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: یَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی لَمْ اَرْضَ لَکَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے آدم کے بیٹے! اگر تو نے صدمہ کے شروع میں صبر کیا اور میری رضا اور اجر وثواب کو پیشِ نظر رکھا تو میں تیرے لیے جنت سے کم اور اس کے سوا کسی اجر وثواب پر راضی نہ ہوں گا۔''

تشریح: کسی صدمہ کا اثر درحقیقت ابتدا ہی میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ دن گزر جانے پر تو طبعی طور سے غم اور صدمہ کا اثر خود بہ خود زائل ہوجاتا ہے۔ اسی لیے صدمہ کے شروع میں صبر کرنے کے اجر وثواب کا ذکر فرمایا گیا۔

صبر کی وجہ سے بندہ کا اپنے خدا سے کچھ ایسا تعلق ہوجاتا ہے کہ خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے اس بندہ کو جس نے اس کی خاطر صبر کیا اپنی سب سے بڑی نعمت جنت نہ دے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِنِسْوَةٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ لَا یَمُوْتُ لِاِحْدٰکُنَّ ثَلٰثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَحْتَسِبُهٗ اِلَّا دَخَلَتِ الْجَنَّةَ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِّنْهُنَّ اَوِ اثْنَانِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ اَوِ اثْنَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے انصار کی کچھ عورتوں سے فرمایا: ''تم میں سے جس کسی کے تین بچے مرجائیں اور وہ ثواب کو پیشِ نظر رکھے (صبر کرے) تو وہ لازماً جنت میں داخل ہوگی۔'' ان عورتوں میں سے ایک نے عرض کیا: یا دو۲ بچے مریں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: ''یا دو مریں (جب بھی یہی بشارت ہے)۔''

تشریح: بخاری ومسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: لَهُمَا ثَلٰثَةٌ لَمْ یَبْلُغُوا الْحِنْثَ، ''تین بچے جو حدِ بلوغ کو نہ پہنچے ہوں۔'' چھوٹے بچوں سے ماں کی محبت بڑوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے مرنے کا صدمہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے ماں کے بالکل تابع ہوتے ہیں۔ ان کا سارا انحصار ماں ہی پر ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ ان سے ماں کو انتہائی تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ مُعَاذٍؓ اَنَّهٗ مَاتَ لَهٗ اِبْنٌ فَکَتَبَ اِلَیْهِ النَّبِیُّ ﷺ التَّعْزِیَةَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰی مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ سَلَامٌ عَلَیْکَ فَاِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَیْکَ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعْظَمَ اللّٰهُ لَکَ الْاَجْرَ

وَاَلْهَمَکَ الصَّبْرَ وَ رَزَقْنَا وَ اِیَّاکَ الشُّکْرَ فَاِنَّ اَنْفُسَنَا وَ اَمْوَالَنَا وَ اَهْلَنَا مِنْ مَّوَاهِبِ اللّٰهِ الْهَنِیْئَةِ وَ عَوَارِیْهِ الْمُسْتَوْدَعَةِ مَتَّعَکَ اللّٰهُ بِهٖ فِیْ غِبْطَةٍ وَّ سُرُوْرٍ وَ قَبَضَهٗ مِنْکَ بِاَجْرٍ کَبِیْرٍ، اَلصَّلٰوةُ وَالرَّحْمَةُ وَالْهُدٰی اِنِ احْتَسَبْتَهٗ فَاصْبِرْ وَلَا یُحْبِطُ جَزَعُکَ اَجْرَکَ فَتَنْدَمَ وَاعْلَمْ اَنَّ الْجَزَعَ لَا یَرُدُّ مَیْتًا وَّلَا یَدْفَعُ حَزَنًا وَّمَا هُوَ نَازِلٌ فَکَانَ قَدْ. وَالسَّلَامُ. (الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ان کے ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ تعزیت نامہ لکھوایا: اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی جانب سے معاذ بن جبل کے نام۔ سلامٌ علیک! میں اس خدا کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بعد ازاں، خدا تمھیں اجرِ عظیم دے اور تمھارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہمیں اور تمھیں (اپنی نعمتوں پر) شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے اموال اور ہمارے اہل وعیال سب خدا کی مبارک و مرغوب عطیات ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں۔ خدا نے اس سے عیش و سرور کے ساتھ نفع اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کا موقع عنایت فرمایا اور اسی نے اسے تم سے بڑے اجر کے صلہ میں واپس لے لیا۔ خاص نوازش، رحمت اور ہدایت (کی بشارت) ہے اگر تم نے اجر و ثواب کے پیشِ نظر صبر کیا۔ پس صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ تمھاری بے تابی و بے صبری تمھارے اجر و ثواب کو غارت کردے۔ پھر تمھیں ندامت ہو۔ جان رکھو کہ کوئی مرجانے والا بے صبری و بے تابی سے لوٹنے کا نہیں اور نہ اس سے رنج وغم کبھی دور ہوتا ہے۔ اور جو کچھ واقع ہونے کو ہوتا ہے حقیقت میں وہ واقع ہو چکا ہوتا ہے۔''

تشریح: فرمایا گیا کہ بچے کے انتقال پر جو گہرا صدمہ تمھیں پہنچا ہے اس پر خدا تمھیں اجرِ عظیم سے نوازے اور تمھارے دل کو صبر و سکون عطا کرے۔

ہمارے پاس جو چیزیں بھی ہیں ہم ان کے مالک نہیں ہیں۔ ان کا اصل مالک تو خدا ہی ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے ہمیں اس کا موقع عطا فرماتا ہے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان سے دل بہلائیں۔ اور جب اس کی مشیت ہوتی ہے وہ اپنی چیز واپس لے لیتا ہے لیکن واپس لینے

کے صلہ میں اس کے یہاں ہمارے لیے اجر کبیر (بڑا اجر) ہے۔ یہ اس کا انتہا درجہ کا کرم اور نوازش ہے کہ "لیتا ہے اپنی چیز، پھر بھی مفت نہیں لیتا۔

قرآن میں ہے: اَلَّذِیۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ؕ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ۝ (البقرہ ۱۵۶:۱۵۷) "جو اس وقت جب کہ ان پر کوئی مصیبت آتی ہے کہتے ہیں 'بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی خاص نوازشیں ہیں اور رحمت بھی اور یہی ہیں جو ہدایت یاب ہیں۔" حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کی دی ہوئی اسی بشارت کی روشنی میں اپنے تعزیت نامہ میں یہ الفاظ لکھوائے ہیں: اَلصَّلٰوۃُ وَالرَّحۡمَۃُ وَالۡھُدیٰ اِنِ احۡتَسَبۡتَہٗ۔ "خاص نوازش اور رحمت اور ہدایت کی بشارت ہے اگر تم نے اجر و ثواب کے پیش نظر صبر کیا۔"

صبر انتقامی جذبات میں

(۱) عَنۡ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ثَلٰثٌ مِّنۡ اَخۡلَاقِ الۡاِیۡمَانِ مَنۡ اِذَا غَضِبَ لَمۡ یُدۡخِلۡہُ غَضَبُہٗ فِیۡ بَاطِلٍ، وَ مَنۡ اِذَا رَضِیَ لَمۡ یُخۡرِجۡہُ رِضَاہُ مِنۡ حَقٍّ وَ مَنۡ اِذَا قَدَرَ لَمۡ یَتَعَاطَ مَا لَیۡسَ لَہٗ۔ (المعجم الصغیر للطبرانی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تین باتوں کا تعلق ایمانی اخلاق سے ہے۔ جب کوئی شخص غصہ میں ہو تو اپنے غصہ کے زیر اثر باطل میں نہ جا پڑے اور جب خوش ہو تو اس کی خوشی اسے حق سے بے گانہ و برگشتہ نہ کر دے اور جب اسے قدرت و اقتدار حاصل ہو تو وہ چیز نہ لے جس پر اس کا کوئی حق نہ پہنچتا ہو۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایمان ایک خاص طرح کے اخلاق و کردار کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ تینوں امور جن کا اس حدیث میں ذکر ہے درحقیقت ایمان کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہیں۔ ان کے بغیر ایمان اپنے اصل جوہر سے خالی ہی رہتا ہے۔

غصہ آنے پر بالعموم لوگ فوراً انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سلسلے ان کو جائز و ناجائز کا کچھ بھی خیال نہیں رہتا۔ ایمانی اخلاق یہ ہے کہ انتہائی غصہ و غضب کی حالت میں بھی آدمی کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو حق و انصاف کے خلاف ہو۔

خوشی اور فرحت کی حالت میں بھی عام طور پر آدمی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اس لیے خوشی ہو یا غم اس کے لیے کوئی ایسا انداز اختیار کرنا ہرگز زیبا نہیں ہے جو عدل اور حق کے منافی ہو۔

دنیا میں قدرت اور اقتدار پا کر بھی آدمی عام طور پر بھٹک جاتا ہے۔ اقتدار کا نشہ بہ آسانی اسے سرکش بنا دیتا ہے۔ جس چیز پر چاہتا ہے اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔ قدرت اور اقتدار کسی کو اس لیے نہیں بخشا جاتا کہ وہ غاصب بن کر رہے۔ آدمی ہر حالت میں عدل وانصاف پر قائم رہے، ایمان حقیقت میں اسی چیز کا نام ہے۔ اس کے بغیر ہمارا ایمان بے روح اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

صبر دشمن کے مقابلہ میں

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰیؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِیْ بَعْضِ اَیَّامِهِ الَّتِیْ لَقِیَ فِیْهَا الْعَدُوَّ، یَنْتَظِرُ حَتّٰی اِذَا مَالَتِ الشَّمْسُ قَامَ فِیْهِمْ فَقَالَ: یٰاَیُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ الْعَافِیَةَ فَاِذَا لَقِیْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ ثُمَّ قَامَ النَّبِیُّ ﷺ وَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ وَ مُجْرِیَ السَّحَابِ وَ هَازِمَ الْاَحْزَابِ اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْهِمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ان ایام میں جن میں دشمن سے آپؐ کا سامنا پیش آیا تھا۔ آپؐ نے انتظار فرمایا یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا تو آپؐ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور خطاب فرمایا: ”اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی تمنا نہ کرو اور خدا سے عافیت کے طالب ہو۔ پھر جب ان سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایے تلے ہے۔“ پھر نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا: ”اے اللہ! کتاب نازل فرمانے والے، بادل کو چلانے والے اور جتھوں کو بھگانے والے، انھیں بھگا دے اور ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔“

تشریح: اسلام میں جنگ بہ ذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے کہ آدمی دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کی تمنائیں کرے۔ امن وعافیت بڑی نعمت ہے۔ اسے نعمت ہی تصوّر کرے اور خدا سے امن وعافیت کا طالب ہو۔ لیکن مومن اگر دشمنِ حق کو مٹانے اور اہلِ باطل کو زک دینے کے لیے مقابلے میں آجاتا

ہے تو پھر میدانِ جنگ سے فرار اختیار کرنا ایمان کے منافی ہے۔ایسی صورت میں دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔دشمن کے مقابلے میں صبر وثبات سے کام لینا مومن کا شیوہ ہوتا ہے۔

صبر اطاعت میں

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَ حُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دوزخ کی آگ نفسانی مرغوبات سے ڈھانکی گئی ہے اور جنت ان چیزوں سے ڈھانکی گئی ہے جو نفس کو ناگوار ہوتی ہیں۔''

تشریح: یعنی شہوات ونفسانی خواہشات کی پیروی ہی انسان کو دوزخ میں لے جاتی ہے۔ خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ کر انسان حق وباطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔پھر اسے حلال وحرام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔اس کا یہ طرزِ عمل اسے نارِ جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے۔

جنت خواہشاتِ نفس اور عیش وآرام کی قربانی مانگتی ہے۔اس قربانی کے بغیر انسان کے اندر اعلیٰ کردار نشو ونما ہی نہیں پاسکتا۔زندگی میں کتنے ہی ایسے مواقع آتے ہیں کہ خواہشات ہمیں ایسی چیزوں کی دعوت دیتی ہیں جو اخلاق وکردار کے لیے ہلاکت کی موجب ہوتی ہیں۔ اپنے اعلیٰ اخلاق وکردار ہی کی وجہ سے آدمی جنت کا حق دار ہوتا ہے۔

مسلم کی روایت میں حُجِبَتْ کے بہ جائے لفظ حُفَّتْ آیا ہے یعنی جنت کو ان چیزوں نے گھیر رکھا ہے جو نفس کو ناگوار ہوتی ہیں اور دوزخ کو ایسی چیزوں نے گھیر رکھا ہے جو نفس کو مرغوب وپسند ہوتی ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ اللّٰهِ (علم خدا اور بندے کے درمیان حجاب ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ علم ہی ہم کو خدا تک پہنچاتا ہے۔جس طرح آدمی اور اس کی جنت کے درمیان مکارہ (مشقتوں اور تکلیفوں) کا حجاب ہے۔جو مکارہ کو گوارا کرتا ہے یعنی خواہشاتِ نفس کی پرواہ کیے بغیر دُشواریوں اور مشقتوں کو انگیز کرتا ہے وہ جنت کو پالیتا ہے۔ٹھیک اسی طرح جو شخص علم میں در آتا ہے اسے خدا کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے۔خدا کی معرفت کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔

عدل وانصاف

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ الْمُقْسِطِیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ عَنْ یَّمِیْنِ الرَّحْمٰنِ عَزَّوَجَلَّ وَ کِلْتَا یَدَیْہِ یَمِیْنٌ اَلَّذِیْنَ یَعْدِلُوْنَ فِیْ حُکْمِھِمْ وَ اَھْلِیْھِمْ وَمَا وَلُوْا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”عادل ومنصف خدا کے یہاں نور کے منبروں پر خدائے رحمٰن عزوجل کے دائیں جانب ہوں گے اوراس کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہاتھ ہیں۔ وہ عادل ومنصف جواپنے احکام، اپنے اہل اوراپنی ولایت وحکومت میں عدل کرتے ہیں۔“

تشریح: خدائے رحمٰن عزوجل کی دائیں جانب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہایت بلند اور عزت کے مرتبے پر فائز ہوں گے۔ ان کی حالت لوگوں کے لیے قابلِ رشک ہوگی۔ دنیا میں وہ ظلمت کے بہ جائے روشنی میں تھے۔ نورِ ہدایت سے بے بہرہ ہوکر انھوں نے زندگی نہیں گزاری تھی۔ آخرت میں بھی ان کو ان کے مناسبِ حال جزا ملے گی کہ وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور انھیں خدا کا انتہائی قرب نصیب ہوگا۔ دنیا میں نور ہدایت کی کیفیت قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنَاہُ وَ جَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَاط (الانعام:۱۲۲) ”کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندگی دی اوراس کے لیے روشنی کردی جس کو لیے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو، اوران سے ہرگز نکلنے والا نہ ہو۔“

دفعِ توہم کے لیے فرمایا گیا کہ خدا کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ جس طرح ہمارا بایاں ہاتھ داہنے کے مقابلے میں کم زور ہوتا ہے وہی کیفیت خدا کے ہاتھ کی بھی ہوگی۔ خدا ہر قسم کے ضعف اور نقص سے پاک ہے۔ خدا کے ہاتھوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم خدا ہی کو ہے۔ ہمیں اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں پر ہرگز قیاس نہ کرنا چاہیے۔ قرآن میں ہے: لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (الشوریٰ:۱۱) ”اس کے مانند کوئی شے نہیں۔“

عادل و منصف کے احکام مبنی بر عدل ہوتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا حکم صادر نہیں کرتے جو عدل و انصاف سے ہٹ کر ہو۔ معاملہ اہل و عیال اور اپنے عزیزوں کا ہو یا کسی اور کا، عدل کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ وہ ہر کسی کے معاملہ میں عدل و انصاف کی روش پر قائم رہتے ہیں۔ حقوق کے ادا کرنے میں بھی وہ ہمیشہ شریعت کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ جو ذمہ داری بھی ان کو سونپی گئی ہو ممکن نہیں کہ وہ اس کے سلسلہ میں غیر ذمہ دارانہ اور غیر عادلانہ رویہ اختیار کریں۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: کَانَ اَهْلُ الْکِتَابِ یَقْرَءُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِیَّةِ وَ یُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِیَّةِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْکِتٰبِ وَلَا تُکَذِّبُوْا هُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ۔ الاٰیة۔
(بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے اس کا ترجمہ وتفسیر عربی میں کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ (کو معلوم ہوا تو) آپؐ نے فرمایا: ’’تم اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو۔ کہو: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ۔ (ہم اللہ پر اور اس پر ایمان لائے جو کچھ ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا)۔‘‘

تشریح: تورات مستند شکل میں موجود نہ تھی پھر اہلِ کتاب کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ تورات کا ترجمہ یا تفسیر کرنے میں پوری دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے اس سلسلہ میں حق و انصاف کا جو تقاضا تھا حضور (ﷺ) نے اسی کے پیشِ نظر مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ تم نہ اہلِ کتاب کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔ تم ان کی پیش کی ہوئی کسی بات کی تصدیق یا تکذیب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم تصدیق کرو، ممکن ہے وہ غلط ہو۔ یا تکذیب کرو، ممکن ہے وہ صحیح ہو۔ اس لیے حق و انصاف کی بات یہی ہوگی کہ تم کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر کہ جو کچھ ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ تمھاری طرف نازل ہوا۔ یعنی خدا کی طرف سے جو کچھ ہوگا خواہ تمھارے یہاں تورات کے احکام کی صورت میں نازل ہوا ہو یا ہمارے یہاں قرآن میں نازل فرمایا گیا ہو، ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہمارا ایمان تو خدا کی نازل کردہ تعلیمات پر

ہے۔اس میں اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تعلیمات کب اور کہاں نازل ہوئی ہیں لیکن اگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہیں تو ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا کہنے کا حکم در حقیقت سورۃ البقرہ کی اس آیت کی روشنی میں دیا: قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ ج لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ صلے وَ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَo (البقرہ:۱۳۶) ''کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتری اور اس پر کہ جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل ہوئی اور موسیٰ وعیسیٰ کو ملی۔اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا ہوئی۔ہم ان میں سے کسی کو اس تعلق سے جو ان میں باہم پایا جاتا ہے الگ نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرماں بردار ہیں۔''

ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَسْئَلُوْھُمْ عَنْ شَیْءٍ فَیُخْبِرُوْکُمْ بِحَقٍّ فَتُکَذِّبُوْا بِہٖ اَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوْا بِہٖ (احمد، ابن ماجہ، الطبرانی، البیہقی فی شعب الایمان) ''اہلِ کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھو، کہیں وہ تمھیں کوئی سچی بات بتائیں اور تم اس کی تکذیب کردو، یا غلط بات بتائیں اور تم اس کی تصدیق کردو۔''

ایک روایت میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ اہلِ کتاب کی جس بات کی تائید قرآن سے ہوتی ہو اس کی تصدیق کرو اور ان کی جو بات قرآن کے خلاف ہو اس کی تردید کرو۔اور جس بات کے سلسلہ میں قرآن خاموش ہو تم بھی اس کے بارے میں توقف اختیار کرو، نہ اس کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی معاملہ میں عدل وانصاف کے تقاضے کو ملحوظ رکھنا اہل ایمان کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

مروّت

(۱) عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا بَلَغَہٗ عَنِ الرَّجُلِ الشَّیْءُ لَمْ یَقُلْ مَا بَالُ فُلَانٍ یَّقُوْلُ وَ لٰکِنْ یَّقُوْلُ: مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَّقُوْلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو جب کسی شخص کی کسی بری بات کی خبر ملتی تو آپؐ یوں نہ فرماتے کہ فلاں شخص کو کیا ہوا کہ وہ ایسا کہتا ہے بلکہ یوں فرماتے کہ لوگوں کا کیا حال ہو گیا ہے کہ وہ ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔"

تشریح: یعنی آپؐ اس شخص کا نام لے کر تنبیہ نہیں فرماتے تھے بلکہ عام انداز میں نصیحت فرماتے تا کہ اس شخص کی رسوائی بھی نہ ہو اور وہ اپنی اصلاح کر لے اور دوسرے لوگ بھی متنبہ ہو جائیں کہ اس برائی سے انھیں دور رہنا چاہیے۔ اس سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ کس قدر بامروّت تھے۔ نصح و ہدایت میں وہ طریقہ اختیار فرماتے جو انتہائی شریفانہ اور باوقار ہوتا۔ عامیانہ اور سطحی انداز آپؐ کا نہیں ہوتا تھا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَدِمَ الطُّفَیْلُؓ وَ اَصْحَابُهٗ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ دَوْسًا قَدْ كَفَرَتْ وَاَبَتْ فَادْعُ اللّٰهَ عَلَیْهَا فَقِیْلَ هَلَكَتْ دَوْسٌ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَائْتِ بِهِمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ طفیلؓ اور ان کے ساتھی آئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! دوس نے کفر اور انکار کی روش اختیار کی۔ لہٰذا آپؐ ان کے لیے بددعا کریں اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ ہلاک ہوئے دوس کے لوگ۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اے اللہ! دوس کو ہدایت سے نواز اور ان کو میرے پاس لا۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ لوگوں کے لیے آپؐ کس درجہ دردمند تھے۔ آپؐ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ آپؐ قبیلۂ دوس کے لیے بددعا کریں۔ بددعا کے بہ جائے آپؐ نے قبیلۂ دوس کے لوگوں کے حق میں دعا فرمائی کہ خدایا انھیں ہدایت سے بہرہ مند فرما اور انھیں اس بات کی توفیق دے کہ وہ اپنے رسول کی طرف رجوع ہوں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ صَلَّیْنَا الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ قُلْنَا لَوْ جَلَسْنَا حَتّٰی نُصَلِّیَ مَعَهُ الْعِشَآءَ قَالَ فَجَلَسْنَا فَخَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ: مَازِلْتُمْ هٰهُنَا قُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّیْنَا مَعَكَ الْمَغْرِبَ ثُمَّ قُلْنَا نَجْلِسُ حَتّٰی نُصَلِّیَ مَعَكَ الْعِشَآءَ۔ قَالَ: اَحْسَنْتُمْ اَوْ اَصَبْتُمْ۔ قَالَ: فَرَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَی السَّمَآءِ وَ كَانَ كَثِیْرًا

مِمَّا یَرْفَعُ رَأْسَهُ اِلَی السَّمَآءِ فَقَالَ: اَلنُّجُوْمُ اَمَنَةٌ لِّلسَّمَآءِ فَاِذَا ذَهَبَتِ النُّجُوْمُ اَتَی السَّمَآءَ مَا تُوْعَدُ وَ اَنَا اَمَنَةٌ لِّاَصْحَابِیْ فَاِذَا ذَهَبْتُ اَتٰی اَصْحَابِیْ مَا یُوْعَدُوْنَ وَ اَصْحَابِیْ اَمَنَةٌ لِّاُمَّتِیْ فَاِذَا ذَهَبَ اَصْحَابِیْ اَتٰی اُمَّتِیْ مَا یُوْعَدُوْنَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک بار رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر ہم نے کہا کہ اگر ہم بیٹھے رہیں یہاں تک کہ عشاء کی نماز آپؐ کے ساتھ ادا کریں تو بہتر ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بیٹھے رہے۔ آپؐ باہر ہمارے پاس تشریف لے آئے اور فرمایا: ”تم یہاں بیٹھے رہے؟“ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے آپؐ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، پھر ہم نے کہا کہ ہم بیٹھے رہیں یہاں تک کہ عشاء کی نماز بھی آپؐ کے ساتھ ادا کریں تو بہتر ہوگا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”تم نے اچھا کیا اور ٹھیک کیا۔“ پھر آپؐ نے آسمان کی طرف اپنا سر اٹھایا ـــــ اور آپؐ اکثر آسمان کی طرف سر اٹھاتے ـــــ پھر فرمایا: ”تارے آسمان کا بچاؤ اور حفاظت ہیں۔ تارے جب مٹ جائیں گے تو جس چیز کا وعدہ ہے وہ آسمان پر واقع ہوجائے گا۔ اور میں اپنے اصحاب کے لیے بچاؤ اور پناہ ہوں۔ جب میں رخصت ہوجاؤں گا تو میرے اصحاب پر بھی وہ وقت آجائے گا جس کا وعدہ ہے۔ اور میرے اصحاب میری امت کے لیے بچاؤ اور حفاظت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب میرے اصحاب دنیا سے رخصت ہوجائیں گے تو میری امت پر وہ وقت آجائے گا جس کا وعدہ ہے۔“

تشریح: آسمان پر واقع ہوگا یعنی آسمان چاک ہوجائے گا۔ نظامِ عالم درہم برہم ہوکر رہ جائے گا اور قیامت واقع ہوجائے گی۔

فرمایا گیا میری موجودگی صحابہ کے لیے حصارِ محافظت کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری موجودگی میں کوئی فتنہ سر اٹھا نہیں سکتا اور نہ خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن میرے بعد یہ حالت باقی نہ رہے گی۔ میرے صحابہ کو میرے بعد فتنہ وفساد سے سابقہ پیش آئے گا۔

صحابہؓ کے بعد اس کا امکان ہے کہ بدعتوں کا ظہور ہو۔ دین کے نام سے بہت سی ایسی باتیں اختیار کی جانے لگیں جن کا دین سے کوئی تعلق ورشتہ نہ ہو۔ اندازِ فکر میں تبدیلی آئے اور دین کا صحیح تصوّر نگاہوں سے اوجھل ہوجائے اور اسلام خود اپنوں کے درمیان اجنبی ہوکر رہ جائے۔ آپس میں شدید قسم کے اختلافات پیدا ہوں اور امت افتراق وانتشار کا شکار ہو۔ جاہلی افکار و

نظریات فضا پر چھا جائیں۔ مخالف قومیں غلبہ حاصل کرلیں اور اہلِ ایمان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی موجودگی اور نبیؐ کے بعد صحابہؓ کا وجود گویا ایک ایسے قلعہ کے مانند ہے جو ہر اعتبار سے محافظت کا ذریعہ ثابت ہوسکے۔ ہم دیکھتے بھی ہیں کہ نبی (ﷺ) اپنی قوم کے لیے ایک بڑی طاقت تھے۔ آپؐ کی رہ نمائی اور قیادت کی وجہ سے صحابہؓ ہر قسم کے فتنوں اور خرابیوں سے محفوظ رہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کی وفات کے بعد صحابہؓ عضو معطّل بن کر نہیں رہے۔ انھوں نے امت کی رہ نمائی کی۔ ان کی کوششوں اور قربانیوں سے دین مستند اور اپنی کامل شکل میں امت تک منتقل ہوا۔ ان کی زندگیاں امت کے لیے چراغِ ہدایت ثابت ہوئیں۔ صحابہ کا وجود دنیا میں کوئی بے جان وجود نہ تھا۔ نبی (ﷺ) نے ان کے اندر وہ قوت اور اسپرٹ بھر دی تھی کہ جس کو زمانہ ختم کرنے پر قادر نہ ہوسکا۔ لیکن صحابہؓ کے بعد خلفشار بڑھتا گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ مسلمانوں کی اپنی توانائیوں کا بہترین مصرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ان کو باہم ایک دوسرے سے لڑنے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے میں صرف کررہے ہیں۔ اب وہ نظر بصیرت دکھائی دیتی ہے اور نہ وہ مروّت و شرافت اور احساسِ ذمّہ داری کہ جس سے کبھی تاریخ سازی کا کام لیا جاسکتا تھا۔

(۴) وَ عَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍوؓ اَنَّ اَبَا سُفْيَانَ اَتٰى عَلٰى سَلْمَانَؓ وَ صُهَيْبٍؓ وَّ بِلَالٍؓ فِيْ نَفَرٍ فَقَالُوْا مَا اَخَذَتْ سُيُوْفُ اللّٰهِ مِنْ عُنُقِ عَدُوِّ اللّٰهِ مَاْخَذَهَا قَالَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍؓ اَتَقُوْلُوْنَ هٰذَا لِشَيْخِ قُرَيْشٍ وَّ سَيِّدِهِمْ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ يَآ اَبَا بَكْرٍ لَعَلَّكَ اَغْضَبْتَهُمْ لَئِنْ كُنْتَ اَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْ اَغْضَبْتَ رَبَّكَ فَاَتَاهُمْ اَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ يَا اِخْوَتَاهُ اَغْضَبْتُكُمْ قَالُوْا لَا، يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ يَآ اَخِيْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائذ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ابوسفیان، سلمانؓ، صہیبؓ اور بلالؓ کے پاس آیا اور بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی تلواریں دشمنِ خدا کی گردن پر اپنے موقع پر نہیں پہنچیں۔ اس پر ابوبکرؓ نے کہا کہ کیا ایسا تم قریش کے بڑے بوڑھے اور ان کے سردار کے حق میں کہتے ہو۔ پھر وہ نبی ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ”اے

ابوبکر! تم نے شاید ان لوگوں کو ناراض کیا۔ اگر تم نے انھیں ناراض کیا ہے تو درحقیقت تم نے اپنے رب کو ناراض کیا ہے۔'' یہ سن کر ابوبکرؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے بھائیو! میں نے تمھیں ناراض کر دیا۔'' وہ بولے: ''نہیں، خدا تمھیں بخشے اے ہمارے بھائی!''

تشریح: ''کیا ایسا تم قریش کے بڑے بوڑھے اور ان کے سردار کے حق میں کہتے ہو'' حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات اس لیے کہی کہ ابوسفیان مشتعل ہو کر بہ جائے اسلام لانے کے کہیں ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم نہ رہ جائے۔ واضح رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ابوسفیان ایمان نہیں لائے تھے۔ صلح کر کے مسلمانوں کے پاس آئے تھے۔

''اے ابوبکر تم نے شاید لوگوں کو ناراض کیا'' حضور ﷺ کی اس بات سے جہاں حضرت سلمان، حضرت صہیب اور حضرت بلال رضی اللہ عنہم کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضعفاء اور اہلِ ایمان کی خاطر داری اور ان کا دل رکھنے کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی یہ اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بات سے تمھیں ناراض کر دیا حالانکہ مجھے ایسا نہیں چاہیے تھا۔ میری بات سے تمھیں تکلیف پہنچی ہوگی۔ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

تواضع وانکسار

(۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَۃٌ مِّنْ مَّالٍ وَّمَا زَادَ اللّٰہُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَّمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰہِ اِلَّا رَفَعَہُ اللّٰہُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صدقہ سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اور خدا کسی بندے کے عفو اختیار کرنے کی وجہ سے اس کی عزت و وقار ہی میں اضافہ فرماتا ہے۔ اور کوئی شخص خدا کی خاطر تواضع اختیار کرتا ہے تو خدا لازماً اسے بلند کر دیتا ہے۔''

تشریح: عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقہ کرنے سے ان کے مال میں کمی آ جائے گی۔ اسی طرح سے لوگ بالعموم یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم عفو و درگزر سے کام لیں گے اور لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں گے تو وہ اس کو ہماری کم زوری اور مجبوری پر محمول کریں گے۔ تواضع اور

فروتنی کے بارے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ عزت اور وقار کے منافی ہے۔ اس حدیث میں لوگوں کی غلط فہمیوں اور ان کے اندیشہ ہائے باطل کو دور کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں واقع ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ صدقہ دے کر بندہ خدا کے شکر گزار بندوں میں شامل ہوتا ہے۔ خدا اپنے شکر گزار بندوں کو مزید اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ جیسا کہ اس کا وعدہ ہے: لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ۔ (ابراہیم: ۷) ''اگر تم شکر گزار ہوئے، تو میں تمھیں مزید عطا کروں گا۔''

اسی طرح عفو و درگزر سے کام لینے کے لیے ظرف درکار ہے۔ یہ کسی چھوٹے آدمی کے بس کی بات نہیں ہوسکتی۔ اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عفو و درگزر اور نرمی سے کام لیں گے تو اس سے اپنا وقار مجروح ہوگا۔ عفو سے عزت میں کمی نہیں اضافہ ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح کوئی شخص تواضع اختیار کرتا ہے تو خدا اس کا درجہ بلند فرماتا ہے۔ تواضع وانکسار کو انسان کے اخلاقی وجود کے لیے حسن کا درجہ حاصل ہے۔ حسن جہاں کہیں پایا جائے گا وہ خود لوگوں سے اپنی اہمیت کا اعتراف کرالے گا۔

﴿۲﴾ وَ عَنۡ عِیَاضِ بۡنِ حِمَارٍ الۡمُجَاشِعِیِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اَوۡحٰی اِلَیَّ اَنۡ تَوَاضَعُوۡا حَتّٰی لَا یَفۡخَرَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ وَّلَا یَبۡغِیَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت عیاض بن حمار مجاشعیؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی کہ تواضع اختیار کرو یہاں تک کہ نہ کوئی شخص کسی کے مقابل فخر کرے اور نہ کوئی کسی شخص پر ظلم وزیادتی کرے۔''

تشریح: فخر و تکبر بالعموم ظلم و تعدی اور ستم کا سبب بنتا ہے، اسی لیے دونوں کا ذکر ایک ساتھ فرمایا گیا کہ نہ تو کوئی کسی شخص کے مقابل فخر کرے اور نہ کوئی کسی کے مقابلے میں ظلم وزیادتی کی روش اختیار کرے۔

﴿۳﴾ وَ عَنۡ عُمَرَؓ قَالَ هُوَ عَلَی الۡمِنۡبَرِ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوۡا فَاِنِّیۡ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوۡلُ: مَنۡ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیۡ نَفۡسِهٖ صَغِیۡرٌ وَّ فِیۡ اَعۡیُنِ النَّاسِ عَظِیۡمٌ وَّ مَنۡ تَکَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیۡ اَعۡیُنِ النَّاسِ صَغِیۡرٌ وَّ فِیۡ نَفۡسِهٖ کَبِیۡرٌ حَتّٰی لَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ کَلۡبٍ اَوۡ خِنۡزِیۡرٍ۔ (بیہقی)

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے برسرِ منبر فرمایا کہ لوگو! تواضع اختیار کرو، کیوں کہ میں نے رسولِ خدا علیہ وسلم صلی اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''جو شخص خدا کے لیے تواضع اور فروتنی اختیار کرے خدا اسے بلند کر دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے لیکن لوگوں کی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص تکبر و غرور کرتا ہے خدا اسے پست کر دیتا ہے۔ پھر وہ لوگوں کی نگاہوں میں چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے اگرچہ وہ خود کو بڑا تصوّر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں میں کتے اور سور سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔''

تشریح: متواضع شخص کسی کبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ تواضع وانکسار اس کی خو ہوتی ہے۔ خدا کو یہ چیز پسند ہوتی ہے اور وہ اسے بلندی عطا کر دیتا ہے۔ اس کا ایک اثر دنیا میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں اسے عظمت حاصل ہوجاتی ہے اور لوگ اس کی تعظیم وتوقیر کرنے لگتے ہیں۔

متکبر شخص بزعمِ خویش خود کو سب سے اونچا تصوّر کرتا ہے لیکن خدا اسے پست اور ذلیل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ دنیا میں بھی ظاہر ہوکر رہتا ہے۔ وہ لوگوں کی نگاہ میں ذلیل وحقیر ہوتا ہے۔ یہ ذلّت اس حد تک بڑھ سکتی ہے کہ لوگ اسے کتے اور سور سے بدتر تصوّر کرنے لگیں۔ کتے اور سور تو خلقی طور پر پست ہوتے ہیں اور وہ خُلقی طور پر ذلیل ہوتا ہے۔ یہ پستی اور ذلت کی انتہا ہے۔

سادگی

(۱) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ بْنِ ثَعْلَبَۃَ الْاَنْصَارِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ ذَکَرَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَوْمًا عِنْدَہُ الدُّنْیَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلاَ تَسْمَعُوْنَ اَلاَ تَسْمَعُوْنَ اَنَّ الْبَذَاذَۃَ مِنَ الْاِیْمَانِ اَنَّ الْبَذَاذَۃَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ بن ثعلبہ الانصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے آپؐ کے سامنے دنیا کا ذکر کیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم سنتے نہیں! کیا تم سنتے نہیں کہ سادہ وضع میں رہنا خلقِ ایمان میں سے ہے، سادہ وضع میں رہنا خلقِ ایمان میں سے ہے۔''

تشریح: ''کیا تم سنتے نہیں، کیا تم سنتے نہیں'' ایسا آپؐ نے اس لیے فرمایا تاکہ لوگ پوری طرح متوجہ ہوکر بات کو سنیں اور یہ سمجھ کر سنیں کہ جو بات کہی جارہی ہے وہ نہایت اہم اور توجّہ دینے کی ہے۔

اس حدیث میں جس لفظ کا ترجمہ ''سادہ وضع میں رہنا'' کیا گیا ہے وہ 'البَذَاذَة' ہے جو کہنگی و بوسیدگی اور شکستہ حالی وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ زندگی ہے جو تکلف و تصنّع سے یکسر پاک ہو۔ فخر و نمائش اور عیش پسندی و تنعم کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ خوش ذوقی کو اسلام ممنوع قرار نہیں دیتا، البتہ یہ ذوق اگر دیوانگی کی حد کو... پہنچ جائے تو یہ چیز ایمان کے منافی ہوگی۔ اس لیے کہ تنعم و عیش پرستی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی ساری توجّہ و دلچسپی دنیا کی ظاہری خوش نمائیوں اور عشرتوں سے وابستہ ہوکر رہ گئی ہے۔ نہ اسے آنے والے سخت دن کی فکر ہے اور نہ ہی آخرت میں حاصل ہونے والی پُر مسرت زندگی کے انتظار کی اس کے اندر سکت پائی جاتی ہے۔ نگاہ اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے وہ سطحیت کا دِل دادہ ہوکر رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ چیز ہرگز اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہوتی۔

اسلام میں جس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی ابھی زیرِ تکمیل ہے۔ اس کی تکمیل سے پیش تر کسی شخص کا اس طرح سے زندگی گزارنے کی کوشش کرنا گویا یہ دنیوی عیش و راحت ہی سب کچھ ہے، جو اس سے چوک گیا وہ سخت گھاٹے میں رہے گا، یہ فکر و نظر واضح طور پر اسلام سے متصادم ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: مَنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ وَ هُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ قَالَ بِشْرٌ اَحْسِبُهٗ قَالَ تَوَاضُعًا كَسَاهُ اللّٰهُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ۔ (ابوداؤد) ''جس کسی نے عمدہ و نفیس کپڑا پہننا ترک کر دیا حالانکہ اسے اس کی مقدرت حاصل تھی کہ وہ نفیس لباس زیب تن کر سکے، راوی بشر کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اس نے ایسا تواضع کے جذبہ سے کیا تو اللہ اسے (آخرت میں) عزت کا جوڑا پہنائے گا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو جذبۂ تواضع و انکسار کی حفاظت کرنی چاہیے اور اسے اپنے اندر نشو و نما دینے کی اس کو فکر ہونی چاہیے۔ ہمارے ظاہری عادات و اطوار سے ایک طرف ہمارے باطن کی عکاّسی ہوتی ہے، دوسری طرف ہمارا باطن ہمارے ظاہر کا اثر قبول کرتا ہے۔ اس لیے لباس کے مسئلہ میں ہی نہیں بلکہ ہمیں ہر معاملہ میں اس طرزِ عمل کو ترجیح دینا چاہیے جس سے مومنانہ احساسات و جذبات مجروح نہ ہوں۔

شگفتگی و خوش مزاجی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَیْئًا وَّ لَوْ اَنْ تَلْقٰی اَخَاکَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، خواہ وہ تمھارا اپنے بھائی سے شگفتہ روئی کے ساتھ ملنا ہی کیوں نہ ہو۔''

تشریح: یعنی کوئی بھی نیکی بہ ظاہر وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو حقیر اور بے وقعت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے بھائی سے ملاقات کرنے کو بھی معمولی نہ سمجھنا چاہیے۔ نیکی اگر نیکی ہے تو وہ قابلِ قدر ہے۔ اس کی تحقیر صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق اس ذوق وفکر سے ہوتا ہے جو زندگی کی نہایت قیمتی متاع ہے۔ مومن کے چھوٹے سے چھوٹے اعمال سے بھی اس کے ایمان اور اس تعلق کا اظہار ہوتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان پایا جاتا ہے۔ چھوٹا عمل بھی اگر اس کا رشتہ زندگی کی بنیادی قدروں اور حقائق سے ہے تو وہ چھوٹا عمل ہرگز نہیں ہے۔ اس کے برعکس بڑے سے بڑا عمل کا بھی خدا کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں ہوسکتا اگر اس کے پیچھے صحیح فکر اور رضائے الٰہی کی طلب کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالُوْا، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّکَ تُدَاعِبُنَا. قَالَ: اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہم سے خوش طبعی فرماتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں صرف حق بات کہتا ہوں۔''

تشریح: یعنی میں خوش طبعی کے طور پر بھی جو بات کہتا ہوں وہ خلافِ حقیقت ہرگز نہیں ہوتی۔ نبی کریم ﷺ خشک مزاج نہ تھے، آپؐ خوش طبع تھے۔ آپؐ لطیف مزاح فرماتے۔ مقصد موانست اور مخاطب کی ضیافتِ طبع ہوتی تھی۔

مزاح اسی حد تک جائز ہے کہ اس سے کسی کو اذیّت اور تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے علاوہ کسی کے لیے مزاح کو اپنا ایسا معمول بنانا درست نہیں کہ اس کی کثرت سے آدمی کا اپنا وقار مجروح ہو یا خدا کی یاد اور فکرِ آخرت کی طرف سے اس کے غافل ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوجائے۔

〈۳〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لِامْرَاَةٍ عَجُوْزٍ: اِنَّهٗ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ۔ فَقَالَتْ وَمَا لَهُنَّ؟ وَكَانَتْ تَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ فَقَالَ لَهَا: اَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْاٰنَ؟ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ (شرح السنہ، رزین)

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا: ''بوڑھی عورت جنت میں نہ داخل ہوگی۔'' اس نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ ایسی عورتیں جنت میں نہ جاسکیں گی؟ وہ عورت قرآن پڑھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا: اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ (الواقعہ) یقیناً ان (جنتی) عورتوں کو ایک خاص اٹھان پر اٹھایا اور ہم نے انھیں کنواریاں بنایا۔''

تشریح: ''بوڑھی عورت جنت میں داخل نہ ہوگی۔'' یہ بات آپؐ نے مزاح کے طور پر فرمائی۔ اس کو سن کر بوڑھی خاتون گھبرا جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آخر بوڑھی عورتوں کا کیا قصور ہے کہ وہ دوسری مومنات کے ساتھ ـــــ جنت میں داخل نہ ہوسکیں گی۔ آپؐ ان کی حیرانی و پریشانی اور ان کے غم کو جلد ہی دور فرما دیتے ہیں کہ میں نے جو بات کہی ہے وہ تو قرآن کے بیان کے مطابق کہی ہے۔ کیا قرآن میں یہ آیتیں نہیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا عورتوں کو بڑھاپے کی حالت میں نہیں بلکہ وہ ان کو باکرہ اور دوشیزہ کی صورت میں جنت میں داخل فرمائے گا۔ کوئی عورت جنت میں بوڑھی نہ ہوگی۔ وہاں جو عورتیں بھی ہوں گی وہ نوخیز اور حسین و دلربا ہوں گی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ عُرُبًا اَتْرَابًا ۙ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ؏ (الواقعہ: ۳۵-۳۸) ''یقیناً ہم نے ان عورتوں کو ایک خاص اٹھان پر اٹھایا، اور ہم نے ان کو دوشیزہ بنایا، عشق و محبت والی دلربا، عمر میں ملتی جلتی، خوش نصیب لوگوں کے لیے۔''

فیاضی

〈۱〉 عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔ قَالَ: اَللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِیْ اٰدَمَ وَ اَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِیْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَهٗ، يَاْتِیْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمِيْرًا وَّحْدَهٗ اَوْ قَالَ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (بیہقی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ فیاضی کرنے والوں میں کون سب سے بڑھ کر فیاض ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول بہ خوبی جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''فیاضی کرنے والوں میں اللہ سب سے بڑھ کر فیاض ہے، پھر بنی آدم میں سب سے زیادہ فیاض میں ہوں۔ اور میرے بعد لوگوں میں وہ شخص سب سے زیادہ فیاض ہے جس نے علم حاصل کیا اور پھر اس کی اشاعت کی۔ وہ قیامت کے روز ایک امیر کی حیثیت سے آئے گا۔'' یا فرمایا کہ ''وہ اس حال میں حاضر ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک امت کی حیثیت رکھتا ہوگا۔''

تشریح: اس حدیث سے صرف یہی نہیں کہ سخاوت اور فیاضی کی فضیلت معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی دولت کیا ہے؟ دنیا میں سب سے بیش بہا شے علم ہے۔ یہاں علم سے مراد دین کا علم ہے۔ قرآن میں مختلف مقامات پر اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ نبیوں کو علم و حکمت عطا ہوئی تھی۔ نبوّت کو بھی کتنے ہی مقام پر علم اور حکم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ علم ہی کی بنا پر انسان کو عام حیوانات کے مقابلہ میں شرف اور بزرگی حاصل ہے۔

علم کا حقیقی حصول وہی ہے جس کے بعد آدمی کی عملی زندگی میں اس کا اظہار ہو سکے۔ علم و حکمت ایک نور اور روشنی ہے۔ روشنی جہاں کہیں پہنچتی ہے اسے روشن کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب آدمی کو صحیح طور پر علم حاصل ہوتا ہے تو اس سے صرف یہی نہیں کہ اس کے ذہن کے گوشے منور ہو جاتے ہیں بلکہ اس کی زندگی سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھوکا بھی ہو اور اسے پاک و طیب غذا میسر آئے اور وہ صرف اس کا ذکر کر کے رہ جائے اور اسے تناول نہ کرے۔ لیکن کتنے ہی لوگ ایسے ملیں گے جو بہ ظاہر صاحبِ علم ہیں لیکن ان کی زندگیوں سے ان کے علم کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حق کو جاننا چاہیے اس طرح انھوں نے حق کو جانا نہیں۔ جاننا یہ ہے کہ آدمی کا علم اس کے لیے قوتِ محرکہ بن جائے اور اسے عمل پر ابھار سکے۔ اس طرح کا علم آدمی کے لیے خارجی معلومات کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ وہ تو دل کی نازک سے نازک حسیات کو چھیڑتا ہے اور آدمی بہترین جذبات و کیفیات کا حامل بن جاتا ہے۔ وہ اسے ایک پاکیزہ دنیا سے صرف باخبر ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں اسے داخل کر دیتا ہے۔ جس سے ہجرت اس کے لیے ناممکن ہو جاتی ہے۔ اسے ذہن و قلب کی وہ پاکیزہ فضا میسر آتی ہے جہاں

کوئی خلفشار و تضاد نہیں پایا جاتا۔ جہاں کسی قسم کی تنگی نہیں ہوتی۔ انسان خود کو خدا سے بہ راہِ راست فیض یاب ہوتے محسوس کرنے لگتا ہے۔

خدا کی ہستی عظیم و بابرکت ہے۔ کون سی نعمت ہے جو اس نے انسانوں کو عطا نہیں کی۔ خود ہمارا اپنا وجود اس کی فیاضی کا زندہ ثبوت ہے۔ پھر اس نے ہمارے لیے زندگی کے سارے اسباب فراہم کیے۔ قرآن میں ہے: هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ:۲۹) ''وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا فرمادیا جو زمین میں ہے۔'' اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (لقمان:۲۰) ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور اس نے تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔''

خدا کے بعد بندگانِ خدا میں سب سے بڑھ کر فیاض خدا کا رسول ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ رسول صرف ہمیں خدا کی معرفت ہی نہیں بخشتا بلکہ اس خوئے دل نوازی سے جو اللہ کو پسند ہے وہ خود سب سے بڑھ کر متصف ہوتا ہے۔ خدا کو جو شخص جتنا زیادہ پہچانتا ہوگا فطری طور پر وہ اتنا ہی زیادہ فیاض ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ خدا کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ حضور اکرم (ﷺ) نے خود فرمایا ہے: اِنَّ اَتْقَاكُمْ وَ اَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ اَنَا۔ (بخاری) ''تم سب سے زیادہ ڈر رکھنے والا اور تم سب سے بڑھ کر خدا کو جاننے والا میں ہوں۔''

نبی کے بعد سب سے بڑھ کر فیاض وہ شخص قرار پاتا ہے جو حصولِ علم کے بعد خاموش نہیں رہتا بلکہ اپنے علم سے لوگوں کو فیض یاب کرنے کی کوشش میں لگ جاتا اور علم کو عام کرتا ہے۔ اس کی فیاضی کا مقابلہ کوئی بھی سخاوت نہیں کرسکتی۔ اس لیے کہ علم سے بڑھ کر دنیا میں دوسری کوئی دولت نہیں پائی جاتی۔ وہ علم کی اشاعت کرتا اور بندگانِ خدا کو راہِ ہدایت کی طرف بلاتا ہے۔ ان کی فلاح و کامیابی کا سامان کرتا ہے۔ ایسا شخص فیاض ہی نہیں ایک قائد اور رہ نما بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن وہ امیر اور قائد کی شان کے ساتھ خدا کی جناب میں حاضر ہوگا۔ اس کی حیثیت فردِ محض کی نہ ہوگی، بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک امت کی حیثیت رکھتا ہوگا۔

کیوں کہ دنیا میں اسے صرف اپنی ہی فکر دامن گیر نہ تھی بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے فکر مند و مضطرب رہا اور اس سے ایک بڑی جمعیت نے فائدہ اٹھایا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَ اِذَا اشْتَرٰی وَ اِذَا اقْتَضٰی۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو فیاض ہے، جب وہ بیچے، جب خریدے اور جب وہ اپنے حق کا مطالبہ اور تقاضا کرے۔''

تشریح: یعنی اس کی فیاضی کا اظہار مختلف مواقع اور مختلف معاملات میں ہوتا ہے۔ وہ اپنا ہی نہیں، اپنے گاہک کا بھی خیر خواہ ہوتا ہے۔ تول کر دیتا ہے تو تولتے وقت ترازو کا پلڑا جھکا رکھتا ہے۔ وہ کم نہیں تولتا۔ اگر کسی سے کچھ خریدتا ہے تو اس کی کوشش یہ ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ جائز و ناجائز طریقہ سے زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرلے۔ اسی طرح جب وہ کسی سے اپنے حق کا تقاضا کرتا ہے تو نرمی سے کام لیتا اور زیادہ سے زیادہ مہلت دیتا ہے، بلکہ اگر ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اپنا حق معاف بھی کرسکتا ہے۔ اس کا یہ رویہ اس کے قلب کی فراخی اور اس کی فیاضی کی واضح دلیل ہے۔ ایسا شخص خدا کے غضب کا نہیں اس کی رحمت کا مستحق ہوتا ہے۔ خدا لازماً اس پر رحم فرمائے گا۔ اگر ہم رسول اللہ (ﷺ) کی دعا کا مصداق بننا چاہتے ہیں (اور کون مسلمان حضور اکرم (ﷺ) کی دعا لینا نہ چاہے گا) تو ہمیں چاہیے کہ ہم ہر طرح کے بخل اور تنگ دلی سے بچیں اور فیاضی کو اپنا وتیرہ بنائیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ مَالِکِ بْنِ نَضْلَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْاَيْدِیْ ثَلٰثَةٌ فَيَدُ اللّٰهِ الْعُلْيَا وَ يَدُ الْمُعْطِی الَّتِیْ تَلِيْهَا وَ يَدُ السَّآئِلِ السُّفْلٰی فَاَعْطِ الْفَضْلَ وَلَا تُعْجِزْ عَنْ نَّفْسِکَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت مالک بن نضلہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہاتھ تین قسم کے ہیں۔ ایک ہاتھ تو خدا کا ہے جو بلند ہے، ایک دینے والے کا ہاتھ ہے جو اس کے قریب ہے اور ایک ہاتھ سائل کا ہے جو نیچے ہوتا ہے۔ پس جو ضرورت سے زیادہ ہو دو اور اپنے نفس کے تابع مت ہو۔''

تشریح: اس حدیث میں فیاضی اور سخاوت کی فضیلت بیان کرنے میں وہ انداز اختیار فرمایا گیا ہے جس سے آدمی کے اندر اس کے لیے بے پناہ شوق ابھر سکے۔ سب سے اچھا ہاتھ خدا ہی کا ہوسکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ خدا کا ہاتھ بلند ہے یعنی اس کا ہاتھ دستِ سوال نہیں دستِ عطا ہے۔ اَلْیَدُ الْعُلْیَا اَلْمُنفِقَۃُ۔ (ابوداؤد) ''بلند ہاتھ وہ ہے جو خرچ کرتا ہے ــــ'' خدا کی فیاضی اور داد و دہش بے حد و حساب ہے۔ جو کچھ دیتا ہے، کسی سے لے کر نہیں، اپنے پاس سے دیتا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کو بھی رزق سے محروم نہیں رکھتا۔ بدلہ میں بندوں سے رزق طلب نہیں کرتا۔ (وَ ھُوَ یُطْعِمُ وَلاَ یُطْعَمُ۔ ''وہی تو ہے جو کھلاتا ہے، خود نہیں کھاتا۔'' (الانعام:۱۴) پیٹ ہی نہیں بھرتا غذائے روح و دل کا بھی سامان کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی عطا کو منقطع کرنا نہیں چاہتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شرک و کفر پر جان دے کر خود ہی اپنے کو خدا کی عطا سے محروم کرلے۔

خدا کے بعد بلند ہاتھ اس شخص کا ہے جو انفاق کرتا ہے۔ جس کے دل کو لوگوں کی حاجت روائی سے آرام ملتا ہے۔

اس کے بعد تو بس سائل کا ہاتھ باقی رہتا ہے جو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور ان سے اپنی حاجت روائی کی درخواست کرتا پھرتا ہے۔ یہ ہاتھ بلند نہیں ہوتا، نیچے ہوتا ہے۔ اس لیے اگر اللہ نے کسی کو ضرورت سے زیادہ دیا ہے تو اسے خدا کے راستے میں خرچ کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں اپنے نفس کی پیروی سے گریز کرنا چاہیے۔ نفس تو عام طور پر آدمی کو طمع اور بخل ہی پر ابھارتا ہے۔

خدا سے دوری کوئی مکانی دوری ہرگز نہیں ہے۔ خدا تو زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ اس سے قریب ہونے کے لیے کوئی زمان و مکان کا فاصلہ طے کرنا نہیں ہوتا۔ اخلاقی محاسن ہی ہمیں اس سے قریب کرتے ہیں۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَنْ تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَرَاحَمُوْا قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، کُلُّنَا رَحِیْمٌ۔ قَالَ: لَیْسَ بِرَحْمَۃِ اَحَدِکُمْ صَاحِبَہٗ وَ لٰکِنَّھَا رَحْمَۃُ الْعَامَّۃِ۔ (الطبرانی)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ ایک دوسرے پر رحم نہ کرو۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول!

ہم میں سے ہر ایک رحیم ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے ساتھی پر رحم کرے، بلکہ میری مراد رحمتِ عامہ سے ہے۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ یہ ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی فراخ حوصلہ اور ہر قسم کی تنگ نظری اور بخل سے پاک ہو۔ وہ صرف اپنے ہی لوگوں پر مہربان نہ ہو بلکہ اس کی مہربانیاں سب کے لیے ہوں۔ وہ سارے ہی انسانوں کا ہم درد اور ان کا خیر خواہ بن کر رہے۔ ایک حدیث میں ہے: ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ پس خدا کو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ احسان کرے۔ (بیہقی)

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰهِ، قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ، قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ، بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ۔ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰهِ، بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ، بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ، قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ۔ وَ لَجَاهِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سخی، خدا سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے اور جنت سے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے۔ اس کے برخلاف بخیل شخص خدا سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور جنت سے دور ہے اور دوزخ سے قریب ہے۔ اور بلاشبہ ایک بے علم فیاض شخص خدا کے نزدیک عبادت گزار بخیل سے بڑھ کر محبوب ہوتا ہے۔''

تشریح: یعنی سخی اور فیاض شخص سے خدا بھی خوش ہوتا ہے اور اسے اپنا مقرب بنالیتا ہے۔ اور لوگ بھی ایسے شخص سے محبت کرتے اور اسے اپنا سمجھتے ہیں۔ جس شخص سے خدا اور بندگانِ خدا سبھی خوش ہوں اس کے جنتی ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس بخیل سے نہ خدا راضی ہوتا ہے اور نہ لوگوں کو اس سے تعلق خاطر ہوسکتا ہے۔ اس کا انجام دوزخ کے سوا اور کیا ہوگا۔

حسنِ اخلاق ایک جمالیاتی تجربہ و احساس بن کر انسان کی زندگی میں شامل ہوتا ہے۔ جو شخص اس جمال سے لذت گیر اور اس کی قدر و قیمت سے آشنا نہ ہو اس کا جنت سے کیسے کوئی رشتہ قائم ہوسکتا ہے۔ جنت درحقیقت تمام خوبیوں اور نعمتوں کی ہیئتِ کلی کا نام ہے۔ اس کے برخلاف ہر قسم کی خرابیوں اور خباثتوں کی ہیئتِ کلی کا نام دوزخ ہے۔ برائی اور خباثت اختیار کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اس طرح آدمی اپنے اندر دوزخ سے مستفید ہونے کی خو کو نشو و نما

دیتا ہے۔اب اگر وہ اس سے باز نہیں آتا تو اسے کوئی چیز دوزخ سے بچا نہیں سکتی۔اس کا وجود تو حقیقت کے لحاظ سے خود دوزخ کا ایک حصہ ہوتا ہے وہ دوزخ سے کیوں کر دور رہ سکتا ہے۔

فیاضی اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی حقیقت سے ہم آہنگ ہے۔اگرچہ معروف معنی میں وہ کوئی بڑا عالم اور عابد شخص نہیں ہے۔اس کے برخلاف بخیل شخص کا بخل اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔بخیل اخلاقی وروحانی زندگی سے ناآشنا ہوتا ہے۔اس کی زندگی میں محرک شے بالعموم مادّی منفعت ہی ہوتی ہے۔بہ ظاہر وہ نمازیں پڑھتا اور خدا کے حضور سجدے گزارتا ہے۔ایسی صورت میں اس کا وہ مقام کیسے ہو سکتا ہے جو ایک فیاض شخص کا ہوتا ہے۔

انفاق

﴿۱﴾ عَنْ اَسْمَآءَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَنْفِقِیْ وَلَا تُحْصِیْ فَیُحْصِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ وَلَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ اَرْضِخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ۔ (بخاری،مسلم)

ترجمہ: حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا: ”خرچ کرو، گنو مت ورنہ خدا بھی تمھیں گن کر دے گا۔اور روکو مت ورنہ خدا بھی تم سے روکے گا اور دو جتنا دے سکتی ہو۔“

تشریح: اس حدیث سے انفاق کی فضیلت واہمیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ایک حدیث قدسی میں ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ یُنْفَقْ عَلَیْکَ۔ (بخاری ومسلم) ”اے آدم کے بیٹے خرچ کر، تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔“

انفاق کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس کے وجوہ واسباب پر جب ہم غور کرتے ہیں تو کئی حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔داد و دہش کا تعلق بہ راہِ راست صفتِ خداوندی سے ہے۔اگر ہمارا رب اس صفت سے عاری ہوتا تو دنیا میں یہ جو کچھ آپ کو نظر آتا ہے کچھ بھی نظر نہیں آسکتا تھا۔یہ اس کا فیض ہے جو ہمیں اپنے وجود اور اس وسیع کائنات کی صورت میں دکھائی دے رہا ہے۔

انفاق ایک آفاقی قانون (Universal and Cosmic Law) کی حیثیت رکھتا ہے۔اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس قانون کا نفاذ روک دیا جائے تو یہ دنیائے ہست وبود فنا کے گھاٹ اتر

جائے۔ اس کائنات کی تنظیم ہی کچھ ایسے طور پر ہوئی ہے کہ ایک شے کو دوسری سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سورج اپنی قوت و تمازت کو مسلسل صرف کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس زمین پر زندگی کا امکان پیدا ہو سکا ہے۔ ہماری کتنی ہی ضروریات اس سے وابستہ ہیں کہ سورج اپنے انفاق کے سلسلہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی بند نہ کرے۔ موسموں کی تبدیلی، فصلوں کا پک کر تیار ہونا وغیرہ، کون نہیں جانتا کہ ان سب کا انحصار اسی پر ہے کہ سورج اپنی گرمی اور تمازت سمیٹ کر نہ رکھے، بلکہ دنیا کو اس سے مستفید ہونے کا موقعہ ملتا رہے۔

سمندر اپنا پانی دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتا۔ سمندر کا پانی بخارات اور بادل کی صورت میں منتقل ہوتا ہے جسے ہوائیں اڑا کر لاتی ہیں۔ پھر ان کو مختلف علاقوں میں پہنچا کر زمین کے سیراب ہونے کا سامان کرتی ہیں جس کے نتیجہ میں زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔

کتنے درخت ہیں، ان میں ہمارے لیے میٹھے پھل لگتے ہیں۔ حیوانات کی دنیا کا حال بھی اس سے مختلف نہیں۔ گایوں کے تھنوں میں دودھ اس لیے نہیں جمع ہوتا کہ وہ جمع رہے بلکہ وہ خرچ ہونے ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اس دودھ کو گائے کا بچھڑا بھی پیتا ہے اور وہ ہمارے استعمال میں بھی آتا ہے۔

پھر کائنات میں کتنی ہی غیر مرئی قوتیں ہیں، جو اس طرح محفوظ نہیں رکھی گئی ہیں کہ ان سے ہم فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اگر زمین کی قوتِ کشش زمین کے علاوہ کسی دوسرے کے فائدے کے لیے نہ ہوتی تو اس زمین پر کسی آبادکاری کا سرے سے امکان ہی پیدا نہ ہو سکتا۔ اس طرح جس طرف بھی نگاہ کی جائے یہ ثبوت ملے گا کہ پوری کائنات داد و دہش کے ضابطہ و قانون کے سہارے چل رہی ہے۔ کائنات کا کوئی حصہ دوسرے حصہ سے بے تعلق نہیں ہے۔

انسان کے حق میں خدا کی رحمت و فیاضی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اس نے صرف ظاہری نعمتوں ہی سے ہمیں نہیں نوازا بلکہ باطنی نعمت اور علم و حکمت کی دولت سے بھی سرفراز کیا ہے۔ اور اس کے لیے اس نے وحی و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اس کی بخشش اور عطا کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ اس کی بخشش اور عطا ہی ہے جسے ہم آخرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡھَا ط (ابراہیم: ۳۴) ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا

چاہو تو انھیں پورا شمار نہیں کر سکتے۔'' اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ط (لقمان: ۲۰) ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور اس نے تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دی ہیں؟''

خدا کی انسانوں پر خاص عنایت ہے۔ وہ ان کو کردار کی بلندی اور سیرت و شرافت کی عظمتوں کا حامل دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہماری ظاہری شخصیت بھی بامعنی و پر وقار ہو۔ لیکن کتنی ہی چیزیں ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے ظرف چاہیے۔ خدا کی بے انتہا نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عالی ظرف ہوں۔ ہماری شخصیتیں ایسی ہوں کہ وہ خدا کی خاص بخششوں کی حامل بن سکیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ ظرفی اور بہترین صلاحیت و اہلیت کے حصول کے لیے آدمی کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کا ایک ہی صحیح جواب ہے کہ آدمی دین میں تفقہ اور سمجھ حاصل کرے اور دین کی ہدایات کی پیروی اختیار کرے۔ دین کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کا تزکیہ ہو اور اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہو اور وہ ہر قسم کی پستی اور تنگ دلی اور کوتہ بینی سے پاک ہو۔ قرآن میں ہے: وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o (التغابن: ۱۶) ''جو شخص اپنے نفس کے حرص و بخل سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ کام یاب ہیں۔''

خدا نے جو دین ہمارے لیے اتارا ہے۔ وہ محض کوئی تصوراتی و نظریاتی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔ دین اپنے آخری تجزیہ میں لطافتِ احساس کا نام ہے۔ لیکن جس طرح ہماری روح کے لیے ایک مناسب قالب اور جسم عطا ہوا ہے ٹھیک اسی طرح سے دین کے لیے بھی ظاہری قالب (Forms) فراہم کیے گئے ہیں تاکہ حقیقت مرئی اور نمایاں شکل میں ہر وقت ہمارے سامنے رہے اور یہ جائزہ لینے میں کسی کو کوئی دشواری پیش نہ آئے کہ کس شخص کو فی الواقع دین ملا ہے اور کون اس سے محروم ہے۔

دین کے جس قالب کا ذکر میں نے کیا ہے، وہ وہی ہے جسے ہم نماز اور انفاق وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ نماز اور انفاق دو ایسے نمایاں فارم ہیں جن کے ذریعہ سے دین حق نہ

صرف یہ کہ سب کے لیے قابلِ فہم ہوجاتا ہے بلکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہم دیکھنے لگتے ہیں۔
قرآن میں ہے: وَمَآ اُمِرُوْآ اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینہ:۵) ''اور حکم انھیں بس اس کا دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، نیازمندی کو اس کے لیے خاص کرکے، بالکل یکسو ہوکر، اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور یہی راست رو ملت کا طریق ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ انفاق کا جذبہ آدمی کو عالم گیر اور آفاقی حیثیت سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے رب سے یگانگت کا رشتہ قائم کرلیتا ہے۔ پھر وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ خدا اسے اپنی تمام نعمتوں سے نوازے۔ یہ ممکن نہیں کہ بندہ زندگی کی اس راہ کو اختیار کرے جو اسے بلند سے بلند مقام تک لے جاتی ہے، پھر بھی وہ محروم رہے۔ ایسی صورت میں تو لازماً اسے دونوں جہان کی دولت حاصل ہوگی۔ لیکن یاد رہے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور دولت سیرت وکردار کی بلندی ہی ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی باعظمت شخصیت کا تصوّر نہیں کرسکتے۔

(۲) وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَ تَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا اور بری موت کو دور کرتا ہے۔''

تشریح: مومن فیض وبخشش کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ یہ اس کا بنیادی وصف ہے۔ یہ سرچشمہ کسی حالت میں سوکھتا نہیں۔ انفاق اور صدقہ سے خود انفاق کرنے والے شخص کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سے اس کی روح کا تزکیہ ہوتا ہے اور اس کی شخصیت کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ بری موت سے خدا اس کو محفوظ رکھتا ہے۔ بری موت سے مراد ایسی موت ہے کہ:

۱- آدمی سکون واطمینان کے ساتھ دنیا سے رخصت نہ ہوسکے۔ انتشار ذہنی کے ساتھ اسے دنیا سے جانا پڑے۔

۲- توبہ کی توفیق نہ ہو اور نہ آخری وقت میں کلمۂ توحید زبان سے ادا کرسکے۔ دنیوی حسرتوں اور تمناؤں میں مبتلا حالت میں دنیا سے رخصت ہو۔

۳- باطل کی حمایت میں جان دے۔

۴- موت اس حال میں آئے کہ وہ گناہ کے کاموں میں مشغول ہو۔ دنیا سے خدا کا نافرمان بن کر خدا کے یہاں جائے۔

۵- خودکشی کرلے۔ وغیرہ۔

انسان کی زندگی میں حسنِ خاتمہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ اصل اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ خدا کو راضی کرنے، اس کے غضب کی آگ کو بجھانے کی صحیح تدبیر صدقہ ہے۔ صدقہ کی برکت سے وہ حسن خاتمہ کی دولت سے بھی سرفراز ہوسکتا ہے۔

اصلاً خدا جس چیز سے راضی ہوتا ہے وہ حسنِ کردار ہے۔ اسی چیز کی اس کے یہاں قدر ومنزلت ہے۔ کردار کی تعمیر صبر اور ایثار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ صبر اور ایثار کے بغیر انسان کبھی بھی پستی سے نکل نہیں سکتا۔ صدقہ کردار کی عظمت کا ایک نمایاں نشان ہے۔ صدقہ محض ایک ظاہری عمل نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ ایک قلبی کیفیت کا اظہار ہے جسے ہم نشاطِ قلب یا کشادگیِ دل سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ یہ بڑی قیمتی شے ہے۔ یہی اصل حیات ہے۔ ہمیں یہ حیات عطا کرنے کے لیے اسلام کا داعی اکبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آخر تک کوشاں رہا۔

یہ ایسی پاکیزگی ہے جس کی محافظت خدا خود فرماتا ہے۔ اس پاکیزگی کے حامل شخص کو کبھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ کتنی صحیح بات فرمائی تھی حضرت خدیجہؓ نے، جب انھوں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہلی وحی کے نزول کے موقعہ پر پریشان دیکھا۔ انھوں نے فرمایا: خدا کی قسم، خدا آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ (ناتوانوں کا) کل بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں۔ محتاجوں کے لیے کماتے ہیں۔ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ حق کے لیے مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔

ایک بات یہاں اور سمجھ لینے کی ہے۔ وہ یہ کہ صرف مادی چیزوں کے اندر ہی قوت اور اثر نہیں پایا جاتا (مثلاً چونے کو پانی میں ڈالیں تو وہ ابلنے لگتا ہے، یا پانی کو آگ پر رکھیے تو وہ بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے) بلکہ اعمال نیک اور قلبی کیفیات کے اندر بھی قوت واثر پایا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کسی درخت کے بیج کو مٹی میں ڈال دیں تو وہ اگتا اور پھر ایک تناور درخت کی شکل میں کھڑا ہوتا اور برگ وبار لاتا ہے بلکہ نیکیاں بھی تخم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بھی گم ہوکر فنا نہیں ہوجاتیں بلکہ اس تخم سے بھی درخت اگتے اور برگ وبار لاتے ہیں، جن کے پھلوں اور سایہ سے

آدمی فائدہ اٹھاتا ہے۔ نیکیوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنا اثر دکھا سکیں۔ چنانچہ یہ نیکیاں اپنے اثر سے آدمی کے نفس پر ایسے نقوش ثبت کرتی ہیں اور اس کے اندر ایسی صلاحیت کو جلا بخشتی ہیں کہ وہ ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہر مرحلہ سے گزر سکے۔ اس کے علاوہ خدا اس کے لیے ایسے اسباب بھی فراہم کرتا ہے کہ وہ آخر دم تک صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکے۔ کتنے ہی فرشتے اس کے دل نواز و ہم دم ہوتے ہیں۔ ان کی رفاقت اہلِ ایمان کے لیے باعثِ تقویت ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ فرشتے اہلِ ایمان سے کہتے ہیں: نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ (حٰمٓ السجدہ:۳۱) ”ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔“

ہم جو کچھ صدقہ کرتے ہیں حقیقت میں وہی ہم اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ عام نگاہوں میں تو آدمی نے جو کچھ اپنے کھانے پینے، پہننے وغیرہ میں خرچ کیا وہی اس نے اپنے اوپر خرچ کیا لیکن حقیقت کی نگاہ جانتی ہے کہ آدمی نے جو کارِ خیر میں یا دوسروں پر خرچ کیا حقیقت میں وہی اس نے اپنے اوپر خرچ کیا۔ حدیث میں آتا ہے: اِذَا مَاتَ الْمَیِّتُ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ: مَا قَدَّمَ؟ وَ قَالَ بَنُوْ اٰدَمَ: مَا خَلَّفَ؟ (البیہقی فی شعب الایمان عن ابی ہریرہؓ) ”جب کوئی مرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے آگے کیا بھیجا جب کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا؟“

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلَ عَلٰی بِلَالٍؓ وَّ عِنْدَهٗ صُبْرَۃٌ مِّنْ تَمْرٍ فَقَالَ: مَا هٰذَا یَا بِلَالُ؟ قَالَ شَیْءٌ اِدَّخَرْتُهٗ لِغَدٍ۔ فَقَالَ: اَمَا تَخْشٰی اَنْ تَرٰی لَهٗ غَدًا بُخَارًا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ؛ اَنْفِقْ بِلَالُ، وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بلالؓ کے پاس تشریف لائے۔ اس وقت ان کے پاس کھجور کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ آپؐ نے پوچھا: ”اے بلال! یہ کیا ہے؟“ انھوں نے عرض کیا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو میں نے کل کے لیے جمع کر رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”کیا تم ڈرتے نہیں کہ کل قیامت کے دن اس کے لیے آتشِ جہنم کے بخار سے تمھیں سابقہ پیش آئے؛ بلال! خرچ کرو اور عرش والے کی طرف سے فقر کا خوف نہ کرو۔“

تشریح: اس حدیث میں انفاق پر زور دیا گیا ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ

آدمی کا اصل بھروسہ خدا پر ہونا چاہیے۔ بندے کا اصل کفیل اور اس کے رزق کا ذمہ دار وہی ہے۔ خدا عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ وہ کوئی کم زور خدا نہیں ہے کہ بندے کی کفالت کرنے میں ناکام ثابت ہوگا۔ اگر آدمی کا طرزِ عمل اس سے مختلف ہے اور وہ خدا کے بہ جائے اپنی تدبیر پر بھروسہ کرتا ہے اور وہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم نہیں کرتا کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھتا ہے تو اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ آخرت میں برے نتائج سے دوچار ہو۔ بندے کا بھروسہ اپنے خدا پر ہے۔ زندگی میں اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ صدقہ ہے جو وہ خدا کی راہ میں دیتا ہے۔ صدقہ وانفاق سے گریز کو مومنانہ طرزِ عمل ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

آدمی آئندہ کی ضروریات کے پیشِ نظر کچھ جمع کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) درحقیقت اپنے صحابہؓ کو ایسی تربیت دینا چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں کسی کم زوری کو راہ پانے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

نقطۂ نظر

⟨۱⟩ عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَثَلُ الْقَلْبِ مَثَلُ الرِّیْشَةِ تُقَلِّبُھَا الرِّیَاحُ بِفَلَاةٍ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’دل کی مثال ایک پر کی ہے جو کسی کھلے میدان میں پڑا ہوا ہو۔ ہوائیں اسے الٹ پلٹ رہی ہوں۔‘‘

تشریح: اس حدیث میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انسانی قلب کی ایک عجیب وغریب مثال بیان فرمائی ہے۔ اس سے زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس تمثیل کے کئی اجزا ہیں:

۱- کھلا ہوا میدان جہاں بے روک ٹوک ہواؤں کا گزر ہوتا ہے۔ پھر ایسے میدان میں چھوٹی چیز بھی پڑی ہو تو وہ اپنی طرف ہماری نگاہ کو متوجہ کرلیتی ہے۔

۲- اس کھلے میدان میں ایک پر پڑا ہوا ہے۔ اسے اٹھانے والا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں جو اسے اٹھا کر کسی محفوظ طاق میں رکھ دے یا اپنے استعمال میں لائے۔

۳- اس پر کو چھیڑنے والی اور اس تک پہنچنے والی چیز اگر کوئی ہے تو وہ ہوائیں ہیں۔ کبھی

دھیمی ہوا اس تک آتی ہے تو کبھی تیز ہوا کا اس پر گزر ہوتا ہے۔ کبھی بادِ نسیم آہستہ خرامی کے ساتھ اس کے پاس آتی ہے تو کبھی طوفانی ہوائیں اس تک پہنچتی ہیں۔ الغرض مختلف قسم کی ہواؤں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔

۴- ہوائیں آکر اسے الٹ پلٹ کرتی ہیں۔

اس تمثیل کے ذریعہ سے بے چارگی اور بے بسی کی انتہائی مؤثر تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہوائیں آتی ہیں اور اس کو الٹ پلٹ کرتی ہیں۔ انسان کا دل بھی ایک ایسے ہی پر کے مانند ہے۔ اس دنیا کے میدان میں انسان کا دل ایک گرے ہوئے پر کی طرح ہے جسے چلنے والی ہوائیں متاثر کرتی ہیں۔ اسے ایک حالت میں پڑا رہنے نہیں دیتیں۔ دل کے اس الٹ پھیر کا اظہار انسانی زندگی میں مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ شارحینِ حدیث نے اس تمثیل سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ اس میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں انسان سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ قضا و قدر کے مطابق ہوتا ہے۔ دل تو کسی کھلے میدان میں پڑے ہوئے پر کے مانند ہے، اس سے جو کچھ حس و حرکت ظاہر ہوتی ہے وہ حقیقت میں قضا و قدر کا نفاذ و اظہار محض ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ کُلَّھَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ کَقَلْبٍ وَّاحِدٍ یُصَرِّفُہٗ کَیْفَ یَشَآءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ۔ (مسلم) ”انسانوں کے قلوب خدائے رحمان کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان قلب واحد کی طرح ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے اسے الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اے اللہ، دلوں کے پھیرنے والے، ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی جانب پھیر دے۔“

ان حدیثوں میں انسان کی بے چارگی و بے بسی اور خدا کی جس عظیم قدرت کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہرگز صحیح نہ ہوگا کہ انسان مجبور محض ہے۔ اپنے اعمال و کردار اور خیالات میں اس کا اپنا کوئی دخل نہیں ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں نہ تو مشرکین و نافرمان لوگ قابلِ ملامت قرار پائیں گے اور نہ نیکوکار خدا کے فرماں بردار بندے کسی تعریف و تحسین کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں اور قرآن کی یہ آیتیں بھی بے معنی قرار پائیں گی:

کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ ۝ (المدثر: ۳۸) ”ہر شخص اپنی کمائی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔“

کُلُّ امْرِیءٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ o (الطور:۲۱) ’’ہر شخص اپنی کمائی کے عوض گرد ہوگا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ قضا وقدر سے آدمی کے ارادہ وعمل کی آزادی باطل نہیں ہوجاتی، بلکہ نظریۂ تقدیر سے آدمی کے اختیار وعمل کی آزادی ہی کا اثبات ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ (ﷺ) سے جب دریافت کیا گیا کہ جو جھاڑ پھونک اور دوا علاج ہم کرتے ہیں اور بچاؤ اور حفاظت کی جو تدابیر ہم اختیار کرتے ہیں، کیا یہ چیزیں خدا کی تقدیر کو بدل دیتی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: هِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ۔ ’’یہ چیزیں بھی تقدیر الٰہی ہی میں شامل ہیں۔‘‘ (احمد، ترمذی)

مطلب یہ ہے کہ تقدیر الٰہی سے دوا علاج وغیرہ کی نفی نہیں ہوتی۔ تقدیر الٰہی میں یہ چیزیں بھی شامل وداخل ہیں۔ تقدیر الٰہی میں ان کی رعایت بھی شامل ہے۔

دل کے پر کو خارجی ہوائیں اگر الٹتی پلٹتی ہیں تو ان کا یہ عمل کسی اہم قانون کے تحت ہی ہوتا ہے۔ رحمٰن اگر اپنی انگلیوں سے دلوں کو پھیرتا ہے تو اس کا یہ تصرف یوں ہی اندھا دھند نہیں ہوتا۔ وہ ایسے دلوں کو کفر و نافرمانی کی طرف نہیں پھیرتا جن میں طاعت اور خدا کی رضا جوئی کا جذبہ موجود ہوتا ہے بلکہ ایسے دلوں کو تو وہ اپنی طاعت کی طرف ہی پھیرے گا۔ البتہ جن دلوں میں کفر و نافرمانی کے میلانات پائے جاتے ہیں ان ہی کو وہ کفر و نافرمانی کی طرف پھیرے گا۔ وہ جبراً نہ تو کسی دل کو طاعت اور وفا کی طرف مائل کرتا ہے اور نہ کفر وعصیان کی طرف پھیرتا ہے۔

انسان کا دل ایک نہایت حساس آلہ کے مانند ہے جس کے اندر یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ نازک سے نازک ترشے کو محسوس کرسکے۔ دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں اور جو حادثات رونما ہوتے ہیں ان کا اثر لازماً ہمارے دل پر پڑتا ہے۔ لیکن مختلف دلوں پر ان کے اثرات مختلف انداز میں مرتب ہوتے ہیں۔ ایک واقعہ سے اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اسی واقعہ سے منافقین کے دلوں پر رعب اور خوف طاری ہوجاتا ہے۔ اور ان کا اطمینان و سکون رخصت ہوکر رہ جاتا ہے۔

بہت سے واقعات کی اطلاع ہمیں ریڈیو اور اخبار کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ ہمارے دلوں پر ان کا بھلا برا اثر مرتب ہوتا ہے۔ آج کے ماحول میں حد درجہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ آج کے ماحول میں کتنی ہی فتنہ پرور چیزیں موجود ہیں جن سے سبھی واقف ہیں۔ شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے فلمی نغمے، ٹیلی ویژن کے پردے پر پیش کیے جانے والے حیاسوز

اور فحش قسم کے مناظر، یہ اور اس طرح کی دوسری چیزیں اور گم راہ لیڈروں کی پُر فریب تقاریر اور ان کے بیانات۔ ان سب کی طرف سے احتیاط ضروری ہے کہ کہیں یہ چیزیں ہمارے دلوں کو غلط رخ پر نہ پھیر دیں اور ہمارے دینی مزاج و ذوق کو بگاڑ کر نہ رکھ دیں۔

شیاطین انس کے علاوہ شیاطین جن کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، شیطان دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن خدا کے مخلص بندوں پر اس کا جادو نہیں چل سکتا۔ اور اگر کبھی وہ کسی قدر ان پر اثر انداز ہوتا بھی ہے تو وہ بہت جلد متنبہ ہو جاتے ہیں اور خدا کی طرف رجوع کرتے اور اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا ایمان کم زور ہوتا ہے وہ بہت جلد شیطان کے فریب میں آجاتے ہیں۔

خدا کے فرشتے بھی اپنے اثرات دلوں پر ڈالتے ہیں۔ دلوں میں کبھی اچھے خیالات و کیفیات کا القاء بھی ان کی طرف سے ہوتا ہے۔ خدا کے نیک بندوں کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

پھر جس طرح موجودہ دنیا کے اثرات دلوں پر پڑتے ہیں۔ اسی طرح عالم بالا کے اثرات بھی قلب انسانی پر پڑتے ہیں۔ خدا جس کسی سے محبت فرماتا ہے وہ عالم بالا کے فرشتوں میں محبوب بن جاتا ہے اور پھر زمین پر اس کی مقبولیت اترتی ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں اس کی ذات نہایت محبوب ہو جاتی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

اس سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی فراموش کرنا صحیح نہ ہوگا کہ خدا خود قابلِ قدر قلوب کی تربیت فرماتا ہے۔ رحمت و سکینت کا اس کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔ غیبی فیوض و برکات کے ذریعہ سے خدا اپنے مخلص وفادار بندوں کی مدد کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ (المجادلہ:۲۲)

”وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے (خدا نے) ایمان کو ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک فیض روحانی کے ذریعہ سے ان کی تائید فرمائی ہے۔“

خدا دلوں کے اندر جماؤ اور استقلال کی قوت بخشتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا ہے کہ جو ایمان لانے سے، گریز کرتا اور سرچشمۂ نور ہدایت سے اپنا رشتہ منقطع رکھتا ہے تو خدا بھی ایسے شخص کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے لیے وہی راہ ہموار کر دیتا ہے جس پر وہ چلنا چاہتا ہے۔
(اللیل:۸-۱۰)

اہلِ ایمان کے قلوب کو وہ گم راہی اور ضلالت سے بچاتا اور ان کو ہدایت کی طرف مائل کرتا ہے:

وَ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ط (التغابن:۱۱) ''اور جو کوئی خدا پر ایمان رکھتا ہے تو وہ اس کے دل کی رہ نمائی کرتا ہے (اس کے دل کو بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑتا)۔''

یوں تو خدا کی جانب سے فیوض و برکات کی ہوائیں چلتی ہی رہتی ہیں لیکن اس کے بعض مخصوص اوقات بھی ہیں جن میں خاص طور سے عبادت اور دعا وغیرہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے قلوب رحمتوں کے جھونکوں اور ان کی ہواؤں سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں اور مضر ہواؤں کے برے اثرات کا مقابلہ کرنے کی ان کے اندر قوت ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہر قسم کے برے اثرات سے ان کے دل محفوظ رہتے ہیں اور اگر ان کے دل پر کوئی غلط اثر پڑ بھی جاتا ہے تو بہت جلد ان کا دل ان اثرات کو رد کر دیتا ہے، ان کو اپنے اندر کسی قیمت پر باقی نہیں رہنے دیتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے دلی رجحانات کے تابع ہوتا ہے۔ دل کی درستی ہی زندگی کی درستی اور اصلاح وفلاح کی ضامن ہوتی ہے۔ آخرت کی کام یابی کا بھی اصل انحصار دل کی درستی پر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ۙ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝ؕ (الشعراء:۸۸-۸۹) ''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے بجز اس کے کہ کوئی صحیح سالم دل لے کر خدا کے پاس آیا ہو۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ ۝ۚ مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِ ۝ۙ (ق:۳۲-۳۳) ''یہ ہے وہ چیز (یعنی جنت) جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر رجوع رہنے والے، بڑی نگہ داشت کرنے والے کے لیے۔ جو رحمٰن سے ڈرا غیب میں اور آیا رجوع رہنے والا دلِ گرویدہ لے کر۔''

اس موقعہ پر تاریخ کے اس عظیم واقعہ پر نظر ڈال لینی چاہیے جب دنیا میں کفر وضلالت کی آندھیاں زوروں سے چل رہی تھیں، انسان کے قلوب پر ان کی یورش تھی، خدا کو انسانی قلوب کی تباہی اور پامالی پر رحم آیا اور اس نے وحی کی صورت میں رحمت کی ہوا بھیجی۔ اس سلسلہ میں غیبی

اور ظاہری دونوں ذرائع استعمال میں لائے گئے۔ حضرت جبریلؑ جیسے مقرب فرشتے کو اس کام پر مامور کیا گیا جن کا تعلق غیبی مخلوق سے تھا اور حضرت محمد (ﷺ) جیسے شریف النفس انسان کو رسالت کے لیے منتخب کیا گیا جو انسانی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایک فرد تھے۔ کفر و ضلالت کے مقابلہ میں رحمت کی ہوائیں بھی نمایاں طور پر چلیں اور کامل ۲۳ سال تک چلتی رہیں۔ تاریخ نے دیکھا کہ اس بابرکت ہوا نے کتنے ہی دلوں کو بدل کر رکھ دیا۔ کتنے ہی قلوب ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک ہو گئے۔ اس بادِ رحمت سے ان ہی لوگوں کے دل فائدہ نہ اٹھا سکے جن میں سخت قسم کا روگ تھا۔ اور وہ اس روگ کو پالے ہی رہنا چاہتے تھے۔ خدا کی یہ رحمت قرآن کی شکل میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ قرآن کے اثرات قبول کرنے کے بعد دلوں کی جو کیفیت و حالت ہوتی ہے وہی صحت کی علامت ہے۔ اس کے برخلاف دلوں کی دوسری حالتوں اور کیفیتوں کو ہرگز محمود نہیں کہا جا سکتا۔

عفوودرگزر

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: مَا مِنْ رَّجُلٍ یُّصَابُ بِشَیْءٍ فِیْ جَسَدِهٖ فَتَصَدَّقَ بِهٖ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهٖ دَرَجَةً وَّ حَطَّ عَنْهُ خَطِیْئَةً۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے سنا: ''جس کسی شخص کے جسم کو زخمی کیا گیا ہو اور وہ اس کو معاف کر دے جس نے اسے زخمی کیا ہو تو اللہ لازماً اس کا درجہ بلند فرماتا اور اس کے گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔''

تشریح: یعنی اگر کوئی شخص جسے زخم پہنچایا گیا ہو اس آدمی کو جس نے اسے زخمی کیا بخش دے اور کوئی بدلہ نہ لے حالانکہ بدلہ لینے کا اسے پورا حق حاصل ہے تو اس کا یہ عمل نہایت پسندیدہ ہے۔ زخم پہنچانے والے کو معاف کر کے درحقیقت وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ لوگوں کی عام اخلاقی سطح سے بلند ہے۔ اس کے اندر صبر و تحمل کی غیر معمولی قوت موجود ہے۔ بدلہ اور انتقام نہ لینے سے دل چسپی اسے اپنے اعلیٰ ذوق اور اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ہے۔ اللہ کو یہ چیز اتنی پسند ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس کی اس بلندی اور رفعتِ مقام کی محافظت کرتا اور اسے اس مرتبہ سے گرنے

سے بچاتا ہے بلکہ زندگی میں خود اس شخص سے جو بھول چوک اور غلطی ہوئی ہوتی ہے اسے بھی معاف کردیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آدمی اگر خدا کے کسی بندے کے ساتھ اعلیٰ ظرفی سے کام لیتا ہے تو لازماً خدا بھی اس کے ساتھ شانِ کریمی سے ہی پیش آئے گا۔

دردمندی

(۱) عَنْ اَنَسٍؓ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ لاَ یَدْخُلُ عَلٰی اَحَدٍ مِّنَ النِّسآءِ اِلاَّ عَلٰی اَزْوَاجِہٖ اِلاَّ اُمَّ سُلَیْمٍ فَاِنَّہٗ کَانَ یَدْخُلُ عَلَیْھَا فَقِیْلَ لَہٗ فِیْ ذٰلِکَ فَقَالَ: اِنِّیْ اَرْحَمُھَا قُتِلَ اَخُوْھَا مَعِیَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی بیویوں اور ام سلیم کے سوا کسی عورت کے یہاں نہیں جاتے تھے۔ آپؐ ام سلیم کے ہاں جایا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپؐ سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: ”مجھے اس پر بے حد رحم آتا ہے، اس کا بھائی مارا گیا جب کہ وہ میرے ساتھ تھا۔“

تشریح: حضرت امّ سلیمؓ حضرت انسؓ کی ماں اور حضرت ابوطلحہؓ کی بیوی تھیں۔ وہ درحقیقت نبی (ﷺ) کی رضاعی یا نسبی خالہ ہوتی تھیں۔ جیسا کہ امام نوویؒ نے اس کی تصریح کی ہے اور محرم ہونے کی وجہ سے آپؐ کے لیے ان کے یہاں تشریف لے جانے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق انسانی میں رحمت اور سوز و دردمندی کی بڑی اہمیت ہے اور یہ حقیقت میں پیغمبرانہ اخلاق میں سے ہے۔

دردمندی کی کیفیت سے جو دل خالی ہو وہ بالکل ہی بے حس اور بے جان ہوگا۔ دل تو سوز و درد کی کیفیت ہی سے عبارت ہے۔ یہ چیز اگر دل میں نہ ہو تو دل کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ مروّت اور دردمندی اور غم خواری کا جذبہ اگر دل میں موجود ہے تو سمجھیے کہ دل زندہ ہے۔ بہ صورت دیگر وہ مردہ ہے۔ اس سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

رفق و نرمی

(۱) عَنْ عَائِشَۃَؓ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: یَا عَائِشَۃُ اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُّحِبُّ الرِّفْقَ وَ یُعْطِیْ عَلَی الرِّفْقِ مَالاَ یُعْطِیْ عَلَی الْعُنْفِ وَ مَالاَ یُعْطِیْ عَلٰی مَا سِوَاہُ۔ (مسلم)

ترجمہ: نبی ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! اللہ نرم خو ہے، نرم خوئی کو پسند فرماتا ہے اور نرم خوئی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو درشتی و سختی پر عطا نہیں کرتا اور نہ نرم خوئی کے سوا کسی دوسرے وصف پر عطا کرتا ہے۔''

تشریح: صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّہٖ ''اللہ نرم خو ہے اور ہر معاملہ میں نرم رویہ کو پسند فرماتا ہے۔''

اس حدیث سے نرم خوئی اور نرم رویہ اختیار کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ جب نرم خوئی خود اللہ رب العزت کی صفت ہے تو اس کی عظمت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ نرمی کے اندر خدا نے بڑی وسعت اور برکت رکھی ہے۔ نرمی کے ذریعہ سے انسان وہ فائدے حاصل کر سکتا ہے جو سختی کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے انسان کے خود اپنے مصالح کا بھی تقاضا یہی ہے کہ وہ آپس کے معاملات میں نرمی اور مہربانی کا رویہ اختیار کرے۔ اللہ کو جو بات پسند ہو سکتی ہے وہ یہی کہ اس کے بندے باہم ایک دوسرے پر مہربان ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے سخت گیر ہرگز نہ ہوں۔ وہ اپنے سلوک اور طرزِ عمل میں نرمی اور نرم خوئی کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔ اس سے جو دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں وہ تو حاصل ہوں گے ہی، اس سے خود اپنی ذات اور شخصیت کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس کی طرف بالعموم لوگوں کی نظر نہیں جاتی کہ نرم خوئی حقیقت میں سیرت و کردار کا حسن ہے۔ اور پھر اس سے انسان کو قلبی طور سے جو سکون و راحت کی کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کے اظہار سے الفاظ بھی قاصر نظر آتے ہیں۔ نرم خوئی کی دل کشی و دل ربائی نہایت معتبر ہوتی ہے۔ اس کے جو اثرات دوسروں کے دلوں پر ثبت ہوتے ہیں وہ مٹائے نہیں مٹتے۔ Soft is the music that would charm forever

﴿۲﴾ وَعَنْ جَرِیْرٍؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ یُّحْرَمِ الرِّفْقَ یُحْرَمِ الْخَیْرَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جریرؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص نرم خوئی سے محروم ہے وہ تمام بھلائیوں سے محروم ہے۔''

تشریح: سیرت و کردار کی تعمیر میں نرم خوئی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انسان کی اکثر بھلائیوں اور خوبیوں کا سرچشمہ اس کے مزاج کی نرمی اور ملائمت ہے۔ اس لیے نرم خوئی سے محرومی ہر قسم کی بھلائی اور خیر سے اپنے دامن کو تہی رکھنے کے مترادف ہے۔

آپ معاشرتی پہلو سے غور کریں۔ اگر آدمی کے اندر نرمی کا مادّہ نہیں ہے تو وہ کم زوروں، ضعیفوں، ناداروں اور اپنے زیردستوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھنے میں ناکام ثابت ہوگا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ مجبوروں اور بے کسوں کی توقعات وہی شخص پوری کرسکتا ہے جسے دل دردمند ملا ہو، جسے دوسروں کی تکلیف اور ان کی ضرورتوں کا احساس ہو۔ اور یہ احساس ایسا ہو کہ اس کو بے چین کرسکے۔ حساس دل رکھنے والوں کے کان نہایت تیز ہوتے ہیں، وہ ان صداؤں کو بھی سن لیتے ہیں جو مجبوروں کے دلوں میں دبی ہوتی ہیں اور ان کی زبانوں تک نہیں پہنچتی ہیں۔ وہ اس بے کسی اور بے چارگی کی حالت کو بھی محسوس کرلیتے ہیں جو کسی نادار و مفلس و بے نوا شخص کو پیش آتی ہے۔ کم زوروں اور ضعیفوں کے ساتھ نرم برتاؤ اور ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہوتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اپنے زیردست ہوں ان کے ساتھ احسان کرنا چاہیے۔ ان سے ان کی قوت سے زیادہ کام نہ لیا جائے اور کوشش اس بات کی ہو کہ ہم انھیں ان کے واجب الادا مطالبہ سے زیادہ دے سکیں۔ ان کے ساتھ انسانیت کا سلوک کریں۔ ان کی خودداری و عزت کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اگر ان کے اندر کچھ قابلِ اصلاح چیزیں پائی جاتی ہیں تو حکمت کے ساتھ ان کی اصلاح بھی کرنے کی کوشش کریں۔ شرافت اور نرمی اور شفقت میں ایسی قوت پائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے پتھر سے سخت دلوں کو بھی موم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ظرف درکار ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس راز سے باخبر ہوں کہ آدمی کے لیے عزت کی چیز اصل میں یہ ہے کہ اس کے اندر صبر و تحمل اور نرمی و غم خواری کا مادہ پایا جاتا ہو۔ دلوں کو آرام پہنچانے میں اسے آرام ملتا ہو۔ یہی چیز آدمی کو خدا کی نگاہ میں اونچا بناتی ہے۔ آدمی کا سارا غرور اور پندار ختم ہوکر رہتا ہے۔ لیکن اچھی سیرتوں کے نقوش ایسے ہوتے ہیں جو کبھی نہیں مٹ سکتے۔ لوگ صرف شراب کی لذت اور اس کے سرور کو جانتے ہیں یا پھر کھانے پینے کی لذت سے آشنا ہوتے ہیں لیکن خدا نے جو لذت نیکی اور حسنِ سیرت میں رکھی ہے وہ لذت کہیں نہیں پائی جاتی۔

ایک بنیادی چیز ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ اس سے دین کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ہر چیز کا ایک سرچشمہ اور منبع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہوا ہماری ضرورت ہے۔ ہم ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ ہوا کا ایک عظیم خزانہ ہے جو ہم سے کچھ بھی دور نہیں۔ ہم اس خزانہ سے ہوا حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی عناصر کا ذخیرہ یہ زمین ہے جس سے ہمیں یہ عناصر

حاصل ہوتے ہیں۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو ہوا کی ایک وسیع فضا سے ہمارا ربط قائم ہوجاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ہمارے اندر رحمت وشفقت اور مروت کے جذبات ابھرتے ہیں اور ہم ان جذبات کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں اور انھیں دباتے نہیں بلکہ کم زوروں، ناچاروں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں تو درحقیقت اس وقت ہم خدا کی بزرگ و برتر ہستی سے فیض یاب ہورہے ہوتے ہیں جو رحمت وشفقت اور مہربانیوں کا اصل سرچشمہ ومنبع ہے۔ جہاں کہیں جس شکل میں رحمت کے آثار پائے جاتے ہیں وہ اسی کی رحمت کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ جس کسی کا تعلق خدا سے قائم ہوجاتا ہے تو خدا اس پر لطف واحسان فرماتا ہے۔ اس کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوتا ہے اور اس پر نوازش کرتا ہے یہاں تک کہ اسے جنت میں داخل کردیتا ہے جو خدا کے لطف واحسان کا کامل مظہر ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَائِشَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لِعَائِشَةَ عَلَیْکَ بِالرِّفْقِ وَ اِیَّاکِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ اِنَّ الرِّفْقَ لاَ یَکُوْنُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَهٗ وَلاَ یُنْزَعُ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے ان سے فرمایا: ”نرم خوئی کو اپنے اوپر لازم جانو اور سختی و درشتی اور بے حیائی سے بچتی رہو۔ اس لیے کہ نرمی جس چیز میں ہوتی ہے وہ اس کے لیے زینت کا باعث ہوتی ہے اور جس چیز سے نرمی الگ کرلی جاتی ہے وہ شے اس سے عیب دار ہوجاتی ہے۔“

تشریح: ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ نقل ہوتے ہیں: یَا عَائِشَةُ ارْفُقِیْ ”اے عائشہ! نرمی خوئی اختیار کرو۔“

کسی چیز میں خوب صورتی کا پایا جانا اس کے درست اور پسندیدہ ہونے کا ایک بین ثبوت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نرمی اور لطافت صرف پھولوں کی زینت نہیں ہے بلکہ انسانی اخلاق ومعاملات میں بھی اس سے جاذبیت اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ جس وصف کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی چیز بگڑ جاتی اور عیب دار ہوجاتی ہو اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عیب دار شے سے ہم خیر کی توقع نہیں کرسکتے۔ خیر اور بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ ہم زندگی میں نرمی اور نرم رویے کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔

﴿۴﴾ وَ عَنۡهَا قَالَتۡ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِاَهۡلِ بَیۡتٍ رِّفۡقًا اِلَّا نَفَعَهُمۡ وَلَا یُحۡرِمُهُمۡ اِیَّاهُ اِلَّا ضَرَّهُمۡ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ کسی گھر کے لوگوں کے لیے نرم خوئی عطا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو لازماً اس کے ذریعہ سے انھیں نفع پہنچاتا ہے اور اس کے برخلاف جس کسی گھر کے لوگوں کو نرم خوئی سے محروم رکھتا ہے تو لازماً ان کو ضرر پہنچاتا ہے۔''

تشریح: کسی گھر کے افراد میں اگر نرمی کی صفت پائی جاتی ہے تو یہ بڑے ہی خیر و برکت کی چیز ہے۔ اس کی وجہ سے گھر جنت نشان بن جاتا ہے۔ گھر میں ایک خوش گوار فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ مزاج اور رویہ کی نرمی سے ہر شخص دوسروں کے لیے سکون و راحت کا باعث ہوگا۔ ان میں باہم محبت و مودت کا جذبہ کارفرما ہوگا۔ گھر کا ہر فرد دوسرے کا خیر خواہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر گھر کے افراد میں نرمی کے بہ جائے سختی اور تند خوئی پائی جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ گھر کے لوگ ہمیشہ ایک قسم کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ گھر کی فضا مکدّر ہو کر رہے گی۔ ذہنوں میں تناؤ کی سی کیفیت پائی جائے گی۔ گھر کے لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت و مودت کے بہ جائے حسد و بدخواہی کے جذبات ابھریں گے۔ گھر کا سکون غارت ہو کر رہ جائے گا۔ آخرت کی زندگی میں اس کی وجہ سے جو نقصانات اٹھانے ہوں گے وہ الگ ہیں۔

﴿۵﴾ وَ عَنۡهَا قَالَتۡ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ مَنۡ اُعۡطِیَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفۡقِ اُعۡطِیَ حَظَّهٗ مِنۡ خَیۡرِ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ وَ مَنۡ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفۡقِ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنۡ خَیۡرِ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ۔ (البغوی فی شرح السنۃ)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی شخص کو نرم خوئی میں سے حصہ ملا اسے دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہوئی اور جس کسی شخص کو نرم خوئی نصیب نہ ہوئی وہ دنیا و آخرت کی بھلائی سے محروم رہا۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ زندگی خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، اس کا مزاج ایک ہے۔ جو چیز دنیا کی زندگی پر جس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے، آخرت کی زندگی پر بھی وہ اسی انداز سے اپنا اثر ڈالتی ہے۔ دنیا اور آخرت میں جو خیر اور بھلائی ہے اس کے حصول کا ذریعہ ایک خاص اخلاقی

رویہ ہے۔ زندگی میں اس اخلاقی رویہ کو مصنوعی طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے مزاج میں نرمی ہو، درشتی اور سختی نہ ہو۔ مزاج کی یہی ملائمت اور نرمی آدمی کے کام کو آسان کر دیتی ہے اور وہ فطری طور پر اس اخلاق و کردار کا حامل بن جاتا ہے جس کی وجہ سے دنیا و آخرت کی بھلائیاں اس کے حصے میں آتی ہیں۔ ایسا شخص نہ دنیا میں محروم خیر ہوتا ہے اور نہ آخرت میں اسے ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑ سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص طبیعت کا سخت اور درشت مزاج ہے تو یہ چیز اسے دنیا میں بھی حقیقی سکون و راحت، عافیت اور خیر سے محروم رکھے گی اور آخرت میں بھی ناکامی اور محرومی کی منزل تک اس کے پہنچنے کا سبب بنے گی۔

نرمی اور رِقت ایک بنیادی وصف اور سرچشمۂ خیر و برکت ہے۔ اس کا ثبوت اس حدیث سے بھی ملتا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے اہلِ یمن کے بارے میں فرمایا: هُمْ اَرَقُّ اَفْئِدَةً اَلْاِيْمَانُ يَمَانٍ وَالْفِقْهُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانٍ (مسلم) ”وہ لوگ نہایت رقیق القلب ہوتے ہیں۔ ایمان، دین کی سمجھ اور حکمت تو یمن ہی کا حصہ ہے۔“ یعنی قساوت قلبی سے پاک ہیں۔ یہ اپنے رقت ولیونت کے وصف کی بہ دولت ایمان، دینی سمجھ اور حکمت سے بہرہ مند ہوئے۔

〈۲〉 وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَّحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَ بِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَيْهِ عَلٰى كُلِّ هَيِّنٍ لَيِّنٍ قَرِيْبٍ سَهْلٍ۔

(ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں تمھیں اس شخص کی خبر نہ دوں جو دوزخ کے لیے حرام ہے اور جس پر دوزخ کی آگ حرام ہے؟ (دوزخ حرام ہے) ہر اس شخص پر جو نرم طبع، نرم خو، قریب ہونے والا، آسانی سے پیش آنے والا ہو۔“

تشریح: اس حدیث میں جن چار اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ قریب المعنی ہیں اور نرم خوئی کے مختلف پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص نرم مزاج، شیریں طبیعت اور بامروت ہو اور ہر طرح کے تصنع و تکلف سے بے نیاز ہو کر لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا ہو، نہ تو وہ لوگوں سے دور رہتا ہو اور نہ لوگوں ہی کو اس سے قریب ہونے میں کوئی تامل اور جھجک محسوس ہوتی ہو تو یہ اس بات کی خبر ہے کہ اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ کیوں کہ یہ اوصاف جن سے وہ متصف ہے اہلِ جنت کے اوصاف ہیں۔ البتہ اس قسم کی بشارتوں کے سلسلہ میں یہ بات

پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان کا تعلق ہمیشہ ان لوگوں سے ہوتا ہے جو مومن ہوں، کافر نہ ہوں اور دین کے لازمی مطالبات کی طرف سے غافل نہ ہوں۔ اس قسم کی بشارتوں کے ساتھ یہ چیز ہمیشہ ملحوظ (Understood) اور مشروط ہوتی ہے۔ بشارتیں اہلِ کفر کے لیے نہیں ہوا کرتیں اور نہ ان لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو دین کے تقاضوں سے یکسر غافل رہ کر زندگی بسر کرتے ہوں اور ایمان کے بغیر تو خدا کے یہاں کسی بھی عمل اور اخلاق کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔

شفقت و رحمت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِیْ كِتَابِهٖ وَ هُوَ یَكْتُبُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَ هُوَ وَضْعٌ عِنْدَهٗ عَلَی الْعَرْشِ اِنَّ رَحْمَتِیْ تَغْلِبُ غَضَبِیْ۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب میں لکھا۔ وہ اپنی ذات کے متعلق لکھتا ہے ـــ اور وہ نوشتہ اس کے پاس عرش پر رکھا ہوا ہے ـــ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''

تشریح: ایک روایت میں خدا کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ (مسلم) ''میری رحمت کو میرے غضب پر سبقت حاصل ہے۔''

رحمت خدا کی خاص صفت ہے۔ اس لیے بندوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں ہمیشہ شفقت اور رحم دِلی کا رویّہ اختیار کریں۔ کسی معاملہ میں سختی صرف اسی وقت اختیار کرنی چاہیے جب اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے، ورنہ زندگی کے عام حالات میں نرمی اور رحم دِلی سے ہی کام لینا مردوں کا شیوہ ہے۔ آدمی کی شخصیت میں بھی دل آویزی اور جاذبیت اسی وقت پیدا ہو سکتی اور باقی رہ سکتی ہے جب کہ نرمی و رحم دلی اس کا نمایاں وصف ہو۔''

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔''

تشریح: اس مفہوم کی کئی احادیث مروی ہیں مثلاً: اِنَّہٗ مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ (مسلم) ''جو رحم نہیں کرے گا تو خدا بھی اس پر رحم نہ فرمائے گا'' ـــــ ایک حدیث کے الفاظ ہیں: مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ لَا یَرْحَمُہُ اللّٰہُ (مسلم) ''جو لوگوں پر رحم نہ کرے گا تو خدا بھی اس پر رحم نہ فرمائے گا۔''

ایک حدیث میں ہے: مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یَعْرِفْ حَقَّ کَبِیْرِنَا فَلَیْسَ مِنَّا (ابوداؤد، حاکم) ''جو شخص ہمارے چھوٹے پر رحم و شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

احمد و ترمذی میں مروی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یُوَقِّرِ الْکَبِیْرَ وَ یَرْحَمِ الصَّغِیْرَ وَ یَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ ''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے (یعنی وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے) جس نے نہ بڑے کی تعظیم و توقیر کی اور نہ چھوٹے پر رحم کیا اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا۔''

ایک اور حدیث ہے: اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا اَھْلَ الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ (ابوداؤد، ترمذی) ''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرمائے گا۔ تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمان میں ہے۔'' ایک روایت میں اَھْلَ الْاَرْضِ کے بہ جائے مَنْ فِی الْاَرْضِ کے الفاظ ملتے ہیں۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

ان احادیث سے یہ بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی عنایت اور اس کے رحم و کرم کا مستحق بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بندگانِ خدا کے لیے رحم کا پیکر بنیں۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی رحمت ہمارے حصے میں آئے گی۔ اور اگر خدانخواستہ ہمارا رویّہ اس سے مختلف ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خود خدا کی عنایتوں اور اس کی رحمت سے اپنے آپ کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

حدیث میں ''النّاس'' لفظ آیا ہے جو مومن اور منکر سب کو شامل ہے۔ ہمارے رحم کے مستحق سبھی ہیں، بلکہ اہلِ کفر اور خدا کے نافرمانوں کے لیے تو ہمارے اندر اور بھی زیادہ بے چینی اور فکر ہونی چاہیے کہ وہ کسی طرح سے کفر سے باز آجائیں اور خدا کے عذاب سے بچ سکیں۔

(۳) وَ عَنْ عَائِشَۃَ ؓ قَالَتْ: جَآءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: اَتُقَبِّلُوْنَ الصِّبْیَانَ

فَمَا نُقَبِّلُهُمْ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ اَوْ اَمْلِکُ لَکَ اِنْ نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ قَلْبِکَ الرَّحْمَةَ۔
(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دیہاتی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور صحابہؓ کو بچوں کو پیار کرتے اور ان کو بوسہ لیتے دیکھ کر) کہا کہ کیا آپؐ لوگ بچوں کا بوسہ لیتے ہیں۔ ہم تو ان کا بوسہ نہیں لیتے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’پھر تیرے سلسلے میں مجھے کیا اختیار ہوسکتا ہے جب کہ اللہ نے تیرے دل سے رحمت نکال لی ہے۔‘‘

تشریح: یعنی میں ایسی حالت میں کیا کرسکتا ہوں جب کہ خدا نے تیرے دل سے رحمت چھین لی ہے۔ مجھے یہ اختیار تو حاصل نہیں ہے کہ جس چیز کو خدا تیرے دل سے نکال لے میں اس کو تیرے دل میں رکھ دوں یا سرے سے تیرے دل سے رحمت کو نکلنے ہی نہ دوں۔

اس حدیث میں درحقیقت یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بچوں سے پیار و محبت سے پیش آنا اور ان کا بوسہ لینا آدمی کی اپنی عظمت اور وقار کے خلاف ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تو وہ رحمت ہے جسے لوگوں کے دلوں میں خدا نے رکھ دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنی نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے اس کو اپنی شان کے منافی سمجھنے لگ جائے تو ایسی صورت میں خدا کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کا دل سخت اور رحمت و شفقت کے جذبہ سے یکسر خالی ہوجاتا ہے۔ اس میں قصور اس کا اپنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ کسی دوسرے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِیٍّ (ابوداؤد، ترمذی، احمد) ’’رحمت بس بدبخت ہی سے چھینی جاتی ہے۔‘‘ بدبخت اور بے نصیب ہے وہ شخص جس کا دل رحمت کے مادہ سے خالی ہو۔

(۴) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَاَمْسَکَ عِنْدَهٗ تِسْعَةً وَّ تِسْعِیْنَ جُزْءًا وَّ اَنْزَلَ فِی الْاَرْضِ جُزْءًا وَّاحِدًا فَمِنْ ذٰلِکَ الْجُزْءِ تَتَرَاحَمُ الْخَلْقُ حَتّٰی تَرْفَعَ الْفَرَسُ حَافِرَهَا عَنْ وَّلَدِهَا خَشْیَةَ اَنْ تُصِیْبَهٗ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ’’اللہ نے رحمت کے سو حصے کیے، پھر ننانوے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین میں اتارا۔ مخلوق جو ایک دوسرے پر رحم کرتی ہے وہ اسی ایک حصے کے سبب سے کرتی ہے۔ یہاں تک کہ

گھوڑا بھی اپنے بچے پر سے اس خوف سے پاؤں اٹھالیتا ہے کہ اسے تکلیف نہ ہو۔''

تشریح: تمثیل کے طور پر ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے اپنی رحمت کا صرف سوّاں حصہ (۱/۱۰۰) ہی زمین میں اتارا ہے۔ رحمت کا باقی حصہ اس کے اپنے پاس موجود ہے تاکہ لوگ ایک طرف اس کی رحمت کی کارفرمائیوں اور اس کے اثرات کا مشاہدہ کرسکیں اور دوسری طرف وہ خدا کی اس رحمت کے امیدوار بنیں جو اس نے اپنے پاس روک رکھی ہے۔ خدا کے پاس جو رحمت ہے جس کا اظہار آخرت کی دنیا میں ہوگا وہ دنیا میں ظاہر ہونے والی رحمت کا صرف سو گنا ہو ایسا نہیں ہے اور نہ حدیث کی یہ مراد ہی ہے۔ خدا کے پاس جو رحمت ہے وہ لامتناہی ہے۔ لامتناہی کو محدود اور متناہی سے نسبت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ یہ تمثیل محض یہ تصور دلانے کے لیے پیش فرمائی گئی ہے کہ خدا کی جو رحمت دنیا میں نازل ہوئی ہے وہ اس رحمت کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہے جو اس کے اپنے پاس موجود ہے۔ اس تھوڑی سی رحمت کا اثر یہ ہے کہ مخلوق خدا میں ترحم و رحمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انسان تو انسان حیوانات تک میں رحمت کے آثار نمایاں ہیں۔ کسی جانور کا مثلاً گھوڑے کا پیر اگر غلطی سے اس کے اپنے بچہ پر پڑ جاتا ہے تو وہ فوراً اپنا پاؤں بچے پر سے اٹھالیتا ہے کہ بچے کو تکلیف نہ ہو۔

سوچنے کی بات ہے کہ خدا اپنی رحمت کو پورے طور پر ظاہر فرمائے گا تو پھر اس کے اثرات کیا اور کس رنگ میں ظاہر ہوں گے، اس کا تو آج ہمارے لیے صحیح طور پر تصوّر کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

جانوروں پر رحم

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: بَیْنَمَا رَجُلٌ یَّمْشِیْ بِطَرِیْقٍ اِشْتَدَّ عَلَیْہِ الْعَطَشُ فَوَجَدَ بِئْرًا فَنَزَلَ فِیْھَا فَشَرِبَ ثُمَّ خَرَجَ فَاِذَا کَلْبٌ یَّلْھَثُ یَاْکُلُ الثَّرٰی مِنَ الْعَطَشِ فَقَالَ الرَّجُلُ لَقَدْ بَلَغَ ھٰذَا الْکَلْبَ مِنَ الْعَطَشِ مِثْلُ الَّذِیْ کَانَ بَلَغَ مِنِّیْ فَنَزَلَ الْبِئْرَ فَمَلَاَ خُفَّہٗ مَآءً ثُمَّ اَمْسَکَہٗ بِفِیْہِ حَتّٰی رَقِیَ فَسَقَی الْکَلْبَ فَشَکَرَ اللّٰہُ لَہٗ فَغَفَرَلَہٗ۔ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَ اِنَّ لَنَا فِیْ ھٰذَا الْبَھَآئِمِ لَاَجْرًا۔ فَقَالَ: فِیْ کُلِّ کَبِدٍ رَّطْبَۃٍ اَجْرٌ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص راہ سے گزر رہا تھا۔ اسے سخت پیاس لگی۔ اس کو ایک کنواں ملا۔ وہ اس میں اترا اور اس نے پانی پیا۔ پھر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا اپنی زبان نکالے ہانپ رہا ہے اور (پیاس کے مارے) گیلی مٹی کھا رہا ہے۔ وہ شخص بولا کہ اس کتے کا بھی پیاس کے مارے وہی حال ہو گیا ہے جیسا حال میرا ہو گیا تھا۔ پھر وہ کنویں میں اترا اور اپنے موزے میں پانی بھرا۔ پھر اپنے منہ سے موزے کو تھام کر اوپر چڑھا اور اس نے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے اس کی اس نیکی کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرما دی۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کیا ان جانوروں کے سلسلے میں بھی ہمارے لیے اجر و ثواب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہر ایک تر جگر میں تمھارے لیے اجر ہے۔''

تشریح: اس شخص نے دیکھا کہ پیاس کی وجہ سے اس کتے کا برا حال ہے۔ یہاں تک کہ پیاس کی شدت سے وہ گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔

چوں کہ ہاتھ سے کنویں کی دیوار کو پکڑ کر اوپر چڑھنا تھا اس لیے موزے کو اس نے دانت سے پکڑ لیا۔

کتے پر اس کا رحم کھانا اللہ کو اتنا پسند آیا کہ اس کے یہاں اس کی یہ نیکی قبول ہو گئی۔ اور یہ نیکی اس کی مغفرت کا سبب بن گئی۔

یہ سوال کہ کیا جانوروں کے سلسلہ میں بھی اجر و ثواب ہے، کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ اجر و ثواب انسانوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے میں ہے کیا جانوروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے اور ان پر رحم کھانے میں خدا ہمیں اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

آپؐ کا یہ ارشاد کہ ہر تر جگر میں تمھارے لیے اجر ہے، بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کسی میں شعور و حس پایا جائے خواہ وہ جانور اور چوپایہ ہی کیوں نہ ہو، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسے بلا وجہ تکلیف پہنچانی جائز نہیں ہے۔ اس کے ساتھ رحم دلی سے پیش آنا اللہ کو پسند ہے، اور اس پر وہ لوگوں کو اجر و ثواب مرحمت فرمائے گا۔ شعور و حس کی رعایت زندگی کی ایک اہم قدر ہے۔

〈۲〉 وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: دَخَلَتِ امْرَأَةٌ النَّارَ فِي هِرَّةٍ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک عورت دوزخ میں

ایک بلی کی وجہ سے ڈالی گئی۔ اس نے اسے باندھ رکھا تھا۔ نہ تو اس نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ (چل پھر کر) حشرات الارض میں سے کچھ کھا لیتی۔‘‘

تشریح: صحیح مسلم کی ایک مفصل روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بے رحم عورت نے اس بلی کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ اسی حال میں بھوکی پیاسی مرگئی۔ اس روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عورت بنی اسرائیل میں سے تھی۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ بے رحمی اور سخت دلی اختیار کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی جہنم کے انجام سے دوچار ہوسکتا ہے۔ بے رحمی خواہ جانور ہی کے ساتھ کیوں نہ روا رکھی جائے اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے بالکل ناآشنا ہے۔ اسے خدا کی گرفت کا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ جانور جو اس کے قابو میں کیے گئے ہیں اس کے مقابلے میں کم زور اور مجبور ضرور ہیں لیکن وہ خدا جو ہمارے تمام کاموں کو دیکھ رہا ہے ہرگز کم زور یا مجبور نہیں ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَامِرٍ الرَّامِؓ قَالَ بَيْنَا نَحْنُ عِنْدَهٗ يَعْنِيْ عِنْدَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا اَقْبَلَ رَجُلٌ عَلَيْهِ كِسَآءٌ وَّ فِيْ يَدِهٖ شَيْءٌ قَدِ الْتَفَّ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَرْتُ بِغَيْضَةِ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِيْهَا اَصْوَاتَ فِرَاخِ طَائِرٍ فَاَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِيْ كِسَآئِيْ فَجَآءَتْ اُمُّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلٰى رَاْسِيْ فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَيْهِنَّ فَلَفَفْتُهُنَّ بِكِسَآئِيْ فَهُنَّ اُولَاءِ مَعِيْ. قَالَ: ضَعْهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَ اَبَتْ اُمُّهُنَّ اِلَّا لُزُوْمَهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَتَعْجَبُوْنَ لِرُحْمِ اُمِّ الْاَفْرَاخِ فِرَاخَهَا فَوَالَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَفْرَاخِ اِرْجِعْ بِهِنَّ حَتّٰى تَضَعَهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَذْتَهُنَّ وَ اُمُّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَجَعَ بِهِنَّ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عامر رامؓ کا بیان ہے کہ اس وقت ہم ان کے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی تھے کہ ایک شخص آپؐ کے پاس آیا۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس کو اس نے کمبل سے لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں درختوں کے جھنڈ کے پاس سے گزرا۔ وہاں مجھے پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ان کو پکڑ کر

اپنے کمبل میں رکھ لیا، پھر ان کی ماں آئی اور میرے سر پر چکر لگانے لگی۔ میں نے بچوں کے اوپر سے کمبل اس کے لیے ہٹا دیا، وہ ان پر آ گری۔ میں نے ان سب کو اپنے کمبل میں لپیٹ لیا۔ اب وہ سب میرے پاس ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''انھیں (زمین پر) رکھ دو۔'' چنانچہ میں نے انھیں رکھ دیا۔ بچوں کی ماں نے ان بچوں سے لپٹے رہنے کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس پر رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''بچوں کی ماں کے اپنے بچوں پر اس رحم اور دردمندی پر تمھیں تعجب ہو رہا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اللہ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنا ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر ہے۔ تم ان کو لے جا کر جہاں سے ان کو ان کی ماں کے ساتھ پکڑا ہے وہیں رکھ دو۔'' چنانچہ وہ شخص ان کو لے کر واپس چلا گیا۔

تشریح: چڑیا اپنے بچوں کی محبت میں بے چین ہو گئی تھی اور ان کے لیے میرے اوپر منڈلانے لگی۔ جیسے ہی اس کے بچوں پر سے کمبل ہٹایا گیا اور اس نے بچوں کو دیکھا تو وہ ممتا کی ماری ماں بے اختیار ہو کر اپنے بچوں پر آ گری۔ نہ تو وہ اپنی جان بچا کر اڑی اور نہ کچھ اور کیا۔ اس نے بچوں کو چھوڑا نہیں۔ ہر خوف اور خطرے سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے بچوں سے چمٹی ہی رہی۔ خدا کی رحمت اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بڑھ کر ہے۔ جتنا مہربان ماں اپنے بچوں پر ہوتی ہے۔ پھر لوگ ہیں کہ ایسے مہربان خدا سے رشتہ منقطع کر کے اپنے لیے خود تباہی و ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ سَهْلِ بْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ رضؓ قَالَ: مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِبَعِيْرٍ قَدْ لَحِقَ ظَهْرُهُ بِبَطْنِهِ فَقَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ فِيْ هٰذِهِ الْبَهَآئِمِ الْمُعْجَمَةِ فَارْكَبُوْهَا صَالِحَةً وَّاتْرُكُوْهَا صَالِحَةً۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سہل بن حنظلیہؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ ایک اونٹ کے پاس سے گزرے جس کی پشت اس کے پیٹ سے لگ گئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''ان بے زبان! جانوروں کے سلسلے میں خدا سے ڈرو۔ ان پر ایسی حالت میں سواری کرو جب کہ یہ اس کے قابل اور صحت مند ہوں اور ان کو اس حال میں چھوڑو کہ یہ اچھی حالت میں ہوں۔''

تشریح: اونٹ نہایت لاغر اور بھوکا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے کام تو پورا لیا جاتا ہے لیکن اس کے آرام اور اس کی بھوک پیاس کی کچھ بھی پروا نہیں کی جاتی۔ اس چیز نے اس کو اس

قابلِ رحم حالت کو پہنچا دیا تھا۔ یہ بے زبان ہیں، تم سے کچھ نہیں کہہ سکتے، نہ اپنی زبان سے تمھیں برا کہہ سکتے ہیں اور نہ کسی سے تمھاری شکایت کر سکتے ہیں۔ ان پر رحم کرو اور ان کے معاملہ میں خدا سے ڈرتے رہو۔ جب یہ سواری کے لائق ہوں تو ان سے سواری کا کام لو۔ اور اس سے پہلے کہ یہ تھک کر چور ہوں اور ان کی حالت خراب ہو، انھیں چھوڑ دو کہ ان کی قوت بحال ہو جائے اور یہ کچھ کھا پی لیں اور آرام کر لیں۔

﴿۵﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ لَعَنَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ مَثَّلَ بِالْحَیْوَانِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو جانوروں کو مثلہ کرے۔

تشریح: یعنی ان کے کان وغیرہ کاٹ کر ان کی صورتیں نہ بگاڑو۔ اس سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اور آدمی خدا کی رحمتوں سے دور ہو جاتا ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الضَّرْبِ فِی الْوَجْهِ وَ عَنِ الْوَسْمِ فِی الْوَجْهِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے منہ پر مارنے اور منہ پر داغ دینے سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: جسم میں منہ نہایت نازک اور حساس عضو ہے۔ اس پر مارنے یا اس پر داغ دینے سے جانور کو بے حد تکلیف پہنچتی ہے ـــــ خواہ مخواہ کسی جانور کو اذیت دینا بے رحمی اور سخت دلی کی بات ہے، اور اخلاقِ انسانی کے یہ بالکل منافی ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تَتَّخِذُوْا شَیْئًا فِیْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’کسی جان دار کو نشانہ مت بناؤ۔‘‘

تشریح: اسی طرح صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تُصْبَرَ الْبَهَآئِمُ۔ ’’رسولِ خدا ﷺ نے جانوروں کو باندھ کر مارنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘

کسی جانور کو چاند ماری کے لیے استعمال کرنا یا اسے باندھ کر مارنا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے، نہایت بے دردی اور قساوت قلبی کی بات ہے۔ اسلام تو اس لیے آیا ہے کہ لوگوں کے دلوں سے قساوت اور بے رحمی کو دور کرے اور انھیں سراپا رحمت و محبت بنا دے۔ بے رحمی اور سخت دلی خواہ وہ کسی شکل میں ہو، اسلام کبھی بھی اسے پسند نہیں کر سکتا۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: ثِنْتَانِ حَفِظْتُهُمَا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَ اِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوْا الذِّبْحَةَ وَ لِيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ فَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی دو باتیں یاد رکھی ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں بھلائی اور خوبی فرض کی ہے۔ جب قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تم میں سے جو کوئی ذبح کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ چھری کو تیز کر لے اور اپنے جانور کو (حتی الامکان) آرام پہنچائے۔''

تشریح: یعنی بھلائی اور خوبی کو کسی بھی معاملہ میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یہاں تک کہ اگر دشمن یا کسی مجرم کو قتل بھی کرنا ہو تو اس میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اسے اذیت پہنچا کر نہ مارا جائے۔ کسی کو مثلہ نہ کیا جائے۔ اگر جانور کو ذبح کرنا ہو تو اس میں بھی بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ مثلاً جانور بھوکا پیاسا نہ ہو، جس چھری سے ذبح کرنا ہو وہ کند نہ ہو، ذبح کرنے سے پہلے چھری کو تیز کر لیں، تاکہ ذبح کرنے میں آسانی ہو اور جانور کو کم سے کم تکلیف پہنچے۔ اسی طرح جانور کے سامنے چھری تیز نہ کریں اور نہ کسی جانور کے سامنے کسی جانور کو ذبح کریں وغیرہ وغیرہ۔

اجتماعی محاسِن

اجتماعی محاسن
ادراک ونظر

دانش

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں سے ان کے اپنے مرتبے کے مطابق پیش آؤ۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ ہر آدمی کا ایک مرتبہ اور اس کا ایک مقام ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے اس کے مرتبہ پر رکھیں۔ نہ تو ہم اسے وہ درجہ دینے لگ جائیں جو اسے حاصل نہیں ہے اور نہ اس کی اس حیثیت کو نظر انداز کریں جو اسے حاصل ہے۔

علم وتقویٰ اور جائز امتیازات کا لحاظ ضروری ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ہم سے عمر میں بڑا ہے تو ہمیں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ بہت سے دنیا پرست قسم کے لوگ محض دولت کو عزت کا معیار سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ ایک فاسق وفاجر دولت مند شخص کے مقابلے میں توقیر و تعظیم کا اصل مستحق وہ غریب وفقیر ہے جو خدا کا طاعت گزار ہے یا جسے خدا نے علم وفضل سے نوازا ہے۔ دین وتقویٰ کے مقابلے میں دنیوی مال ودولت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ خدا کی نگاہ میں سب سے مکرم وہ ہے جو متقی اور خدا سے ڈرنے والا ہو۔ دنیا کا مال تو قارون کے پاس بہت زیادہ تھا۔ لیکن خدا نے جب اسے اس کی نافرمانیوں کی وجہ سے پکڑا تو اس کی دولت اس کے کچھ بھی کام نہ آسکی۔ وہ تباہ وبرباد ہو کر رہا۔

(۲) وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَمْسَحُ مَنَاکِبَنَا فِی الصَّلٰوۃِ وَ یَقُوْلُ اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُکُمْ لِیَلِنِیْ مِنْکُمْ اُولُوا الْاَحْلَامِ وَالنُّهٰی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعید انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے (صفیں سیدھی کرنے کی غرض سے) ہمارے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے: ''برابر ہوجاؤ اور اختلاف و انتشار نہ پیدا کرو، ورنہ تمھارے دل بھی مختلف ہوجائیں گے۔ تم میں جو عقل وفہم والے ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے قریب ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان سے قریب ہیں۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نماز میں سیدھے اور برابر کھڑے ہو۔ صفیں ٹیڑھی نہ ہوں ورنہ تمھارے دلوں میں بھی پھوٹ پڑ جائے گی۔ ظاہری انتشار واختلاف اندرونی خلفشار کا مظہر ہوتا ہے۔ تمھارے اندر کوئی انتشار واختلاف نہ بھی ہو لیکن اگر تم ظاہر میں اختلاف کو روا رکھو گے تو لازماً اس کا اثر تمھارا باطن بھی قبول کرے گا اور تمھارے دل مختلف ہوجائیں گے۔ پھر تمھارے اندر وہ یک جہتی باقی نہ رہے گی جو دین میں مطلوب ومحمود ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عقل وفہم کی دین میں بڑی اہمیت ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ سمجھ رکھتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ دینی شعور کا حامل ہوسکتا ہے۔ اس لیے دوسروں کے مقابلہ میں وہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ خدا کے رسول کے قریب اسے جگہ حاصل ہو۔

حبّ فی اللہ

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَۃِ۔

(احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اچھا گمان رکھنا اچھی عبادت ہے۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ حسن ظن یا اچھا گمان رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ عباداتِ حسنہ میں سے ہے۔ ہمارے حسنِ ظن کا سب سے زیادہ حق دار خدا ہے۔ خدا سے اچھا گمان نہ رکھنا انسان کے لیے صرف محرومی کی بات نہیں ہے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی یہ اس کی بے حسی، پست ذہنی اور

عدمِ شرافت کا بین ثبوت ہے۔ زندگی میں اصل امتحان اسی بات کا لیا جارہا ہے کہ ہم اپنے رب کے ساتھ کیا گمان رکھتے ہیں۔ ہمیں اس پر اور اس کے وعدوں پر یقین واعتماد ہے یا نہیں ہے۔

انسانوں اور بالخصوص مومنوں کا بھی یہ حق ہوتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ نیک گمان رکھیں۔ بلاوجہ انھیں برا جاننا۔ انھیں منافق اور مکّار اور دغاباز سمجھنا اور اس پر مصر رہنا ایک سماجی اور معاشرتی جرم ہے، بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمیں اخلاق کے نازک تقاضوں کا کچھ بھی پاس ولحاظ نہیں اور شاید ہم ان تقاضوں کی کوئی خبر ہی نہیں رکھتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَلْمُؤْمِنُ مَاْلِفٌ وَّلاَ خَيْرَ فِيْمَنْ لَّا يَأْلَفُ وَلاَ يُؤْلَفُ۔ (احمد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مومن محبت و الفت کا محل ہوتا ہے۔ اور اس شخص میں کوئی خوبی اور بھلائی نہیں جو نہ خود محبت کرتا اور نہ لوگوں کو اس سے الفت ہوتی ہے۔''

تشریح: یعنی مومن سراپا محبت اور سرچشمۂ محبت ہوتا ہے۔ لوگوں سے اس کا اصل رشتہ محبت کا ہوتا ہے۔ لوگ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور یہ چیز بڑی خوبی اور خیر و برکت کی موجب ہے۔ اہل ایمان کا یہ امتیازی وصف اپنے اندر ایک انقلابی قوت رکھتا ہے۔ یہ انقلابی قوت و طاقت ہی کا کرشمہ ہے کہ محبت فاتح عالم بن کر رہتی ہے۔ انسانی قلوب ایمان والوں کی طرف جھکتے ہیں اور بالآخر ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ہم درد اور غم گسار ہوتے ہیں۔ پھر ایثار و محبت کے وہ کردار سامنے آتے ہیں جن پر انسانیت ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

﴿۳﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لاَ تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَلاَ تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا أَوَلاَ اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلاَمَ بَيْنَكُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگے۔ جب تک کہ ایمان نہ لاؤ اور اس وقت تک (صحیح معنی میں) تم

مومن نہیں ہو گے جب تک کہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ رکھو۔ اور کیا میں تمھیں ایک ایسی بات نہ بتادوں کہ جب تم اس پر عمل کرو تو تمھارے درمیان محبت بڑھے۔ وہ یہ کہ آپس میں سلام کو رواج دو۔''

تشریح: کامیاب زندگی اسی شخص کی ہے جو خدا کی نگاہ میں جنت کا مستحق قرار پائے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ وہی لوگ جنت میں داخل ہوسکیں گے جو ایمان لائیں گے، جن کی روش کفر و انکار کی نہ ہوگی۔ پھر ایمان اپنی فطرت کے لحاظ سے ہم سے کچھ باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہلِ ایمان آپس میں ایک دوسرے سے محبت رکھیں۔ بغض وحسد اور کینہ وغرور سے ان کے دل پاک ہوں۔ ایمان کے بعد بھی اگر آدمی تنگ دل، تنگ نظر، بے حوصلہ اور خودغرض ہی بنا رہا تو اس ایمان کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے۔ اسے آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

ایک دوسرے کو سلام کرنے میں ایک بڑی خوبی ہے۔ اس کے بڑے خوش گوار اثرات قلبِ انسان پر پڑتے ہیں۔ لوگوں میں محبت والفت کا تعلق پیدا ہو، سلام کو رواج دینا اس کے لیے ایک مؤثر تدبیر ہے۔

(۴) وَ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَتَی السَّاعَۃُ؟ قَالَ: وَیْلَکَ وَمَا اَعْدَدْتَّ لَھَا؟ قَالَ: مَا اَعْدَدْتُّ لَھَا اِلَّا اِنِّیْ اُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ۔ قَالَ: اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ۔ قَالَ اَنَسٌؓ فَمَا رَاَیْتُ الْمُسْلِمِیْنَ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَرْحَھُمْ بِھَا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا: ''افسوس تجھ پر، تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟'' اس نے کہا کہ میں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو اسی کے ساتھ ہے جس سے تجھے محبت ہے۔'' حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں نے مسلمانوں کو اسلام کے بعد کسی چیز پر اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا آپؐ کے اس ارشاد سے وہ خوش ہوئے۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ قیامت تو اپنے وقت پر آئے گی ہی، ضرورت ہے عمل کی۔ غیر ضروری سوالوں پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ سائل نے کہا کہ میرے جو اعمال بھی ہیں ان کو میں کوئی خاص وزن نہیں دیتا اور نہ ان کو قابلِ ذکر سمجھتا ہوں البتہ مجھے اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے۔ اسی کی میری نگاہ میں اہمیت ہے۔

حقیقت میں اصل فیصلہ کن چیز محبت ہی ہے۔ وہ سارے ہی اعمال جن کا تعلق قلب سے ہے یا جسم و مال سے۔ وہ درحقیقت ایک محبت ہی کی مختلف تعبیریں ہیں۔ محبت ایک نہایت لطیف و نازک جذبہ ہے۔ اسے ذرا بھی کھوٹ گوارا نہیں ہوسکتا۔ جہاں محبت کی کارفرمائی ہوگی وہاں ریا، نام ونمود، غرور، سرتابی، نافرمانی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

ظاہری اعمال اور نیک کاموں کی فہرست تو لمبی سے لمبی ہوسکتی ہے۔ آدمی کتنے ہی نیک اعمال انجام دے پھر بھی کرنے کو کتنے ہی کام باقی رہ سکتے ہیں۔ اعمال کی دنیا میں دوڑ دھوپ کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اگر ظاہری اعمال اور ظاہری نیکیوں کی بنیاد پر ہمارے بارے میں فیصلہ ہوتو ہمارے اعمال تو محدود ہوں گے۔ خدا کی خوشنودی اور اس کا انتہائی قرب ہمارے حصے میں کیوں کر آسکے گا۔ شعوری طور پر یا تحت الشعور آدمی کو یہ فکر ہوسکتی ہے۔ لیکن جب حضور اکرم (ﷺ) کی زبان مبارک سے صحابہؓ نے سنا کہ تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت رکھتے ہوتو انھیں غیر معمولی خوشی اور مسرت حاصل ہوئی۔ نعمتِ اسلام کے بعد یہ دوسری بڑی نعمت تھی جو ان کے حصے میں آئی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ خدا کے یہاں اصل فیصلہ کن چیز محبت اور جذبہ صادق ہے۔ جذبہ صادق کے ثبوت کے لیے نہ طویل عمر درکار ہے اور نہ اس کے لیے طول عمر ناگزیر ہے۔

ذوقِ صحیح

ایثار

﴿۱﴾ عَنْ سَهْلٍؓ قَالَ: جَاءَ تِ امْرَأَةٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم بِبُرْدَةٍ مَّنْسُوْجَةٍ فِيْهَا حَاشِيَتُهَا. اَتَدْرُوْنَ مَا الْبُرْدَةُ؟ قَالُوْا: الشَّمْلَةُ. قَالَ: نَعَمْ، قَالَتْ: نَسَجْتُهَا بِيَدِىْ فَجِئْتُ لِاَكْسُوَكَهَا فَاَخَذَهَا النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم مُحْتَاجًا اِلَيْهَا، فَخَرَجَ اِلَيْنَا، وَ اِنَّهَا اِزَارُهُ، فَحَسَّنَهَا فُلَانٌ فَقَالَ: اُكْسُنِيْهَا مَا اَحْسَنَهَا! فَقَالَ الْقَوْمُ: مَا اَحْسَنْتَ لَبِسَهَا النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم مُحْتَاجًا اِلَيْهَا، ثُمَّ سَأَلْتَهُ وَ عَلِمْتَ اَنَّهُ لَا يَرُدُّ، فَقَالَ: اِنِّىْ وَاللّٰهِ، مَا سَأَلْتُهُ لِاَلْبَسَهَا اِنَّمَا سَأَلْتُهُ لِتَكُوْنَ كَفَنِىْ، قَالَ: سَهْلٌ فَكَانَتْ كَفَنَهُ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت سہلؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بنا ہوا حاشیہ دار بردہ لے کر آئی — کیا تم جانتے ہو کہ بردہ کیا چیز ہے؟ لوگوں نے کہا کہ شملہ (چادر)۔ انھوں نے کہا کہ ہاں اس عورت نے عرض کیا کہ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بنا ہے۔ آئی ہوں کہ آپ کو پہنا دوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرما لیا۔ اس وقت آپؐ کو اس کی ضرورت بھی تھی۔ پھر آپؐ ہمارے پاس تشریف لائے۔ اس وقت آپؐ نے اسے ازار کے طور پر پہن رکھا تھا۔ ایک شخص نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ اسے آپؐ ہمیں عطا فرمائیں۔ یہ کتنی اچھی ہے! لوگوں نے کہا کہ تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اسے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت کی حالت میں پہنا تھا اور

تو نے اسے مانگ لیا۔ حالانکہ تجھے معلوم ہے کہ آپؐ کسی کے سوال کو ردّ نہیں فرماتے۔ اس شخص نے کہا کہ بہ خدا میں نے اسے پہننے کے لیے نہیں مانگا بلکہ اس لیے مانگا کہ یہی میرا کفن ہو۔ حضرت سہلؓ کہتے ہیں کہ وہ چادر اس کا کفن ہی ہوئی۔

تشریح: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی کے سوال کو رد نہیں کرتے۔ حضورؐ کو خود چادر کی ضرورت تھی۔ پھر بھی چادر آپؐ نے سائل کو دے دی۔

اس حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایثار کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایثار حقیقت میں احسان و اخلاق کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ ایثار یہ ہے کہ آدمی اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسرے کی ضرورت کو پورا کر دے۔ حضورؐ کا خود اپنا طرزِ عمل ایثار کا تھا اور آپؐ دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے تھے۔ آپؐ کی تعلیم و تربیت کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرامؓ کی زندگی ہمیں ایثار پیشہ اصحاب کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔

قرآن نے بھی اپنے پیرووں کو ایثار کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ (البقرہ: ۲۳۷) ’’اور آپس میں حق سے بڑھ کر دینا نہ بھولو۔ یقیناً اللہ اسے دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔‘‘

انصارؓ کی ایثار و قربانی کی مدح میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وَ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر: ۹) ’’اور وہ اپنی ذات پر ان (اپنے مہاجر بھائیوں) کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔‘‘

روایت میں حضرت ابوطلحہؓ اور ان کی اہلیہ محترمہ کے ایثار کا قصہ نقل ہوا ہے کہ وہ کس طرح اپنے گھر ایک حاجت مند کو لے گئے۔ گھر میں بچوں کے کھانے کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ بچوں کو بہلا کر سلا دیا جاتا ہے۔ تدبیر سے چراغ بجھا دیا۔ مہمان نے سمجھا کہ کھانے میں وہ بھی شریک ہیں۔ سب کھانا مہمان نے کھایا۔ اور انھیں اس کا احساس بھی نہ ہونے دیا کہ گھر کے سبھی لوگ بھوکے سوئے ہیں۔ صبح کو حضورؐ نے انھیں خوش خبری دی کہ خدا فلاں بندے اور بندی سے بہت خوش ہوا۔ حدیث میں اس کے لیے عَجِبَ اللّٰهُ یا ضَحِكَ اللّٰهُ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ بہ طور مجاز یا استعارہ استعمال فرمائے گئے ہیں۔

راست روی

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: قَارِبُوْا وَ سَدِّدُوْا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میانہ روی اختیار کرو اور راہِ راست اختیار کرو۔“

تشریح: میانہ روی اختیار کرو یعنی عبادت ہو یا کوئی اور کام، افراط وتفریط سے بچو۔ معتدل طرزِ عمل ہی صحیح معنی میں ہماری سیرت یا کردار بن سکتا ہے۔ جو طرزِ عمل اعتدال کی روش سے ہٹ کر ہوگا اس پر ہم دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ اور اگر کسی صورت سے ہم نے اسے نباہنے کی کوشش بھی کی تو ہماری زندگی غیر متوازن ہو کر رہے گی۔ کسی ایک کی طرف ہم جھک جائیں گے۔ زندگی کی کتنی ہی دوسری اہم ذمہ داریوں کی طرف سے ہم غافل ہو کر رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری شخصیت میں وہ خوبی اور جاذبیت جو شریعت میں مطلوب ہے، باقی نہ رہ سکے گی۔

اور اگر ہم افراط کے بہ جائے تفریط سے کام لیتے ہیں، ضروری حد تک بھی فرائض کو پورا نہیں کرتے، عبادت سے ہمارا تعلق بھی برائے نام ہی رہتا ہے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ ہماری زندگی میں وہ خصوصیات پیدا نہ ہو سکیں گی جو عبادات اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم عبادات اور فرائض کے ادا کرنے میں سستی دکھائیں گے تو ایسا نہیں ہے کہ ہماری فکری اور جسمانی توانائیاں محفوظ رہیں گی، وہ لازماً کہیں اور صرف ہوں گی۔ اس لیے ہمارا اوّلین فرض ہے کہ ہم افراط وتفریط دونوں سے بچ کر اعتدال کی روش اختیار کریں۔ اور زندگی میں میانہ روی کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہ کریں۔

اس حدیث میں راست روی پر بھی زور دیا گیا ہے۔ راست روی انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ راہِ راست یا سیدھا راستہ اختیار کرنا ہمارا اخلاقی و دینی فریضہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بغیر صحیح معنی میں ہم زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا بھی نہیں ہو سکتے۔ راست روی کی پالیسی آدمی کو کتنی ہی الجھنوں اور پے چیدگیوں سے نجات دلاتی ہے۔ راست روی کے ذریعہ سے ہی آدمی زندگی کی اصل فطرت سے اپنے کو ہم آہنگ رکھ سکتا ہے۔ زندگی کے اپنی فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا اظہار ہمارے زندہ ہونے کا ثبوت ہے۔ اگر یہ بات پیدا ہو جائے تو خوش نودیِ رب کے حصول کے لیے مختصر سی مختصر حیات بھی کافی ہو سکتی ہے۔

متقیانہ زندگی

(۱) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَخْلَصَ اللّٰہُ قَلْبَہٗ لِلْاِیْمَانِ وَ جَعَلَ قَلْبَہٗ سَلِیْمًا وَّ لِسَانَہٗ صَادِقًا وَّ نَفْسَہٗ مُطْمَئِنَّۃً وَّ خَلِیْقَتَہٗ مُسْتَقِیْمَۃً وَّ اُذُنَہٗ مُسْتَمِعَۃً وَّ عَیْنَہٗ نَاظِرَۃً۔ فَاَمَّا الْاُذُنُ فَقَمِعٌ وَالْعَیْنُ فَمُقِرَّۃٌ لِّمَا یُوْعِی الْقَلْبُ وَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ جُعِلَ قَلْبُہٗ وَاعِیًا۔ (احمد، بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص کام یاب ہوگیا جس کے دل کو خدا نے ایمان کے لیے خاص کرلیا اور اس کے دل کو سالم رکھا، اس کی زبان کو صادق اور اس کے نفس کو مطمئن بنایا، اس کی خلقت وطبیعت کو مستقیم رکھا، اس کے کان سننے والے بنائے اور اس کی آنکھیں دیکھنے والی بنائیں۔ پس کان قیف ہیں اور آنکھ اسے قائم رکھنے والی ہے جس کو دل محفوظ رکھتا ہے۔ اور وہ شخص کام یاب ہوگیا جس کے دل کو محفوظ رکھنے والا بنایا گیا۔''

تشریح: یعنی کسی آدمی کے کام یاب و بامراد ہونے کی پہچان یہ ہے کہ اس کا دل ایمان ویقین کی کیفیت سے معمور ہو۔ دل اس کا ایسا صحیح وسالم ہو کہ اس میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ نفاق اور حسد وغیرہ سے بالکل پاک ہو۔ زبان اسے راست گوملی ہو۔ اس کا نفس مطمئن یعنی اپنے رب کی طاعت ومحبت پر راضی ہو۔ اس کی طبیعت وسرشت میں کوئی کجی نہ پائی جاتی ہو۔ نہ وہ باطل کی طرف مائل ہو اور نہ وہ افراط وتفریط میں پڑتا ہو۔ پھر وہ حق بات کے سننے اور سمجھنے کی پوزیشن میں ہو۔ اسے وہ بینائی حاصل ہو کہ خدا کی صنعتوں میں وہ خدا کی موجودگی اور اس کی وحدانیت کے دلائل کو دیکھ سکتا ہو۔ وہ دنیا میں اندھا بہرا بن کر نہ رہ رہا ہو۔

دل کی حیثیت ظرف کی ہے اور کان کی حیثیت قیف (Funnel) کی ہے۔ جس طرح قیف کے ذریعہ سے کسی شیشی یا بوتل میں ہم رقیق اشیاء کو ڈھال لیتے ہیں ٹھیک اسی طرح سے ازراہِ گوش حق باتیں دلوں میں اترتی ہیں۔ دل جن باتوں کو اپنے اندر لیتا ہے آنکھ ان کو قرار بخشتی ہے۔ مومن کی آنکھ دل کی معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ آنکھ سچائی کی منکر نہیں ہوتی بلکہ وہ خارج کو باطن سے ہم آہنگ رکھنے میں اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ اس طرح سے دل کو حق کے بارے میں وہ وثوق واطمینان حاصل ہوتا ہے جو کبھی متزلزل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ کان کی طرح آنکھ کے ذریعہ سے بھی دل کو حقائق کی اطلاع ہوتی ہے۔

جس کسی شخص کا دل سچائی کا ادراک کر لیتا ہے۔ پھر نہ وہ اسے فراموش کرتا ہے اور نہ کبھی اسے نظر انداز کرتا ہے۔ اس شخص کے کام یاب ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ دل میں اگر حق اتر چکا ہے اور دل نے اسے پورے طور پر محفوظ کر لیا ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ انسان اپنی زندگی میں راہِ راست سے کبھی گریز نہیں کر سکتا۔ اس کی پوری زندگی سچائی اور حق پرستی کی آئینہ دار ہوگی۔ اس طرح سے دل کی درستی انسان کی کام یابی کی اصل ضامن ہے۔ خدا کے رسولؐ نے سچ فرمایا ''اور وہ شخص کام یاب ہو گیا جس کا دل محفوظ رکھنے والا بنا ہے۔'' قرآن میں اسی بات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَo اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍo (الشعراء:۸۸-۸۹) ''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد بجز اس کے کہ کوئی صحیح سالم دل لے کر خدا کے پاس آیا ہو۔''

〈۲〉 وَ عَنْ عَائِشَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَا عَائِشَةُ، اِيَّاکِ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ طَالِبًا۔ (ابن ماجہ، دارمی، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! ان گناہوں سے بچتی رہنا جن کو حقیر و معمولی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ خدا کی طرف سے ان کی بھی باز پرس ہوگی۔''

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچنا ضروری ہے۔ معمولی گناہ بھی اگر کوئی کرتا رہے تو اس سے دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ بلکہ صغیرہ گناہ پر اصرار اسے کبیرہ بنا دیتا ہے۔ کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر انسان کا اس پر دلیر ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ''گناہ کو یہ نہ دیکھو کہ وہ کتنا معمولی اور چھوٹا ہے بلکہ اس خدا کی عظمت اور بڑائی کو پیشِ نظر رکھو جس کی نافرمانی کی جسارت کی جا رہی ہے۔'' خدا کی عظمت کا احساس اگر ہو تو صغیرہ گناہ بھی سنگین محسوس ہوگا۔

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِىْ ذَرٍّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَهٗ: اِنَّکَ لَسْتَ بِخَيْرٍ مِّنْ اَحْمَرَ وَلَا اَسْوَدَ اِلَّا اَنْ تُفَضِّلَهٗ بِتَقْوٰى۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم سرخ رنگ

کی وجہ سے بہتر نہیں ہو اور نہ سیاہ رنگ کے سبب سے بلکہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تقویٰ کا ہونا بھی ضروری ہے۔''

تشریح: یعنی کسی شخص کی فضیلت اس کی شکل وصورت اور رنگ پر موقوف نہیں ہے بلکہ حقیقت میں آدمی کی فضیلت اور اس کی خوبی کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ یعنی اس کا تعلق اس سے ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خدا سے کتنا ڈرتا ہے اور اسے سچائی کا کتنا پاس ولحاظ ہوتا ہے آدمی کے اندر جس درجہ کا تقویٰ ہوگا اسی کے لحاظ سے خدا کے یہاں اس کا مرتبہ ومقام ہوگا۔

تقویٰ کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ آدمی شرک جلی سے دور رہے۔ اگرچہ دیگر امور میں خدا کی طاعت اور اس کی فرماں برداری کا وہ پورا احساس نہ رکھتا ہو۔ تقویٰ کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی خدا کا فرماں دار ہو اور شرک جلی ہی نہیں شرک خفی مثلاً ریا اور نام ونمود کی خواہش سے بھی بچتا ہو۔ لیکن تقویٰ کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ بندہ خدا کے ساتھ دائم الحضور ہو۔ وہ خدا سے کبھی اور کسی حال میں غافل نہ رہے۔ اس کے دل میں عظمت ہو تو خدا کی، خیال ہو تو اس کا، وابستگی ہو تو اصلاً اسی سے، اس کے دل کو چین اور آرام ملتا ہو تو خدا ہی کی یاد سے۔ اور دل اس کا ہر قسم کے اندیشہ ہائے باطل سے آزاد ہو۔

شفقت علی الخلق

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ ؓ اَنَّ اَصْحٰبَ الصُّفَّةِ کَانُوْا اُنَاسًا فُقَرَآءَ، وَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَرَّةً: مَّنْ کَانَ عِنْدَهٗ طَعَامُ اثْنَیْنِ فَلْیَذْهَبْ بِثَالِثٍ وَ مَنْ کَانَ عِنْدَهٗ طَعَامُ اَرْبَعَةٍ فَلْیَذْهَبْ بِخَامِسٍ بِسَادِسٍ اَوْ کَمَا قَالَ: وَ اَنَّ اَبَا بَکْرٍ جَآءَ بِثَلاَ ثَةٍ وَانْطَلَقَ النَّبِیُّ ﷺ بِعَشْرَةٍ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے روایت ہے کہ اصحابِ صفّہ غریب لوگ تھے۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس کے یہاں دوؔ آدمیوں کا کھانا ہو وہ یہاں سے تیسرے کو لے جائے اور جس کسی کے یہاں چار آدمیوں کا کھانا موجود ہو تو وہ پانچویں یا چھٹے کو لے جائے۔ چنانچہ (میرے والد) ابوبکرؓ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لے آئے اور خود نبی ﷺ اپنے ساتھ دس افراد کو لے گئے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اپنے بھائیوں کو بھوک کی حالت میں ہرگز نہ چھوڑو۔ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ اس میں اپنے تیسرے بھائی کو بھی شریک کرلے۔ اسی طرح جس کے گھر چار آدمیوں کے لیے کھانا موجود ہو وہ بھی دو ایک شخص کو اپنے ساتھ لے جا کر اپنے کھانے میں شریک کرلے۔

آپؐ نے بھوکوں کو کھلانے اور ان پر شفقت کرنے کی صرف تلقین ہی نہیں فرمائی بلکہ خود بھی اس پر عمل فرمایا۔ آپؐ اپنے طرزِ عمل سے اس بات کی رہ نمائی فرما گئے کہ دوسروں کی بھوک اور ان کی ضرورت کا ہمیں احساس ہونا چاہیے اور حتی الامکان لوگوں کی حاجت روائی کو اپنا دینی فرض سمجھنا چاہیے۔ خاص طور پر ضرورت مند کی کسی ایسی تکلیف کو تو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو آدمی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے مثلاً بھوک پیاس وغیرہ۔

نصح و خیر خواہی

﴿۱﴾ عَنْ تَمِيمِ الدَّارِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: الدِّيْنُ النَّصِيحَةُ ثَلٰثًا قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰهِ وَ لِكِتَابِهٖ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَ عَامَّتِهِمْ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دین نصح و خیر خواہی کا نام ہے۔“ یہ آپؐ نے تین بار فرمایا۔ ہم نے عرض کیا کہ (یہ خیر خواہی) کس کے لیے؟ فرمایا: ”اللہ کے لیے، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلمانوں کے اماموں اور عام مسلمانوں کے لیے۔“

تشریح: یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس حدیث سے دین کے مزاج اور اس کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دین شخصی اور اجتماعی دونوں ہی قسم کے معاملات و مسائل میں ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔ وہ ایک طرف تو خدا سے ہمارا رشتہ مضبوط کرتا ہے دوسری طرف وہ بندگانِ خدا کے حقوق کے سلسلہ میں ہمیں ہمارے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔

نصح کے اصل معنی ہیں ملاوٹ اور کھوٹ سے پاک صاف ہونا۔ شہد کو موم وغیرہ سے الگ کر کے اسے صاف کر لیتے ہیں تو اسے ”نَصَحْتُ الْعَسَلَ“ کہتے ہیں۔ نصح کا تعلق قول و عمل دونوں سے ہوتا ہے۔ کسی کو صحیح مشورہ دینے اور اس کی خیر خواہی کو بھی نصیحت کہتے ہیں۔ اس لیے کہ مخلصانہ تعلق کا یہ تقاضا ہے کہ آدمی کا جس کسی سے مخلصانہ رشتہ و تعلق ہو، وہ اس کا بدخواہ ہرگز نہ ہو بلکہ اس کا خیر خواہ ہو۔ ضرورت ہو تو اپنے نیک مشوروں سے اسے محروم نہ رکھے۔

یہ نصح اور خیر خواہی اور اخلاص ہر حال میں مطلوب ہے۔ یہ دین میں بھی مطلوب ہے اور انسان کے کردار کی اصل حسن و خوبی اور اس کی قوت اور طاقت بھی یہی ہے۔ بہت سے فرائض اور ذمہ داریاں معذوری کی حالت میں ساقط ہو جاتی ہیں لیکن نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہر حالت میں مطلوب ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے: لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلاَ عَلَی الْمَرْضٰی وَلاَ عَلَی الَّذِیْنَ لاَ یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوا لِلّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ط مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌo (التوبہ:۹۱) ''(جہاد اور انفاق کے سلسلہ میں) نہ تو کم زوروں کے لیے کوئی حرج کی بات ہے اور نہ بیماروں کے لیے اور نہ ان لوگوں کے لیے جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے، جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں۔ محسنین پر الزام اور مواخذہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اللہ تو بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔''

خدا کے لیے نصح کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی قسم کے کھوٹ کو روا نہ رکھے۔ وہ خدا کی محبت اور وفاداری میں بالکل مخلص (Sincere) ہو کر رہے۔

خدا کی کتاب کے لیے نصح و خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی تلاوت کا حق ادا کریں۔ اس کی آیات میں غور و فکر اور تدبّر سے کام لیں۔ اس کے ہر حکم کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیں۔ تمام عالم کو اس کی طرف دعوت دیں۔ ہماری سب سے بڑی آرزو یہ ہو کہ خدا کی کتاب کی رہ نمائی میں انسانوں کے افکار و عملی مسائل کا تصفیہ ہو۔ اس کتاب کے جملہ احکام و قوانین زمین میں جاری اور نافذ ہوں۔ یہ کتاب معطل ہو کر ہرگز نہ رہے۔

خدا کے رسولؐ کی خیر خواہی اور آپؐ سے مخلصانہ تعلق کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ سے محبت کا رشتہ استوار ہو۔ آپؐ کے مشن کو لے اٹھیں۔ جس دین حق کو قائم کرنے کے لیے آپؐ دنیا میں تشریف لے آئے تھے اس دین کی اقامت کے لیے جدّ و جہد کی جائے اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی جائے۔ آپؐ کی سنت اور آپؐ کے طریقہ کے مقابلہ میں کسی دوسری چیز کو ہرگز مقدم نہ رکھا جائے۔ آپؐ کے قول و عمل کے مقابلہ میں کسی کی رائے اور عمل کو ہرگز ترجیح نہ دی جائے۔

مسلمانوں کے ائمہ یا ان کے سربراہوں کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معروف میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ

حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔ ”بہترین جہاد اس شخص کا ہے جس نے کج اقتدار کے مقابلہ میں حق بات کہی۔“ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

اس نصیحت کا مظاہرہ تاریخ میں کتنے ہی بزرگوں نے اپنی زندگی میں فرمایا۔ ابن تیمیہؒ نے مصر کے جباروں کے مقابلہ میں اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جہانگیر کے دربار میں اسی نصیحت کا مظاہرہ فرمایا۔

عام مسلمانوں کی خیرخواہی یہ ہے کہ اگر وہ بھٹکے ہوئے ہوں تو ان کی اصلاح کی فکر کریں ان میں علم دین کی اشاعت کا نظم کریں۔ انھیں ایذا نہ پہنچائیں۔ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کریں۔ خیرخواہی میں انھیں اپنے نفس کے برابر جانیں۔ ان میں جو مظلوم ہوں ان کو بے کسی کی حالت میں نہ چھوڑیں۔ ان کی حمایت کریں۔ خوشی و غم میں ان کے ساتھ رہیں۔ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی میں غفلت سے کام نہ لیں۔ ان کو اپنا بھائی سمجھیں اور انھیں اپنا بھائی سمجھ کر ان سے معاملہ کریں۔ ان کے ساتھ ہمارا سلوک ہم دردی اور دردمندی کا ہو۔ قرآن میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ (الحجرات ۴۹:۱۰) ”مومن تو بھائی بھائی ہی ہیں۔“ والدین کے تعلق سے لوگ بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ دین اور ایمان کا رشتہ تو سارے ہی رشتوں سے گہرا اور مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ وہ آخر لوگوں کو اخوّت کے رشتہ میں کیوں نہیں جوڑ سکتا۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے پیچھے اصل میں نصح و خیرخواہی کا جذبہ ہی کارفرما رہا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں: اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ○ (الاعراف:۶۲) ”میں تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیرخواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے یہی فرمایا: اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ○ (الاعراف:۶۸) ”میں تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور میں تمھارا امانت دار خیرخواہ ہوں۔“

حضرت صالح علیہ السلام نے بھی یہی ارشاد فرمایا: يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّىْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ○ (الاعراف:۷۹) ”اے میری قوم کے لوگو! میں

تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی، لیکن تمھیں تو اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں آتے۔“

حضرت شعیب علیہ السلام کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ جب قوم پر خدا کا عذاب آیا تو انھوں نے یہی فرمایا: یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ۠ (الاعراف: ۹۳) ”اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیغامات تو تمھیں پہنچا دیے اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی۔ اب میں نہ ماننے والے لوگوں پر کیسے افسوس کروں؟۔“

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ ؓ قَالَ: بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلٰی اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ ؓ کہتے ہیں کہ ”میں نے رسولِ خدا ﷺ سے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی پر بیعت کی تھی۔“

تشریح: نصح و خیر خواہی کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم (ﷺ) نے نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ خیر خواہی پر بھی بیعت لی ہے۔ نصح و خیر خواہی کا جذبہ اگر صحیح معنی میں ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو ہر قسم کے رذائل اور بداخلاقیوں کا یکسر خاتمہ ہو جائے۔ یہ جذبہ ان تمام برائیوں سے روک دینے کے لیے کافی ہے جو آج ہمارے معاشرہ میں عام ہیں، نصح و خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ہم نہ کسی بھائی کی غیبت کر سکتے ہیں اور نہ اس سے حسد کر سکتے ہیں اور نہ اس کے عیوب کی تشہیر کے کبھی روادار ہو سکتے ہیں اور نہ ہم اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانا چاہیں گے بلکہ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے بھائی کے کام آسکیں۔ پھر تو ہمارے اپنے لیے خوشی و مسرت کی سب سے بڑی چیز بھائی کی خوشی و مسرت ہوگی۔ روایت میں ہے کہ حضرت جریرؓ نے ایک گھوڑا ۳۰۰ درہم میں خریدا، پھر انھوں نے گھوڑا فروخت کرنے والے شخص سے کہا کہ تمھارا گھوڑا ۳۰۰ درہم سے زیادہ کا ہے، اسے ۴۰۰ درہم میں دو گے؟ اس نے جواب دیا کہ اے عبداللہ! یہ تم جانو۔ انھوں نے کہا کہ تمھارا گھوڑا اس سے قیمتی ہے۔ کیا تم اسے ۵۰۰ درہم میں فروخت کرو گے؟ وہ اسی طرح قیمت بڑھاتے گئے۔ بالآخر انھوں نے اسے ۸۰۰ درہم میں خرید

لیا۔ جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ گھوڑا تو ۳۰۰ درہم میں مل رہا تھا، آپ نے ۸۰۰ درہم کیوں خرچ کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ میں نے رسولِ خدا (ﷺ) سے ہر مسلمان کی خیرخواہی کرنے کی بیعت کی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی خیرخواہی کا کس درجہ خیال رکھتے تھے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ وَ يُدْخَلَ الْجَنَّةَ فَلْتُدْرِكْهُ مَنِيَّتُهٗ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَأْتِيْ اِلَى النَّاسِ الَّذِيْ يُحِبُّ اَنْ يُّؤْتٰى اِلَيْهِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’جوشخص یہ پسند کرتا ہے کہ اسے جہنم سے نہایت دور رکھا جائے اور جنت میں داخل کردیا جائے تو چاہیے کہ اس کو موت اس حال میں آئے کہ خدا اور یومِ آخر پر وہ ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ اسے وہی معاملہ کرنا چاہیے جو وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے ساتھ کریں۔‘‘

تشریح: یعنی جہنم کے عذاب سے محفوظ رہنے اور جنت میں جگہ پانے کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن ہو۔ وہ خدا اور آخرت کا منکر ہرگز نہ ہو۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا اخلاق و کردار بھی مومنانہ ہو۔ اگر اس کا اخلاق و کردار مومنانہ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ایمان اتنا بے جان اور کمزور ہے کہ اس کی زندگی میں اس کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہو رہا ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی میں اس کا ایمان نافع اور قوتِ محرکہ نہ بن سکا۔ پھر ایسے ایمان کے ذریعہ سے اگر ہم بڑی بڑی توقعات اور امیدیں رکھتے ہیں تو اسے بے شعوری و بےخبری کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

زندگی میں کسی کے بااخلاق و باکردار ہونے کی اس سے بہتر کسوٹی شاید دوسری نہ ہو کہ آدمی خود دوسرے لوگوں کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جس طرح وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے ساتھ معاملہ کریں۔ یعنی اپنی ذات کی طرح دوسرے لوگوں کی عزت وآبرو اور ان کی بھلائی اور ان کی کامیابی کو بھی وہ عزیز رکھے۔

بھائی کی حمایت

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ فَقَالَ رَجُلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَکَیْفَ اَنْصُرُهٗ ظَالِمًا؟ قَالَ: تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذٰلِکَ نَصْرُکَ اِیَّاهُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد تو میں کرتا ہوں، لیکن ظالم کی مدد کیوں کر کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم اس کو ظلم سے باز رکھو۔ بس یہی (ظلم سے اس کو روکنا) تیری اس کی مدد کرنی ہے۔''

تشریح: ممکن ہے، وہ ظالم شخص اس کو اپنی مدد نہ سمجھے بلکہ اسے بے جا مداخلت قرار دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس کی سب سے بڑی مدد ہے کہ تم اسے ظلم اور برائی سے بچالو۔

اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی پر ظلم کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس وقت نفس اور شیطان سے مغلوب ہوتا ہے۔ اسے ظلم و ستم سے باز رکھنے کی کوشش شیطان اور نفس کے مقابلہ میں اس کی مدد کو پہنچنا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الْخُطَمِیِّؓ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا اَرَادَ اَنْ یُّوَدِّعَ الْجَیْشَ قَالَ: اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِیْنَکُمْ وَ اَمَانَتَکُمْ وَ خَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ الخطمیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جس وقت لشکر کو رخصت کرنے کا ارادہ کرتے تو فرماتے: ''میں تمھارے دین اور تمھاری امانت اور تمھارے اعمال کے انجام کو خدا کو سونپتا ہوں۔''

تشریح: ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت قزعہؓ نے کہا کہ مجھ سے ابن عمرؓ نے فرمایا: هَلُمَّ اُوَدِّعْکَ کَمَا وَدَّعَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ۔ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِیْنَکَ وَ اَمَانَتَکَ وَ خَوَاتِیْمَ عَمَلِکَ (ابوداؤد) ''آؤ میں تمھیں رخصت کروں جیسے رسول اللہ ﷺ نے مجھے رخصت فرمایا تھا۔ میں تمھارے دین اور تمھاری امانت اور تمھارے انجام کار خدا کو سونپتا ہوں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس کا مثالی ربط و تعلق یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے

کے مدد گار و محافظ ہوں۔ یہ محافظت صرف ایک دوسرے کی جان اور مال اور آبرو تک ہی نہ ہو بلکہ لوگ ایک دوسرے کے دین و اخلاق اور کردار کے بھی محافظ ہوں۔ نبی (ﷺ) چوں کہ خدا کے رسول تھے اس لیے آپؐ کو لوگوں کے دین و اخلاق کی محافظت کی سب سے زیادہ فکر رہتی تھی۔ اس کا اندازہ ان روایتوں سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے جو یہاں نقل کی گئی ہیں۔

''میں تمھارے دین، تمھاری امانت اور تمھارے اعمال کے انجام کو خدا کو سونپتا ہوں۔''

مطلب یہ ہے کہ اب تم مجھ سے دور فاصلے پر جا رہے ہو۔ میرے قریب تھے تو میں تمھارا محافظ تھا لیکن دوری کی وجہ سے اب یہ ممکن نہ ہو سکے گا۔ لیکن خدا تمھارے ساتھ ہے، وہ تمھاری محافظت فرمائے گا۔ وہ تمھیں دین سے برگشتہ ہونے سے بچائے گا اور جس طرح آج تم پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور تم قابل اعتماد ہو، اس اعتماد کو وہی باقی رکھے گا اور اسے مجروح ہونے سے وہی محفوظ رکھے گا اور تمھارے جتنے بھی نیک اعمال ہیں، جو تمھارے اخلاق و کردار کے مظہر ہیں، ان میں سے کسی عمل سے تم نہ پھرو، تم اپنی سیرت پر آخر وقت قائم رہ سکو، وہ اس کی تمھیں توفیق بخشے گا۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ امانت کا اصل مفہوم وہ نہیں ہے جس مفہوم میں یہ لفظ اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس چیز کو امانت کہتے ہیں جس کو بہ غرض حفاظت کسی کے پاس رکھتے ہیں۔ اسے عربی میں ودیعت کہتے ہیں۔ امانت کے اصل معنی ہیں امین اور لائقِ اعتماد ہونا۔ مثلاً لوگوں کو اطمینان ہو کہ فلاں شخص ہمارا حق ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ قرآن میں ہے: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ط (البقرہ: ۲۸۳) ''پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے تو جس پر اعتماد کیا ہے اسے چاہیے کہ اپنے امین ہونے کو متحقق کر دے اور اللہ سے جو اس کا رب ہے، ڈرے۔'' یعنی جس شخص پر اعتبار و اعتماد کیا گیا ہے وہ اس اعتماد و اعتبار کو مجروح نہ ہونے دے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ: مَنِ اغْتِیْبَ عِنْدَهٗ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ وَ هُوَ یَقْدِرُ عَلٰی نَصْرِهٖ فَنَصَرَهٗ نَصَرَهُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ فَاِنْ لَّمْ یَنْصُرْهُ وَ هُوَ یَقْدِرُ عَلٰی نَصْرِهٖ اَدْرَکَهُ اللّٰهُ بِهٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کسی شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اس مسلمان بھائی کی مدد پر قادر ہو اور اس نے اس

کی مدد نہ کی حالانکہ اسے اس کی مدد کی قدرت حاصل تھی تو اللہ اس پر اس کا دنیا و آخرت میں مواخذہ فرمائے گا۔‘‘

تشریح: یعنی کسی بھائی کی غیبت ہو رہی ہو تو خاموش نہیں رہنا چاہیے بلکہ پوری پوری مدافعت کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيْهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّعْتِقَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (البیہقی فی شعب الایمان) ’’جس شخص نے اپنے بھائی کے گوشت کی اس کی غیر موجودگی میں مدافعت کی تو خدا پر لازم ہے کہ اسے جہنم کی آگ سے آزاد کردے۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگوں کو بھائی کی غیبت کرنے سے روکے گا اور انھیں اس نازیبا حرکت سے باز رکھے گا تو خدا اسے جہنم سے آزاد کرے گا۔ گوشت کی مدافعت سے مراد بھائی کے گوشت کو کھانے سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ یہ کنایہ اس کی غیبت کرنے سے ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (الحجرات: ۱۲) ’’کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟‘‘

غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ غیبت کر کے کوئی چوں کہ اپنے بھائی کی آبرو ریزی کرتا اور اسے ایک طرح سے ہلاک کرتا اور اسے بے کردار اور مردار ٹھیراتا ہے۔ اس لیے یہ تشبیہ نہایت بامعنی ہے۔ اس کے علاوہ چوں کہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے جس کی غیبت کی جاتی ہے وہ اپنی مدافعت پر قادر نہیں ہوتا اس لحاظ سے بھی اس کا گوشت کھانا مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے۔ کیوں کہ مردہ شخص بھی کبھی اپنی مدافعت پر قادر نہیں ہوتا۔ اس تشبیہ سے غیبت کا گھناؤنا پن بھی پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) وَ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَا مِنِ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ يَّخْذُلُ امْرَءًا مُّسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُّنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهٗ وَ يُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوْطِنٍ يُّحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهٗ وَمَا مِنِ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ يَّنْصُرُ مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُّنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ وَ يُنْتَهَكُ فِيْهِ مِنْ حُرْمَتِهٖ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوْطِنٍ يُّحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهٗ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو مسلم شخص اس موقع پر مسلم

شخص کی مدد نہ کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور جہاں اس کی آبروریزی کی جاتی ہو تو لازماً اللہ تعالیٰ اس کی اس موقع پر مدد نہ فرمائے گا جہاں اسے اس کی مدد کی چاہت ہوگی۔ اور جو کوئی مسلم شخص اس موقع پر مسلم شخص کی مدد کرے جہاں اس کی آبروریزی کی جاتی ہو اور جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو تو لازماً اللہ تعالیٰ اس کی اس موقع پر مدد فرمائے گا جہاں اس کو اس کی مدد کی چاہت ہوگی۔"

تشریح: اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی آدمی جس اخلاق کا ہوگا، خدا اسی کے لحاظ سے اس کے ساتھ معاملہ فرمائے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی مدد نہیں کرتا حالانکہ معاملہ بھائی کی عزت اور آبرو کا ہے تو حقیقت میں وہ خود کو خدا کی مدد سے محروم کر رہا ہے۔ خدا بھی اس وقت اس کی مدد سے اپنا ہاتھ کھینچ لے گا جب کہ اسے مدد کی اشد ضرورت پیش آرہی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مسلم شخص خدا کی امان میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی جان، اس کے مال اور اس کی آبرو کی محافظت کرنی ہر ایک کی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔ اس ذمہ داری سے بے اعتنائی سنگین قسم کا جرم ہے۔ اس جرم کی سزا سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔

ایفائے عہد

﴿۱﴾ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍؓ اَخْبَرَهُ قَالَ: اَخْبَرَنِي اَبُوْ سُفْيَانَ اَنَّ هِرَقْلَ قَالَ لَهُ: سَاَلْتُكَ مَاذَا يَأْمُرُكُمْ فَزَعَمْتَ اَنَّهُ اَمَرَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالْوَفَآءِ بِالْعَهْدِ وَ اَدَاءِ الْاَمَانَةِ قَالَ وَ هٰذِهٖ صِفَةُ نَبِيٍّ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ انھیں عبداللہ بن عباسؓ نے خبر دی کہ ان کو ابوسفیان نے بتایا کہ ہرقل نے ان سے کہا کہ میں نے تم سے دریافت کیا تھا کہ وہ (نبی اکرم ﷺ) تمھیں کس بات کا حکم دیتا ہے تو تم نے بیان کیا کہ "وہ نماز، سچائی، پاک دامنی، ایفائے عہد اور امانتوں کی ادائے گی کا حکم دیتا ہے۔" اس نے (ہرقل نے) کہا کہ "یہ تو نبی کا وصف ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس وقت پیش آیا تھا جب ابوسفیان ایمان نہیں لائے تھے۔ حضور اکرم (ﷺ) نے ہرقل قیصر روم کو خط لکھا تھا جس میں اس کو دین حق کے قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ ابوسفیان قریش کے ان چند سواروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے

جو شام میں تاجر کی حیثیت سے گئے تھے۔ اس وقت یہ لوگ ایلیا میں تھے۔ ہرقل نے ان لوگوں کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور انھیں دربار میں طلب کیا اور کہا کہ تم میں سے کون اس شخص کا قریب النسب ہے جس نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ میں ان سب سے زیادہ اس کا قریب النسب ہوں۔ ہرقل نے کہا کہ ابوسفیان کو میرے قریب کردو اور ان کے ساتھیوں کو ان کے پیچھے رکھو۔ ہرقل کے اِرد گرد روم کے زعما بیٹھے ہوئے تھے۔ ترجمان طلب کیا گیا۔ ہرقل نے کہا کہ میں ابوسفیان سے اس شخص کے حالات دریافت کروں گا جس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر یہ غلط بیانی سے کام لیں تو تم لوگ فوراً ٹوکنا اور اس کی تکذیب کرنا اس موقعہ پر ہرقل نے ابوسفیان سے حضور اکرم (ﷺ) اور آپؐ کی تحریک کے بارے میں مختلف سوالات کیے ان میں ایک سوال اس کا یہ تھا جو اس حدیث میں نقل ہوا ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) کی تعلیمات کو سن کر ہرقل کی ذہانت اور اس کی بصیرت نے پالیا کہ آپؐ سچے نبی ہیں۔ وہ برملا اس کا اظہار کرتا ہے کہ یہ تعلیمات تو یقیناً نبی کی ہی تعلیمات ہوسکتی ہیں۔ نبی کی تعلیمات ایسی ہی پاکیزہ ہوتی ہیں۔ وہ ایک طرف لوگوں کو خدا کی پرستش کی طرف بلاتا ہے اور دوسری طرف وہ لوگوں کی زندگیوں کو پاکیزہ اور صاف ستھری دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے تعلقات درست ہوں۔ وہ امین وصادق اور ایفائے عہد کے پابند ہوں۔ جھوٹ اور عہد شکنی سے ان کی زندگی یکسر پاک ہو۔

〈۲〉 عَنْ اَبِی جُرَیِّ الْھُجَمِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَیْئًا وَلَا تُوَاعِدْ اَخَاکَ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَہٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوجریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''نیکی کوئی بھی ہو اسے حقیر نہ سمجھو اور اپنے بھائی سے ایسا وعدہ نہ کرو کہ اسے پورا نہ کرسکو۔''

تشریح: ہر نیکی اہلِ نظر کے نزدیک قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہے۔ اپنے نتیجہ و اثر کے اعتبار سے چھوٹی نیکی بھی چھوٹی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ بڑی نیکیوں کی طرح چھوٹی نیکی کا رشتہ بھی زندگی کی عظیم قدروں سے ہوتا ہے۔ کسی نیک عمل کی اہانت حقیقت میں اقدارِ حیات کی اہانت ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک نیک عمل کو جس کو ہم معمولی قرار دیتے ہیں، وہ آدمی کے مومن ہی نہیں، اس کے عظیم ہونے کا بھی ثبوت ہوسکتا ہے جس طرح سے کہ ایک برائی جس کو لوگ ہلکی سمجھ

کر نظر انداز کر جاتے ہیں، کبھی آدمی کے بے کردار، رذیل اور ذلیل ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔

پھر تم کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہونا چاہیے۔ کسی سے وعدہ کرو تو یہ سوچ کر کرو کہ اسے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔ اپنے وعدہ کو معمولی بات نہ سمجھو۔ یہ وعدہ تمھارے اپنے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے تمھاری پہچان ثابت ہوتا ہے۔ وعدہ شکنی کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا کہ تم نے ایک وعدہ کیا جو وفا نہ ہوا بلکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم زندگی کے مفہوم سے بالکل نا آشنا ہو۔ انسانیت، شرافت اور مروّت کے مقامِ مطلوب سے دور ہونے کے باوجود تمھیں اس کی مطلق خبر نہیں کہ تم نے اپنے اس طرزِ عمل سے کیا کھویا اور کیا پایا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَلِيٍّ وَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْعِدَةُ دَيْنٌ۔

(الطبرانی فی الاوسط)

ترجمہ: حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”وعدہ بھی ایک قرض ہے۔“

تشریح: یعنی تم جس طرح سے قرض کی ادا کرنے کو ضروری سمجھتے ہو، ایفائے عہد کو بھی ضروری سمجھو۔ قرض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرض دینے والے سے اسے ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں ہو کر بھی اگر کوئی قرض کے روپے نہیں لوٹاتا تو دنیا اسے ذلیل اور بے ایمان سمجھتی ہے۔ پھر آخر وہ کون سی منطق ہے جس کی رو سے عہد شکنی کے بعد اس کی عزت اور اس کے ایمان کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

﴿۴﴾ وَ عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهٗ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”اپنے بھائی سے مناظرہ نہ کرو اور نہ اس سے مذاق کرو اور نہ اس سے وعدہ کر کے پھر وعدہ خلافی کرو۔“

تشریح: اس حدیث میں مناظرہ سے مراد ایسی بحث یا مناظرہ ہے جس میں آدمی پہلے ہی سے یہ طے کر لیتا ہے کہ ہمیں اپنی بات پر اڑا رہنا ہے۔ دوسرے کی بات خواہ کتنا ہی حق کیوں نہ ہو، اسے بہر صورت قبول نہیں کرنی ہے۔

مذاق سے مراد وہ مذاق ہے جو شریفانہ خوش طبعی کے طور پر نہ ہو بلکہ جس سے مقصود دوسرے کی محض دل آزاری ہو۔

〈۵〉 وَ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَ مِنْ نِيَّتِهٖ اَنْ يَّفِيَ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيْعَادِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت زید بن ارقمؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”جس وقت آدمی اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ اسے پورا کرے گا۔ اور کسی وجہ سے وہ اسے پورا نہ کر سکے اور وعدہ پر نہ آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔“

تشریح: یعنی اگر کسی معقول وجہ کی بناء پر کوئی شخص اپنے وعدہ پر نہ آ سکا تو وہ عنداللہ گنہ گار نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کی نیت ہی اپنے وعدہ کو پورا کرنے کی نہ رہی ہو یا اسے وعدہ کی اہمیت اور دوسرے کی پریشانیوں کا کوئی احساس ہی نہ ہوا اور محض تساہل کی وجہ سے وہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے سے قاصر رہا تو اس کے گناہ کے مرتکب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

حسنِ معاملہ

〈۱〉 عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَ اِذَا شْتَرٰى وَ اِذَا قْتَضٰى۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو نرمی اور فیاضی سے کام لیتا ہے جب کہ وہ بیچتا ہے اور جب خریدتا ہے اور جب تقاضا کرتا ہے۔“

تشریح: نرمی اور فیاضی سے کام لینے والے کے لیے نبی (ﷺ) کے دل سے دعا نکلی ہے۔ اس سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی میں فیاضانہ طرزِ عمل آپؐ کو کس قدر پسند تھا۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو

فرماتے سنا: ''جس کسی نے تنگ دست کو مہلت دی یا اپنا حق، جو اس پر تھا، معاف کر دیا تو اللہ قیامت کے روز کی سختیوں سے اس کو نجات عطا فرمائے گا۔''

تشریح: یعنی خدا کو اس کا یہ عمل اتنا پسند ہے کہ اس کے صلہ میں وہ اسے قیامت کی سختیوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھے گا۔ اس نے دنیا میں اپنے صاحبِ معاملہ کے ساتھ نرمی سے کام لیا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا اس کے لیے سختی کو پسند نہیں فرمائے گا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِی الْیَسَرِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوالیسرؓ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے سنا: ''جو شخص (اپنا حق وصول کرنے میں) تنگ دست کو مہلت دے یا اپنا حق معاف کر دے تو اللہ اسے (قیامت کے روز) اپنے سایہ میں جگہ عنایت فرمائے گا۔''

تشریح: یعنی قیامت کے روز اسے سکون و عافیت میسر ہوگی۔

احمد، ابن ماجہ اور حاکم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے دن کی کوئی کسی مفلس کو مہلت دیتا ہے اسے اتنے دن تک ہر روز قرض دیتے رہنے کا ثواب ملے گا۔ اور ادا کرنے کی مقرر مدت ختم ہو جانے پر اگر وہ پھر مہلت دے دیتا ہے تو اسے دیے ہوئے قرض کا دونا قرض ہر روز دیتے رہنے کا اجر و ثواب ملے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رحمتِ حق بہانہ می جوید۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ رَافِعٍؓ قَالَ: اَسْتَسْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَكْرًا فَجَآءَ تْهُ اِبِلٌ مِّنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُوْ رَافِعٍ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقْضِیَ الرَّجُلَ بَكْرَهٗ فَقُلْتُ لَا اَجِدُ اِلَّا جَمَلاً خِیَارًا رُبَاعِیًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَعْطِهٖ اِیَّاهُ فَاِنَّ خَیْرَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَآءً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابورافعؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ایک جوان اونٹ قرض لیا۔ پھر صدقہ کے اونٹ آئے تو ابورافعؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں ایک جوان اونٹ اس قرض خواہ شخص کو دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو (اس کے اونٹ سے) بہتر ہی اونٹ پا رہا

ہوں کہ ساتویں برس میں داخل ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”وہی اس کو دے دو۔ کیوں کہ لوگوں میں بہتر شخص وہ ہے جو قرض کے ادا کرنے میں ان میں سب سے بہتر ہو۔“

تشریح: حضرت ابورافعؓ نے کہا کہ میں اس اونٹ کو کیسے دے دوں۔ یہ اونٹ تو اس سے بہتر ہے جو اس نے بہ طور قرض دیا تھا۔ جو اونٹ اس نے قرض میں دیا، اس طرح کا اونٹ موجود نہیں ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کی مطلق پروا نہ کرو کہ قرض خواہ کے دیے اونٹ سے بہتر اونٹ تم اسے دے رہے ہو۔ مالی منفعت سے کہیں زیادہ نفع کی بات یہ ہے کہ تم خدا کی نگاہ میں بہترین شخص قرار پاؤ۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کا قرض لینا جائز ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اس کے خلاف ہیں۔ وہ اسے جائز قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

باہمی میل جول

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ وَّلَا خَیْرَ فِیْمَنْ لَّا یَاْلِفُ وَلَا یُؤْلَفُ. (احمد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”مومن سراپا الفت و محبت ہوتا ہے۔ اور اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو نہ کسی سے محبت رکھتا ہے اور نہ کسی کو اس سے الفت و محبت ہوتی ہے۔“

تشریح: جس معاشرہ میں لوگوں کے مابین محبت والفت اور یگانگت کی سطح پر وابستگی پیدا نہ ہو وہ کبھی مثالی معاشرہ نہیں بن سکتا۔ اسی لیے اسلام نے باہمی میل جول اور محبت اور یگانگت پر بہت زور دیا ہے۔ لوگوں کے دل باہم ملے ہوئے ہوں۔ قرآن اس چیز کو لوگوں کے لیے بڑی نعمت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے: وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳) ”اور اللہ کی اس نوازش کو یاد کرو جو تم پر ہوئی، جب تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمھارے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے اور تم اس کی عنایت سے بھائی بھائی بن گئے۔“

اس شخص کا وجود خود اپنے لیے بھی اور اس زمین کے لیے بھی ایک بوجھ ہے جو انس و محبت کے گراں مایہ سرمایہ کی قدر و قیمت اور اس کی لذتوں سے نا آشنا ہے۔ جو شخص لوگوں سے الفت نہیں رکھتا اور نہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی دل چسپی اور انس ہوتا ہے، اس سے کسی بھلائی اور خیر کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ ایسا شخص بے فیض اور لوگوں کی نگاہوں میں نہایت بد بخت اور منحوس محض ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ یَحْیَ بْنِ وَثَّابٍ عَنْ شَیْخٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلَّذِیْ یُخَالِطُ النَّاسَ وَ یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ خَیْرٌ مِّنَ الَّذِیْ لَا یُخَالِطُھُمْ وَ لَا یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاھُمْ۔ (ترمذی)

ترجمہ: یحییٰ بن وثّاب نبی ﷺ کے ایک بڑے صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان کی اذیت پہنچانے والی باتوں پر صبر کرتا ہے وہ اس شخص سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہ تو ملتا جلتا ہے اور نہ ان کی اذیت پہنچانے والی باتوں پر صبر سے کام لیتا ہے۔“

تشریح: لوگوں سے ربط و تعلق قائم کرنے میں اور اسے باقی رکھنے میں یقیناً دشواریاں بھی پیش آتی ہیں اور لوگوں کی طرف سے تکلیف دہ باتیں بھی پیش آتی ہیں۔ اس لیے کہ معاشرے میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی ان تمام دقتوں اور قباحتوں کے باوجود لوگوں سے کٹ کر نہیں رہتا اور ان سے ربط و تعلق رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں جو اذیتیں اور تکلیفیں بھی اس کو پہنچتی ہیں وہ انھیں برداشت کرتا ہے تو ایسا شخص خدا کی نگاہ میں اس سے بہتر ہے جو نہ لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور نہ لوگوں کی تکلیف دِہ باتوں پر صبر سے کام لیتا ہے۔ صرف اپنی عافیت کی فکر ایک طرح کی خود غرضی ہے۔ جسے کسی حالت میں بھی پسندیدہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

باہم صلح کرانا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلِ مِنْ دَرَجَۃِ الصِّیَامِ وَالصَّدَقَۃِ وَالصَّلٰوۃِ؟ قُلْنَا: بَلٰی۔ قَالَ: اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ۔ وَ فَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ ھِیَ الْحَالِقَۃُ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ روزہ، صدقہ اور نماز سے بھی درجہ میں افضل چیز کیا ہے؟'' ہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں، آپؐ ضرور بتائیں، آپؐ نے فرمایا: ''وہ ہے درمیان یک دگر صلح کرانا۔ اور درمیان یک دگر فساد ڈالنا وہ فعل ہے جو (تمام نیکیوں کو) مونڈ دینے والا ہے۔''

تشریح: زندگی کے عملی میدان میں آدمی معیارِ مطلوب پر پورا اتر سکے تو یہ اس بات کی پہچان ہوگی کہ دینِ حق اس کا کردار بن چکا ہے۔ عملی زندگی میں جب تک وہ اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت نہیں دیتا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دین اس کا کردار بن چکا ہے۔ ممکن ہے ایک شخص بہ ظاہر روزہ و نماز وغیرہ عبادتوں کی پابندی کرتا ہو لیکن کردار وسیرت کے لحاظ سے وہ بھروسہ کے قابل نہ ہو۔ اسی لیے حضرت عمرؓ آدمی کے اچھے ہونے کے لیے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اخلاق و کردار اور معاملات میں بھی اچھا ثابت ہو۔ صرف کسی کی نماز کو دیکھ کر اس کے اچھے ہونے کا فیصلہ کرنے کو وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

اگر ایک شخص لوگوں کے درمیان اصلاح کے لیے کوشاں ہو تو اس کا یہ عمل اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ شخص اخلاق و کردار کا حامل ہے۔ اس اعتبار سے روزہ و نماز اور صدقہ وغیرہ عبادات کے مقابلہ میں اس کے اس عمل کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

علاوہ ازیں نماز و روزہ اور صدقہ کے اصل فائدوں اور اس کی برکتوں کا تعلق خاص طور سے آدمی کی اپنی ذات سے ہوتا ہے جب کہ اصلاح اور فتنہ وفساد کی روک تھام کے خوش گوار نتائج سے پورا سماج فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ اصلاح کے کام سے طاعات و عبادات کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ سے ساری بدبختیاں دور ہو جاتی ہیں۔

دین میں اصلاحِ ذات البین کی اہمیت اس قدر ہے کہ اس سلسلہ میں دروغ مصلحت آمیز سے کام لینے میں بھی چنداں حرج نہیں سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: لَا یَحِلُّ الْکَذِبُ اِلَّا فِیْ ثَلَاثٍ: کَذِبُ الرَّجُلِ اِمْرَأَتَهٗ لِیُرْضِیَهَا وَالْکَذِبُ فِی الْحَرْبِ، وَالْکَذِبُ لِیُصْلِحَ بَیْنَ النَّاسِ۔ (احمد، ترمذی عن اسماء بنت یزید) ''جھوٹ صرف تین مواقع پر جائز ہے: مرد کا اپنی بیوی کو راضی کرنے کی غرض سے جھوٹ بولنا، جنگ میں جھوٹ بولنا اور لوگوں کے درمیان صلح

کرانے کی غرض سے جھوٹ بولنا۔'' ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: لَیْسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ وَ یَقُوْلُ خَیْرًا وَ یُنْجِیْ خَیْرًا۔ (بخاری، مسلم) وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان اصلاح کرے، بھلی بات کہے اور نیک بات پہنچائے۔'' یعنی ایسی بات کہے کہ جو بناؤ اور صلح میں معاون ثابت ہو، اور ایک کی طرف سے دوسرے سے وہ بات کہے جس سے اس کی ناراضی دور ہوسکے اور وہ باہم ایک دوسرے سے قریب ہوسکیں۔

مسلم میں ہے کہ ام کلثومؓ نے کہا: وَلَمْ اَسْمَعْهُ یُرَخِّصُ فِیْ شَیْءٍ مِّمَّا یَقُوْلُ النَّاسُ کَذِبٌ اِلَّا فِیْ ثَلٰثٍ اَلْحَرْبُ وَالْاِصْلَاحُ بَیْنَ النَّاسِ وَ حَدِیْثُ الرَّجُلِ مَرْأَتَهٗ وَ حَدِیْثُ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا۔ ''میں نے آپؐ کو نہیں سنا کہ ان امور میں سے کسی میں رخصت دی ہو جن کو لوگ جھوٹ قرار دیتے ہیں مگر تین باتوں میں: جنگ میں، لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں اور مرد کے اپنی بیوی سے بات کرنے میں اور عورت کے اپنے شوہر سے بات کرنے میں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ رخصت صرف مرد ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت بھی اس سے فائدہ اٹھاسکتی ہے۔

خدمتِ خلق

﴿۱﴾ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَیِّدُ الْقَوْمِ فِی السَّفَرِ خَادِمُهُمْ۔ فَمَنْ سَبَقَهُمْ بِخِدْمَةٍ لَمْ یَسْبِقُوْهُ بِعَمَلٍ اِلَّا الشَّهَادَةَ۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''قوم کا سردار سفر میں لوگوں کا خادم ہوتا ہے۔ پس جو شخص خدمت کر کے ان پر سبقت لے جائے اس سے کوئی شخص کسی بھی عمل کے ذریعہ سے بازی نہیں لے جاسکتا الا یہ کہ شہادت کا رتبہ اسے حاصل ہو۔''

تشریح: یعنی سردار اصل میں لوگوں سے خدمت لینے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کو بڑائی اور بزرگی لوگوں کی خدمت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ سردار یا سربراہِ قوم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورتوں کو سمجھے اور ان کے لیے آسانیاں بہم پہنچانے کی کوشش کرے۔ قوم میں جو لوگ بے سہارا اور مجبور اور کمزور ہوں ان کی مدد اور دست گیری کرے۔ سفر میں چوں کہ زیادہ پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے سفر کا ذکر فرمایا گیا۔ سفر میں سردار کی ذمّہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

بعض اہلِ علم نے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ حقیقت میں سیّد قوم وہ ہے جو قوم کی خدمت کرتا ہو خواہ بہ ظاہر معزّز لوگوں میں اس کا شمار نہ ہوتا ہو جیسا کہ فَمَنْ سَبَقَهُمْ بِخِدْمَة ''پس جو خدمت کی بنا پر لوگوں پر سبقت لے جائے۔'' سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی عمل خدمت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔

حاجت روائی، مدد اور کارسازی صفتِ خداوندی ہے۔ اس لیے خدمتِ خلق کو خوئے ربّانی سے ایک طرح کی مشابہت حاصل ہے اس لیے اس کی فضیلت ایک واضح حقیقت ہے۔ البتہ شہید چوں کہ راہِ خدا میں حق و انصاف کے لیے اپنی جان ہی نہیں کھپاتا بلکہ اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کے مقامِ بلند سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

صلۂ رحمی

⟨۱⟩ **عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَرْسَلَنِیْ بِصِلَةِ الْاَرْحَامِ وَ كَسْرِ الْاَوْثَانِ اَنْ نُوَحِّدَ اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِکَ بِهٖ شَيْئًا لَهٗ حِيْنَ سَئَلَهٗ بِاَیِّ شَیْءٍ اَرْسَلَکَ يَعْنِی اللّٰهِ۔** (مسلم)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اللہ نے رشتوں کو جوڑنے اور بتوں کو توڑنے کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اللہ کو اکیلا خدا مانیں اور کسی بھی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں۔'' یہ بات آپؐ نے اس وقت فرمائی جب کہ راوی نے آپؐ سے دریافت کیا تھا کہ خدا نے آپؐ کو کس چیز کے لیے بھیجا ہے۔

تشریح: عمرو بن عبسہؓ اسلام کے نہایت ابتدائی دور میں مکہ آئے تھے اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا تھا کہ آپؐ کون ہیں؟ اس موقعہ پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں پیغمبر ہوں۔ انھوں نے دریافت کیا کہ پیغمبر کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے عمرو بن عبسہؓ نے عرض کیا کہ کس لیے بھیجا ہے؟ اس سوال کے جواب میں رسولِ خدا ﷺ نے وہ بات فرمائی جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

اس کے بعد عمرو بن عبسہؓ نے دریافت کیا کہ کن لوگوں نے آپؐ کا ساتھ دیا ہے؟ فرمایا کہ ایک آزاد اور ایک غلام نے۔ یہ اشارہ ابوبکرؓ اور بلالؓ کی طرف تھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ میں

بھی آپؐ کا ساتھ دیتا ہوں۔ آپؐ نے کہا کہ اس وقت اپنے گھر کو لوٹ جاؤ، جب میری فتح کی اطلاع ملے تو آجانا۔

اس حدیث میں توحید کے ساتھ صلۂ رحمی کو آپؐ نے اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ اس سے صلہ رحمی کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا ہر شخص بہ خوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ جو شخص ناطے رشتے کا پاس ولحاظ نہ رکھتا ہو اور اعزہ و اقرباء کے حقوق کو نہ پہچانتا ہو وہ دوسرے بندگانِ خدا کے ساتھ کیوں کر انصاف کرے گا اور وہ دوسروں کا ہم درد و غم گسار کیوں کر ثابت ہوگا۔ جو شخص اپنے قریب کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے لیے بے گانہ بن جاتا ہو حقیقت کی نظر میں وہ مر چکا ہوتا ہے۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے وہ کچھ کر سکے گا اس سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

جان کا احترام

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَنْ يَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِيْ فُسْحَةٍ مِّنْ دِيْنِهٖ مَالَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مومن اپنے دین کی وسعت اور کشادگی میں اس وقت تک برابر رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا۔“

تشریح: یعنی جب تک مومن قتل ناحق کا مرتکب نہیں ہوتا دین میں اس کے لیے برابر وسعت ہی وسعت ہوتی ہے۔ اس سے ایک بڑی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ دین اہل ایمان کے لیے تنگی پیدا نہیں کرتا بلکہ مومن کا دین تو اس کے لیے سراسر وسعت و فراخی اور امید و بشارت ہوتا ہے تنگی اور خدا کی رحمتوں سے دوری کا سبب تو آدمی کے اپنے کرتوت ہوتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کی کتنی ہی حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی جان خدا کے نزدیک نہایت محترم ہے۔ قتل ناحق ایک نہایت سنگین جرم ہے اسے کوئی معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے: اَوَّلُ مَا يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِى الدِّمَآءِ (بخاری، مسلم عن عبداللہ بن مسعودؓ) ”قیامت کے دن سب سے پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہیں۔“ خدا کے حقوق میں سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا اور بندوں کے

حقوق کے سلسلہ میں سب سے پہلے قتل کے مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ کسی کا ناحق خون بہانے والا حقیقت میں انسانی جان کی حرمت ہی کو تسلیم نہیں کرتا حالانکہ لوگوں کے حقوق میں سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ ہے کہ آدمی کی جان کا احترام کیا جائے پھر اس کے بعد اس کے دوسرے حقوق قائم ہوتے ہیں جن کی پامالی کے سلسلے میں فیصلے خونِ ناحق کے بعد کیے جائیں گے۔

درد و محبت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہیں بنتے اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ باہم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمھیں وہ عمل نہ بتاؤں جس کو تم کرو تو تم باہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے۔ وہ یہ کہ آپس میں سلام کو رواج دو۔“

تشریح: جنت نفرت اور بغض و عناد کی جگہ ہرگز نہیں ہے۔ اس میں تو وہ لوگ داخل ہوں گے جن کے دلوں کی پرورش بغض و نفرت نے نہیں، محبت نے کی ہوگی۔ جن کے باہمی تعلقات محبت اور الفت کی بنیاد پر استوار ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت نہیں، محبت کرنے والے ہوں گے اور اسے وہ اپنے ایمان کا عین تقاضا سمجھتے ہوں گے۔

اس حدیث میں حضور (ﷺ) نے ایک آسان اور عملی تدبیر کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ اگر مومن اپنے معاشرہ میں ایک دوسرے سے بےگانہ بن کر نہ رہیں بلکہ جب وہ آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کو سلام کریں اور ان کا یہ سلام محض رسمی بن کر نہ رہے بلکہ اس کے پیچھے صحیح جذبہ اور صحیح فکر و شعور کارفرما ہو۔ وہ سلام کر کے دل سے اس بات کا اظہار کر رہے ہوں کہ وہ دنیا و آخرت میں ایک دوسرے کی سلامتی اور بھلائی اور کامیابی کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سلام کے اسلامی طریقہ کو اگر سماج میں رواج دیا جائے تو لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام و محبت کا جذبہ ابھر سکتا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سلام ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کو اختیار کرنے سے

لوگوں میں محبت پیدا ہوسکتی ہے بلکہ تدابیر اور بھی ہیں۔ اس حدیث میں ایک خاص تدبیر کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسلام نے معاشرت کے جن آداب کی تعلیم دی ہے وہ سبھی ایسے ہیں جو نفرت کے بہ جائے باہمی محبت اور الفت ہی کو تقویت پہنچانے والے ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَاُنَاسًا مَّا هُمْ بِاَنْبِيَآءِ وَلاَ شُهَدَآءَ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالشُّهَدَآءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ. قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنَا مَنْ هُمْ؟ قَالَ: هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ عَلٰى غَيْرِ اَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَ اَمْوَالٍ يَّتَعَاطَوْنَهَا فَوَ اللّٰهِ اِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ وَّ اِنَّهُمْ لَعَلٰى نُوْرٍ لاَ يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلاَ يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَ قَرَءَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے بندوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو اگرچہ نہ نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت کے روز خدا کے ہاں ان کے مقام کو دیکھ کر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے محض روحِ خداوندی کی وجہ سے باہم ایک دوسرے سے محبت کی حالانکہ نہ تو ان کے درمیان رشتۂ قرابت ہوتا ہے اور نہ مالی لین دین کا کوئی معاملہ۔ پس بہ خدا، ان کے چہرے نور (یا سراپا نور) ہوں گے اور وہ نور پر متمکّن ہوں گے۔ نہ تو وہ ڈر رہے ہوں گے جب کہ عام لوگوں پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے جب کہ عام لوگ مبتلائے غم ہوں گے۔'' اس موقعہ پر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲) ''سن لو، اللہ کے دوستوں کو نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

تشریح: اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اس محبت اور الفت کی کتنی زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت ہے جس کے پیچھے نفسانی اور دنیوی غرض کام نہ کر رہی ہو بلکہ وہ محبت خالصۃً للہ ہو۔ حدیث کے متن میں لفظ بِرُوْحِ اللّٰهِ استعمال ہوا ہے اسے بِرُوْحِ اللّٰهِ بھی پڑھا گیا ہے دونوں کا ماحصل ایک ہی ہے۔ جو چیز بہ منزلۂ روح کے ہے یعنی اصل حیات ہے وہ خدا کی خاص رحمت اور

لطف ونعمت ہی ہے۔ یہ ہر صورت حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ ان کی محبت کے پیچھے کوئی مادی غرض وغایت نہیں بلکہ یہ محض تعلق باللہ کا نشاط اور اس کی حلاوت ولطافت ہے جس کا اظہار باہمی محبت ویگانگت کی شکل میں ہوتا ہے جس طرح سے خدا کی رحمت وعنایت قرآن اور ہدایت کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی ہدایتِ ربانی اور لطفِ خداوندی ہی ہے جس کی وجہ سے اہلِ ایمان باہم محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

اس حدیث میں یہ جو کہا گیا ہے کہ خالصۃً للہ باہم محبت کرنے والوں پر انبیاء اور شہداء رشک کریں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مرتبے اور درجے کے لحاظ سے انبیاء اور شہداء سے افضل ہوں گے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کم درجے کے کسی آدمی کی کوئی حالت بلند مرتبہ کے لوگوں کو بھی دل کش معلوم ہوتی ہے اسی کو اس حدیث میں رشک سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ گویا رشک سے مراد یہاں تحسین وقدردانی (Appreciation) ہے۔

(۳) وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اَتَدْرُوْنَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی؟ قَالَ قَآئِلٌ، اَلصَّلٰوۃُ وَالزَّکٰوۃُ۔ وَ قَالَ قَآئِلٌ: اَلْجِھَادُ۔ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ۔ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔ (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل بہت محبوب ہے؟" کسی نے کہا کہ نماز وزکوٰۃ۔ اور کسی نے کہا کہ جہاد۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت محبوب اور پسندیدہ عمل ہے اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے بغض۔"

تشریح: یعنی دین میں اصل اور بنیادی چیز اللہ کے نزدیک وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو اور اگر کسی سے بغض یا دشمنی ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے لیے ہو۔ آدمی کی پسند اور ناپسند کا اصل معیار یہی ہونا چاہیے۔ اسی پر ساری عبادات اور اعمال نیک کا مدار ہے۔ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ (اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت) درحقیقت یہی دین کی اصل روح اور اسپرٹ ہے۔ اس لیے اسے دوسرے سارے ہی اعمال نیک کے مقابلہ میں امتیاز اور اختصاص حاصل ہے۔

اسی لیے امام ابن تیمیہؒ نے اپنے ایک فتویٰ میں محبتِ الٰہی کو 'اصل الدین' یعنی دین کی

اصل اور بنیاد قرار دیتے ہیں۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر میں لکھا ہے:

"جس طرح ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہوجاتا ہے اسی طرح ایمان اور تعلیم قرآن کی انتہا محبتِ الٰہی ہے۔ تمام نبیوں کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا۔ اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے۔ قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے۔ مگر توریت اور انجیل میں بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے؟ تو فرمایا: خدا کی محبت تمام دل، تمام روح، تمام عقل سے کرنا، یہی سب سے اوّل اور اعظم حکم ہے۔"

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلاَلِیْ اَلْیَوْمَ اُظِلُّهُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لاَ ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ "قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو میری عظمت وجلال کے سبب سے باہم محبت رکھتے تھے؟ آج میں ان کو اپنے سایہ میں جگہ دوں گا جب کہ آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے۔"

تشریح: خدا کی محبوبیت کا تقاضا ہے کہ بندہ اس سے محبت رکھے اور یہ محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ خدا کے مومن بندوں سے رشتۂ محبت استوار کیا جائے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہمارا یہ طرزِ عمل خدا کی عظمت وجلال کے لیے چیلنج کے مترادف ہوگا۔ اور یہ ایک ایسا قصور ہوگا جو ہمیں خدا کے سایۂ رحمت سے محروم کردے گا۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَآ اَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِلّٰهِ اِلَّآ اَکْرَمَ رَبَّهٗ عَزَّ وَجَلَّ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "جس کسی بندہ نے خدا کے لیے کسی بندہ سے محبت کی اس نے دراصل اپنے رب عزوجل کی تعظیم وتکریم کی۔"

تشریح: کسی سے جو تعلق خاطر خدا کے لیے ہو، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد اہلِ نظر کے لیے کافی ہے کہ اللہ کے لیے کسی سے محبت و الفت ربِ کائنات کی تکریم و تعظیم کے ہم معنی ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَجَبَتْ مَحَبَّتِىْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ، وَالْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ، وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ۔

(مالک)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں سے محبت کرنی میرے لیے لازم ہے جو میرے لیے باہم محبت کرتے ہیں، میری خاطر باہم بیٹھتے ہیں، میرے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے ہیں۔“

تشریح: اس کے پیچھے بھی محبت ہی کام کرتی ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے، ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے اور ایک دوسرے پر اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے لیکن ان کا یہ سب کچھ اپنے خدا کے لیے ہوتا ہے، وہ اس کی خوش نودی کے طالب اور اس کی رضا کے جویا ہوتے ہیں۔ اسی کے لیے وہ جیتے ہیں اور اسی کے لیے وہ مرنا بھی چاہتے ہیں۔ خدا کی یافت ان کے لیے زندگی کا اصل سرمایہ اور اس کے قرب کی طلب ان کی زندگی کا ماحصل ہوتا ہے۔ ان کی بلندی اور ان کے مقام کا اندازہ مادّہ پرست نگاہیں ہرگز نہیں کرسکتیں۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ بَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: صَالَحَ النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ عَلٰى ثَلٰثَةِ اَشْيَآءَ عَلٰى اَنَّ مَنْ اَتَاهُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ رَدَّهٗ اِلَيْهِمْ وَ مَنْ اَتَاهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ لَمْ يَرُدُّوْهُ وَ عَلٰى اَنْ يَّدْخُلَهَا مِنْ قَابِلٍ وَ يُقِيْمَ بِهَا ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ فَلَمَّا دَخَلَهَا وَ مَضَى الْاَجَلُ خَرَجَ فَتَبِعَتْهُ ابْنَةُ حَمْزَةَ تُنَادِىْ يَا عَمِّ يَا عَمِّ فَتَنَاوَلَهَا عَلِىٌّ فَاَخَذَ بِيَدِهَا فَاخْتَصَمَ فِيْهَا عَلِىٌّ رضی اللہ عنہ وَ زَيْدٌ وَ جَعْفَرٌ رضی اللہ عنہ فَقَالَ عَلِىٌّ رضی اللہ عنہ: اَنَا اَخَذْتُهَا وَ هِىَ بِنْتُ عَمِّىْ وَ قَالَ جَعْفَرٌ بِنْتُ عَمِّىْ وَ خَالَتُهَا تَحْتِىْ وَ قَالَ زَيْدٌ: بِنْتُ اَخِىْ۔ فَقَضٰى بِهَا النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم لِخَالَتِهَا وَ قَالَ: اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ۔ وَ قَالَ لِعَلِىٍّ اَنْتَ مِنِّىْ وَ

اَنَا مِنکَ وَ قَالَ لِجَعفَرٍ: اَشبَھتَ خَلقِی وَ خُلقِی وَ قَالَ لِزَیدٍ اَنتَ اَخُونَا وَ مَولَانَا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حدیبیہ کے دن تین باتوں پر صلح کی تھی۔ ایک یہ کہ مشرکین میں سے جو شخص آپؐ کے پاس آئے آپؐ اسے واپس کردیں گے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں سے جو شخص مشرکوں کے پاس چلا جائے وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔ تیسرے یہ کہ آئندہ سال آپؐ مکہ میں داخل ہوں (عمرہ کے لیے) اور صرف تین روز وہاں قیام کریں۔ چنانچہ جب (آئندہ سال) آپؐ مکہ تشریف لائے اور متعینہ مدت پوری ہوگئی اور آپؐ مکہ سے نکلنے لگے تو حضرت حمزہؓ کی بیٹی آپؐ کے پیچھے یہ کہتی ہوئی دوڑی کہ اے میرے چچا، اے میرے چچا!! حضرت علیؓ نے اسے اپنے ہمراہ لینے کا قصد کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اس کے لیے حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ کے درمیان جھگڑا ہوا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں نے اسے اپنے ہمراہ لیا ہے اور یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت جعفرؓ کا کہنا تھا کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے۔ حضرت زیدؓ کہہ رہے تھے کہ یہ میری بھتیجی ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس جھگڑے کا فیصلہ اس طرح فرمایا کہ اس لڑکی کو اس کی خالہ کے سپرد کردیا جائے اور فرمایا کہ ''خالہ بہ منزلہ ماں کے ہے۔'' اور آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔'' حضرت جعفرؓ سے آپؐ نے فرمایا: ''جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے تم مجھ سے مشابہ ہو۔'' اور آپؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا: ''تم میرے بھائی اور محبّ ہو۔''

تشریح: حضرت حمزہؓ نبی (ﷺ) کے چچا تھے لیکن وہ آپؐ کے دودھ شریک بھائی بھی ہوتے تھے۔ ابولہب کی لونڈی ثوبیہ کا آپؐ نے اور حضرت حمزہؓ نے دودھ پیا تھا۔ اسی لیے حضرت حمزہؓ کی بیٹی نے آپؐ کو اے میرے چچا، اے میرے چچا!! کہہ کر پکارا۔ واضح رہے کہ حضرت حمزہؓ غزوۂ احد (۳ھ) میں شہید ہوگئے تھے اور اس حدیث میں حضرت حمزہؓ کی بیٹی سے متعلق جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ صلح حدیبیہ (۶ھ) کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔

حضرت جعفرؓ حضرت علیؓ کے بھائی، وہ حضرت علیؓ سے عمر میں دس سال بڑے تھے۔ حضرت زیدؓ نبی کریم (ﷺ) کے آزاد کردہ غلام اور متبنّٰی تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت حمزہؓ اور حضرت زیدؓ میں بھائی چارہ کرایا تھا اسی لحاظ سے حضرت زیدؓ نے حضرت حمزہؓ کی بیٹی کو اپنی بھتیجی کہا۔

خالہ ہی درحقیقت ماں کی قائم مقام ہوسکتی ہے۔ اس لیے ماں کے بعد خالہ ہی کا گھر ہوسکتا ہے جہاں بچہ کو کسی اجنبیت کا احساس نہ ہو اور ہو بھی تو بہت کم۔ آپؐ نے حضرت جعفرؓ سے فرمایا کہ تم میرے مشابہ ہو اور حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ تم میرے بھائی اور محب ہو۔ خواہش ہر ایک کو تھی کہ حضرت حمزہؓ کی بیٹی کی پرورش اس کے یہاں ہو۔ پرورش کے لیے تو آپؐ نے اسے اس کی خالہ کے حوالہ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اپنے اصحابؓ کا آزردہ خاطر ہونا بھی آپؐ کو گوارا نہ تھا۔ ان کی آزردگی دور ہو، اس کے لیے آپ نے ان حضرات کے سلسلے میں یہ کلمات ارشاد فرمائے۔ ان کلمات سے ان حضرات کی فضیلت بہ خوبی ظاہر ہوتی ہے۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ اَبِی اَیُّوْبَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ وَالِدَةٍ وَّ وَلَدِھَا فَرَّقَ اللّٰہُ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ اَحِبَّتِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”جو شخص ماں اور اس کے بیٹے کے درمیان جدائی ڈالے تو اللہ قیامت کے روز اس کے اور اس کے عزیزوں کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔“

تشریح: جدائی ڈالنے کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً لونڈی کو تو بیچ دیا مگر اس کے بچہ کو روک لیا یا بچہ کو بیچ دیا اور اس کی ماں کو رہنے دیا، یا ایک کو کسی کے ہاتھ اور دوسرے کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیا۔

بیٹے اور ماں کے درمیان جدائی ڈالنے کا ذکر بہ طور مثال ہے ورنہ یہی حکم ہر چھوٹے بچہ کے اس کے ذی رحم محرم سے جدا کرنے کا ہے۔ خواہ وہ ماں ہو یا باپ یا دادا دادی ہوں یا بھائی بہن، چنانچہ احناف نے دو۲ بھائیوں کے درمیان اگر ان میں سے ایک ابھی چھوٹا ہے، جدائی ڈالنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

جذبات کا احترام

﴿۱﴾ عَنْ مَالِکِ بْنِ الْحُوَیْرِثِؓ قَالَ: اَتَیْنَا النَّبِیَّ ﷺ وَ نَحْنُ شَبَبَةٌ مُتَقَارِبُوْنَ فَاَقَمْنَا عِنْدَہٗ عِشْرِیْنَ لَیْلَةً وَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ رَحِیْمًا رَفِیْقًا فَظَنَّ اَنَّا قَدِ اشْتَقْنَا اَھْلَنَا فَسَأَلَ عَمَّنْ تَرَکْنَا مِنْ اَھْلِنَا، فَاَخْبَرْنَاہُ، فَقَالَ ارْجِعُوْا اِلٰی

اَھْلِیْکُمْ فَاَقِیْمُوْا فِیْھِمْ وَ عَلِّمُوْھُمْ وَ مُرُوْھُمْ وَ صَلُّوْا صَلٰوۃَ کَذَا حِیْنَ کَذَا وَ صَلٰوۃَ کَذَا فِیْ حِیْنَ کَذَا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت مالک ابن حویرثؓ کہتے ہیں کہ ہم چند ہم عمر نوجوان نبی کریم ﷺ کے پاس (دین سیکھنے) آئے۔ آپ کے پاس ہم نے بیس روز قیام کیا۔ رسولِ خدا ﷺ نہایت رحیم، نرم خو تھے۔ آپؐ نے محسوس فرمایا کہ ہم گھر جانا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے ہم سے پوچھا کہ ”تمھارے پیچھے کون لوگ ہیں؟“ ہم نے آپؐ کو بتایا تو آپؐ نے فرمایا: ”اپنے بچوں میں واپس جاؤ اور ان کے درمیان رہو اور انھیں (جو کچھ سیکھا ہے) سکھاؤ اور فلاں نماز فلاں وقت اور فلاں نماز فلاں وقت پڑھو۔“

تشریح: ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ، فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ فَلْیُؤَذِّنْ لَکُمْ اَحَدُکُمْ وَلْیَؤُمُّکُمْ اَکْبَرُکُمْ (بخاری، مسلم) ”تم اس طرح نماز پڑھو جیسی مجھے پڑھتے دیکھا ہے اور جب نماز کا وقت آجائے تو کوئی تم میں سے اذان دے اور جو تم میں (علم و سیرت کے لحاظ سے) بڑا ہو وہ امامت کرے۔“

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے لوگوں کی ضروریات اور ان کے جذبات وغیرہ کا پاس و لحاظ رکھنا کتنا ضروری ہے۔ دین یہ نہیں ہے کہ لوگوں سے ان کے فطری جذبات چھین لیے جائیں اور انھیں ان کے گھر والوں اور بیوی بچوں سے بے نیاز اور بے پروا بنا دیا جائے، بلکہ بیوی بچوں کے درمیان رہتے ہوئے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اور کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ اہل و عیال بھی اسی راستے کو اختیار کرلیں جس کو اس نے اپنے لیے پسند کیا ہے۔

حسن ظن

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَۃِ۔ (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”حسن ظن منجملہ بہترین عبادت کے ہے۔“

تشریح: اللہ کا اپنے بندوں پر ایک بنیادی حق یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے بدگمان نہ ہوں، بلکہ

ان کا تعلق خدا سے حسنِ ظن کا ہو۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حسن ظن یہ نہیں ہے کہ آدمی مسلسل خدا کی نافرمانیاں کرتا جائے اور امید نجات و مغفرت کی رکھے۔ بلکہ خدا کے ساتھ حسن ظن یہ ہے کہ آدمی طاعت و بندگی میں کوتاہی سے احتراز کرے۔ اور اس کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہو کہ خدا ہماری عبادتوں اور نیک کاموں کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنے بندوں کی عبادات کو قبول فرماتا اور ان کے نیک اعمال کا قدرداں ہے۔

خدا کے بعد ہم پر اس کے بندوں کا بھی یہ حق ہوتا ہے کہ ہمارا معاملہ ان سے بدگمانی کی بنیاد پر ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم بلا وجہ کسی سے بدگمان نہ ہوں۔ سوءِ ظن سے اپنے آپ کو ہمیشہ پاک رکھیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر معاشرہ کی فضا ہمیشہ مکدّر رہے گی۔ اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر آدمی کی سیرت اور اس کی شخصیت میں ایک عیب پایا جائے گا جو حد درجہ قبیح ہوگا۔

آدمی میں اگر یہ عیب نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے بدظن ہو بلکہ اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ اچھے گمان رکھتا ہے تو یہ ایک ایسا وصف ہوگا جس کی وجہ سے اس کی سیرت اور اس کے کردار ہی میں نہیں بلکہ اس کے تمام اعمال اور اس کی ہر عبادت میں حسن و کمال پیدا ہو جائے گا۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ اچھا آدمی دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان رکھتا ہے۔ برے شخص کو ہی دوسروں میں برائی کی تلاش رہا کرتی ہے۔

عیب پوشی

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ مَنْ كَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ وَ مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے اور نہ اسے تباہی کے حوالے کرے، جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کے کام میں لگا رہے گا اللہ اس کی حاجت روائی کے کام میں لگا رہے گا۔ اور جو

شخص کسی مسلمان پر سے کوئی مصیبت دور کرے گا اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت اس پر سے دور فرمائے گا اور جو کوئی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔"

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لاَ يَسْتُرُ عَبْدٌ عَبْدًا فِي الدُّنْيَا اِلَّا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "جو کوئی دنیا میں کسی بندے کے عیب پر پردہ ڈالے گا خدا قیامت کے روز اس کے عیب پر پردہ ڈالے گا۔"

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَرُدُّ عَنْ عِرْضِ اَخِيْهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّرُدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تَلاَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ: وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ٥ (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "جو مسلمان اپنے بھائی کی آبرو کی حفاظت کے مقصد سے جواب دہی کرتا ہے تو اللہ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ قیامت کے روز وہ جہنم کی آگ سے اس کی حفاظت فرمائے۔" اس کے بعد آپؐ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الروم ۳۰:۴۷) "اور اہلِ ایمان کی نصرت تو ہم پر ایک حق ہے۔"

تشریح: یعنی اپنے بھائی پر لگائے گئے الزامات کو دور کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے تاکہ بھائی کی آبروریزی نہ ہو سکے۔ یہ عمل اللہ کو اتنا زیادہ پسند ہے کہ وہ اس کے صلہ میں اسے آتشِ دوزخ سے بچائے گا۔

آپؐ نے قرآن کی آیت اپنی بات کی تائید اور تصدیق کے لیے پیش فرمائی۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ خدا اپنے مومن بندوں کا ناصر اور مددگار ہے۔ وہ ان لوگوں کو بہترین صلہ عنایت فرمائے گا جو اس کے مومن بندوں کی حمایت کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ خدا تو مومنین کا حامی و ناصر ہو اور ہم اہل ایمان کی آبروریزی اور ان کی پردہ دری کے درپے ہوں۔ آج ہم اس بیش قیمت تعلیم کو فراموش کیے ہوئے ہیں اور اپنی زبوں حالی کے خود ذمّہ دار ہیں۔

عیب پوشی کے سلسلے میں جو احادیث یہاں پیش کی گئی ہیں وہ اس بات کی واضح دلیل

ہیں کہ اسلام کسی کی پردہ دری کو ہرگز روا نہیں رکھتا۔ اس کا حکم پردہ دری کا نہیں بلکہ عیب پوشی کا ہے۔ اسے اس سے ہرگز دل چسپی نہیں ہے کہ لوگوں سے ان کی عزت اور آبرو چھین لی جائے۔ اس کے برعکس اس کے اندر تو بے آبرو اور ذلیل قسم کے لوگوں کو بھی عزت اور آبرو بخشنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسلام یوں تو کسی کی بھی رسوائی کو پسند نہیں کرتا لیکن اہل ایمان کے معاملہ میں تو وہ مسلمانوں کو حد درجہ متنبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی مسلمانوں کی عیب پوشی کریں اور انھیں حتی الامکان بے آبرو ہونے سے بچائیں۔ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی آبرو اور اس کی عزت کے محافظ بنیں خواہ وہ بھائی اپنے قریب رہتا ہو یا دور، انھیں بہ ہر صورت اپنے بھائی کی خیر خواہی سے تغافل نہیں کرنا چاہیے۔

رازداری

〈۱〉 عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لاَ يُبَلِّغُنِي اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِي عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَ اَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے صحابہ میں سے کوئی شخص کسی کی کوئی برائی مجھ سے بیان نہ کرے۔ اس لیے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ جب میں تمھارے پاس آؤں تو میرا سینہ صاف ہو۔''

تشریح: یعنی اگر کسی کو کسی شخص کی کوئی برائی یا عیب معلوم ہو تو وہ اس کا ذکر مجھ سے نہ کرے، اسے راز رہنے دے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کی طرف سے میرا دل بالکل صاف ہو۔ کسی کے لیے کوئی کدورت اور ناراضی میرے دل میں پیدا نہ ہو۔ لوگوں کے بارے میں میرا گمان اور خیال اچھا ہی رہے۔ اس لیے اگر کسی پر کسی شخص کی کوئی برائی یا عیب ظاہر ہو جائے تو اسے اپنی ہی حد تک رکھے۔ اس راز کو بیان نہ کرے۔

نبی (ﷺ) کو جب یہ پسند تھا کہ آپؐ کا دل اپنے اصحاب کی جانب سے صاف رہے تو آپؐ سے محبت رکھنے والے مسلمانوں کا بھی یہی ذوق ہونا چاہیے۔ انھیں بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ان کا دل اپنے بھائیوں کی طرف سے صاف رہے۔ کوئی نفرت اور کدورت اس کے اندر

نہ رہے۔ یہ جب ہی ممکن ہو سکے گا کہ ہم نہ تو لوگوں کے عیوب کی تلاش میں رہیں اور نہ ان کے عیبوں کو ادھر ادھر بانٹتے پھریں۔ عیوب اور کم زوریوں کے بہ جائے ہمیں دل چسپی لوگوں کی خوبیوں اور اچھے اوصاف سے ہو۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس سے مشورہ لیا جائے اسے امانت سونپی گئی۔''

تشریح: یعنی جس شخص پر اعتماد کر کے اس سے کسی معاملہ میں مشوہ کیا جائے اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس اعتماد کو ہر گز مجروح نہ ہونے دے۔ ایک تو اس کا فرض ہے کہ مشورہ صحیح دے۔ کوئی غلط مشورہ اپنے بھائی کو ہر گز نہ دے۔ دوسرے اس کی یہ بھی ذمّہ داری ہے کہ جس معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جائے وہ اسے ایک امانت سمجھتے ہوئے پوری راز داری سے کام لے اور بھائی کا راز ہر گز فاش نہ کرے۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ مشورہ لینے والا شخص اس بات کو پسند نہ کرتا ہو کہ کوئی شخص اس سے واقف ہو۔ اور اگر اس نے یہ کہہ بھی دیا ہو کہ اس سے کوئی دوسرا شخص مطلع نہ ہو تو اس صورت میں تو یہ ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کا راز اِفشا نہ ہو۔

〈۳〉 وَ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِسْتَعِيْنُوْا عَلٰى اِنْجَاحِ حَوَآئِجِكُمْ بِالْكِتْمَانِ فَاِنَّ كُلَّ ذِىْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ۔ (المعجم للطبرانی)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنی ضروریات کے حصول کی کام یابی کے لیے راز داری سے مدد لو، کیوں کہ ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے۔''

تشریح: دنیا میں حاسدوں کی کمی نہیں ہوتی۔ وہ جس کسی شخص کو کام یابیوں سے ہم کنار ہوتا دیکھتے ہیں اس سے حسد کرنے لگ جاتے ہیں کسی کی ترقی انھیں گوارا نہیں ہوتی۔ وہ کبھی پسند نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص اپنے عزائم اور ارادے میں کام یاب ہو سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے عزائم اور ارادوں کو قبل از وقت ہر گز لوگوں پر ظاہر نہ کرے۔ بہت ممکن ہے ایسی صورت میں اس کے حاسدین اس کے لیے پریشانیاں اور دقتیں پیدا کر دیں۔ یوں بھی آدمی کو ہلکے پیٹ کا

نہیں ہونا چاہیے کہ بلاضرورت اپنے منصوبوں کو لوگوں میں مشتہر کرتا پھرے اور حاسدین کے لیے اس کا موقع فراہم کردے کہ وہ اسے اپنے رشک وحسد کا نشانہ بنائیں۔

حاجت روائی

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ قَضٰی لِاَحَدٍ مِّنْ اُمَّتِیْ حَاجَةً یُّرِیْدُ اَنْ یَّسُرَّهٗ بِهَا فَقَدْ سَرَّنِیْ وَ مَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰهَ وَ مَنْ سَرَّ اللّٰهَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جو شخص میری امت میں سے کسی شخص کی حاجت پوری کرے اور اس سے اس کا منشا اسے خوش کرنا ہو، اس نے مجھے خوش کیا۔ اور جس شخص نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا اور جس کسی نے اللہ کو خوش کیا اسے اللہ جنت میں داخل فرمائے گا۔''

تشریح: نبی (ﷺ) کو اپنی امت کے افراد سے جو خاص تعلق تھا وہ اس حدیث سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی حاجت روائی کرنا اور اس کے لیے خوشی کا سامان فراہم کرنا دین میں کیا درجہ رکھتا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ دوسروں کو خوش دیکھنے کی خواہش انتہائی پسندیدہ خواہش ہے۔ یہ خواہش آدمی کے اندر اسی صورت میں ابھر سکتی ہے جب کہ اسے بندگانِ خدا سے گہرا اور جذباتی لگاؤ ہو اور وہ ان کی تکلیف اور پریشانی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہو۔

کسی ضرورت مند کی حاجت روائی کے پیچھے کوئی خود غرضی اور دنیوی مفاد کو محرک نہیں ہونا چاہیے۔ حاجت مند کو خوش اور مسرور کرنے کی خواہش خود ایک قوی محرک ہے۔ اور شاید نہایت قوی محرک اور قوی داعیہ۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کے پاس ہم دردی اور غم گساری کا جذبہ موجود ہو۔ یہی ہم دردی، دل سوزی اور غم خواری کا جذبہ ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اور جس کے سبب سے اس کی شخصیت میں کشش اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اگر مفقود ہو جائے تو انسان کی آدمیت کے لحاظ سے موت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر وہ زمین پر چلتا پھرتا، لوگوں سے باتیں کرتا اور اپنی موجودگی کا

اعلان کرتا ہو۔ کسی شخص کی زندگی کا ثبوت نہ تو اس کی بلند اور فلک بوس بلڈنگوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور نہ کتابوں، تحریروں اور اخباری بیانات کے ذریعہ سے ملتا ہے اور نہ لاوڈ اسپیکر اور ریڈیو اس کی زندگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ کسی کی زندگی کا ثبوت تو اس کی ان خدمات سے ملتا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے وہ کر رہا ہوتا ہے۔ کسی کے بارے میں یہ جاننے کا کہ اسے زندگی حاصل ہے معتبر ذریعہ یہی ہے۔ اس سے ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ وہ کتنا زندہ ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ خدا کے رسول کے دل میں لوگوں کا کتنا درد ہے۔ لوگوں کا غم آپؐ کو غم گین کر دیتا ہے اور لوگوں کی خوشیوں سے آپؐ کو خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جس نے کسی حاجت مند شخص کی حاجت پوری کی اور اس کے پیچھے ریا، نمائش وغیرہ کوئی پست قسم کی خواہش نہ تھی بلکہ ضرورت منداور پریشان شخص کو خوش دیکھنا اس کا مقصود تھا اس نے مجھے خوش کیا۔ اور مجھے ہی نہیں، اس نے اپنے اس نیک عمل کے ذریعہ سے اپنے خدا کو خوش کیا اور جس سے خدا خوش ہو جائے تو اس کی قسمت کا کیا کہنا۔ یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے خوش ہو اور اسے اپنی نعمتوں سے نہ نوازے۔ اس کی توقع تو ایک معمولی انسان سے بھی نہیں کی جاتی اس لیے لازماً ایسے شخص کو خدا جنت میں جگہ عنایت فرمائے گا۔

اس حدیث میں ہمارے لیے بڑی رہ نمائی ہے۔ دوسروں کے لیے خوشی کا سامان مہیا کرنا عظیم المرتبت کام ہے۔ اگر یہ خیال صحیح معنی میں ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو کیا ہم کسی کو ستا سکتے ہیں۔ کیا ہم کبھی پسند کر سکتے ہیں کہ ہماری وجہ سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ ہم تو اس ظلم سے بھی بے چین ہو اٹھیں گے جو دوسروں نے کسی پر کیا ہو۔

کسی حاجت روائی کی قدر و قیمت اس صورت میں اور بڑھ جاتی ہے کہ کوئی کسی بندۂ مومن کی حاجت روائی کرتا ہے۔ اس لیے کہ مومن شخص خدا سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

کسی کی حاجت روائی اور فریاد رسی خدا کو کتنا پسند ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے بھی کیا جا سکتا ہے: مَنْ اَغَاثَ مَلْهُوْفًا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ ثَلٰثًا وَّ سَبْعِيْنَ مَغْفِرَةً، وَاحِدَةٌ فِيْهَا صَلَاحُ اَمْرِ كُلِّهٖ وَثِنْتَانِ وَ سَبْعُوْنَ لَهٗ دَرَجَاتٌ يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (بیہقی عن انسؓ)

''جس نے کسی غم زدہ مظلوم و مضطر کی فریاد رسی کی خدا اس کے لیے تہتر مغفرت لازم

کر دیتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک ہی سے اس کے کام اور معاملہ کی درستی ہوجاتی ہے۔ باقی بہتر مغفرتیں قیامت کے روز اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہوں گی۔"

غَفَرَ کے معنی ہیں ڈھانکنا، معاف کرنا اور درست کرنا۔ قرآن میں بعض ایسے مواقع پر بھی مغفرت کا ذکر فرمایا گیا ہے جہاں کسی گناہ اور نافرمانی کی بات بیان نہیں ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کے معنی میں وسعت پائی جاتی ہے۔ خدا ہمارے گناہوں کو معاف کر دے یہ بھی مغفرت ہے اور وہ ہماری ستاری فرمائے اور ہمیں رسوائیوں سے بچالے مغفرت کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کے درجات کا بلند کیا جانا بھی مغفرت کی ایک شکل ہے۔

قرآن میں ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط اُولٰٓئِکَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌo (ہود: ۱۱) "ان کی بات اور ہے جنھوں نے صبر اور نیک کام کیے۔ وہی ہیں جن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔"

اسلام میں ہر مطلوب عمل حقیقت میں اس مقام کی نشان دہی کرتا ہے جو سب سے بلند ہے اور جس مقام پر پہنچا ہوا شخص کسی بھلائی اور اجر و ثواب سے محروم نہیں ہوسکتا۔ ایک معمولی نیکی بھی اگر کوئی پورے شعور و فہم کے ساتھ اختیار کرے تو ایک طرف تو اس کے زیر اثر وہ دوسری تمام نیکیوں کو بھی فطرتاً اختیار کر سکے گا اور دوسری طرف برائیوں سے اسے شدید نفرت ہوجائے گی۔ ایک چھوٹی نیکی کے اندر بھی پوری زندگی کو بدل دینے کی قوت موجود ہے۔ ایک نیکی بھی اگر صحیح معنی میں نیکی ہے تو وہ اس کی علامت ہوتی ہے کہ آدمی راہِ راست پر قائم ہے۔ اسی لیے ہم خدا کے رسول (ﷺ) کو کسی ایک نیکی پر جنت کی بشارت دیتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ کسی کی زندگی ظلم و ستم اور نافرمانیوں سے بھری ہوئی ہے وہ محض ایک نیکی کر کے جنت حاصل کرلے گا۔ ایسے شخص کی تو وہ نیکی بھی حقیقت کی نظر میں نیکی نہیں ہوتی۔ اس نیکی کو تو اس کی اپنی زندگی ہی باطل کر دیتی ہے۔ حقیقی نیکی وہ ہے جو آدمی کی پوری زندگی کے صالح ہونے کی خبر دے سکے۔

جس طرح اہلِ نظر کے لیے سورج کا ڈھلنا، اس کا غروب ہونا اور طلوعِ سحر، اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ان اوقات میں خدا کے آگے سربہ سجود ہوجائے۔ اب اگر کوئی ان اوقات میں

خدا کے آگے اپنے کو نہیں جھکاتا اور اس کے حضور میں اپنی عجز و نیاز کا اظہار نہیں کرتا وہ کائنات کے حقائق کو باطل ٹھیراتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جو شخص دیکھتا ہے کہ کسی کی بے کسانہ نگاہیں کسی غم خوار کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں اور وہ اس کی خبر نہیں لیتا وہ ایک طرف تو اس احساس کو کچل کر رکھ دیتا ہے جو زندگی کا سب سے قیمتی جوہر ہے جس کو خدا نے اس کے سینہ میں بہ طور امانت رکھا ہے۔ دوسری طرف وہ اس تقاضے کو بھی بے معنی قرار دیتا ہے جو اس کے سامنے بے کسانہ نگاہوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کسی کی یہ بے کسی اور مجبوری ایک آئینہ بن کر اس کے سامنے آئی لیکن اس آئینہ کے ذریعہ سے اس کی اپنی جو تصویر نمایاں ہوئی وہ کیسی ہے؟ اس کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ مادی آئینے صرف ہماری ظاہری شکل وصورت کو نمایاں کرتے ہیں لیکن یہ آئینے جو بے کسی، مجبوری اور مظلومیت کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کے ذریعہ سے ہمارے باطن کی تصویر ابھرتی ہے۔ وہ بتا دیتے ہیں کہ ہمارا باطن کیسا ہے؟ ہمارے دل کی کیا حالت ہے؟

آپ کتنے ہی ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے یہاں مال ودولت کی فراوانی ہے لیکن دل ان کے سخت ہیں وہ کسی کے کام آنے کے نہیں اور کتنے ہی تہی دست ہیں لیکن ہم دردی وغم خواری کا جذبہ انھیں ملا ہے۔ جو دوسروں کے لیے جو کچھ بن پڑتا ہے کرتے ہیں۔ کچھ نہیں تو کسی کی پریشانی اور مصیبت کو دیکھ کر اس طرح رو پڑتے ہیں گویا یہ مصیبت خود ان پر پڑی ہے ؎

دیا دست تہی کے ساتھ طینت میں کرم یارب
میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

ہم دردی اور غم خواری کا جذبہ جن کے یہاں مفقود ہے ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ کبھی بھی بلندی کو حاصل نہیں کر سکتے۔ خواہ وہ ہمیں بہ ظاہر کتنے ہی بڑے مقام پر فائز دکھائی دیتے ہوں۔ خواہ ان کے پاس مال اور دولت کی کتنی ہی فراوانی کیوں نہ ہو۔ ان کی سیرت کے نقص کو ان میں سے کوئی چیز مٹا نہیں سکتی۔

ہم دردی وغم خواری کا جذبہ اگر ہے تو اس کا اثر آدمی کے اپنے گھر کی زندگی میں بھی ظاہر ہوگا۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مہربان ہوگا۔ اس کا حال اس باپ جیسا نہ ہوگا جس کا بیٹا اس کی سختی سے پریشان وخائف رہتا ہو۔

بڑوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ ذہن ودماغ ہی کے لیے نہیں بلکہ دل کے لیے غذا فراہم

کرتے ہیں۔ وہ کتنے ہی یتیم اور بے کسوں کو شفقت و محبت بخشتے ہیں۔ خدا جن کو آرام و آسائش بخشتا ہے وہ سخت آزمائش میں ہوتے ہیں بالعموم لوگ اس آزمائش میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ انصاف کرنا بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ظلم کی روش اختیار کرکے سب سے پہلے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمِلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اَحْسِبُهٗ قَالَ کَالْقَآئِمِ لَا یَفْتُرُ اَوْ کَالصَّآئِمِ لَا یُفْطِرُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''کم زور، بے شوہر والی عورت اور محتاج و نادار شخص کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو راہِ خدا میں سرگرمی دکھاتا ہے۔'' راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''ایسا شخص اس شب بے دار (قام باللیل) کی طرح ہے جو عبادت سے تھکتا نہیں یا اس روزہ دار کی طرح ہے جو روزوں کے تسلسل کو توڑتا نہیں۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے: اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمِلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ الْقَآئِمِ اللَّیْلِ اَوِ الصَّآئِمِ النَّهَارِ (احمد، شیخین، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ''کم زور و بے شوہر والی عورت اور محتاج کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا شب بے دار یا دن میں روزہ دار کی طرح ہے۔''

یہ حدیث بتاتی ہے کہ حاجت مندوں کی خبر گیری ہو یا جہاد فی سبیل اللہ اور نماز و روزہ۔ ان سب کی اصل روح اور اسپرٹ ایک ہی ہے۔ یہ سارے ہی اعمال ایک ایسے اخلاق و کردار کی نمائندگی کرتے ہیں جو اسلام میں اصلاً مطلوب ہے۔ یہ اعلیٰ اخلاق ہی ہے کہ بندہ راتوں میں خدا کے آگے عجز و نیاز اور اس سے اپنے تعلق کا اظہار قیامِ لیل اور دن میں روزوں کے ذریعہ سے کرے۔ اور یہ بھی مومنانہ اخلاق ہی کا تقاضا ہے کہ وہ زمین سے فتنہ و فساد کو دور کرنے اور خدا کے دین کے قیام کے لیے کوشاں رہے۔ اور پھر یہ بھی اسلامی اخلاق ہے کہ آدمی ان لوگوں کی مدد سے اپنا ہاتھ نہ کھینچے جن کو وہ اپنی مدد کا مستحق پاتا ہو۔ خواہ وہ کوئی بیوہ عورت ہو یا کوئی نادار اور محتاج شخص۔ یہ حدیث اس غلط فہمی کو (جو اکثر دین دار قسم کے لوگوں میں پائی جاتی ہے) دور کرنے

کے لیے کافی ہے کہ دین میں نماز اور روزہ وغیرہ عبادات ہی سب کچھ ہیں۔ وہ اعمالِ نیک جن کا تعلق بندگانِ خدا کی خدمات سے ہے ان کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَكَيْفَ اَنْصُرُهٗ ظَالِمًا؟ قَالَ تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذٰلِکَ نَصْرُکَ اِيَّاهُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم'' ایک شخص نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، مظلوم کی مدد تو میں کرتا ہوں مگر ظالم کی مدد میں کیسے کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم اسے ظلم سے روک دو، یہی تیری طرف سے اس کی مدد کرنی ہے۔''

تشریح: اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے ظالم ہونے کے گھناؤنے عیب سے چھٹکارا دلانا اس کی سب سے بڑی مدد ہے۔ خواہ وہ ظالم شخص اسے بروقت محسوس نہ کر سکے۔

سفارش

﴿۱﴾ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ الشَّفَاعَةُ بِهَا تُفَکُّ الرَّقَبَةُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بہترین صدقہ وہ سفارش ہے جس کے ذریعہ سے کسی گردن کو چھڑایا جائے۔''

تشریح: کسی محتاج ونادار شخص کو صدقہ دے کر ہم اسے مالی پریشانی سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مالی پریشانی سے بڑھ کر مصیبت کی بات یہ ہے کہ کوئی شخص غلامی کی زندگی گزار رہا ہو، کسی کی گردن پھنسی ہوئی یا کوئی جان مبتلائے ستم وجور ہو۔ اس لیے اسے اس مصیبت سے نجات دلانے کی سعی وسفارش عام صدقات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے اس سفارش کو بہترین صدقہ قرار دیا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا، ثُمَّ شَبَّکَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ وَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ جَالِسًا اِذْ جَآءَ

رَجُلٌ یَسْأَلُ اَوْ طَالِبُ حَاجَةٍ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَلْیَقْضِ اللّٰهُ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّهٖ مَا شَآءَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''مومن، مومن کے لیے عمارت کی طرح ہوتا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے۔'' پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو باہم ملا کر دکھایا۔ نبی ﷺ بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص کچھ مانگنے کو یا کوئی حاجت لے کر آیا۔ آپؐ ہم لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا، ''سفارش کرو، تمھیں اجروثواب حاصل ہوگا۔ اور اللہ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہتا ہے حکم جاری فرماتا ہے۔''

تشریح: صحیح مسلم میں یہ الفاظ آئے ہیں: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَآ اَتَاهُ طَالِبُ حَاجَةٍ اَقْبَلَ عَلٰی جُلَسَآءِهٖ فَقَالَ اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَلْیَقْضِ اللّٰهُ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّهٖ ﷺ مَا اَحَبَّ۔ ''رسولِ خدا ﷺ کے پاس جب کوئی شخص کوئی حاجت لے کر آتا تو آپؐ اپنے ساتھیوں سے فرماتے کہ سفارش کرو کہ تمھیں اجروثواب ملے گا اور اللہ اپنے نبیؐ کی زبان پر جو چاہتا ہے حکم جاری فرماتا ہے۔'' یعنی تم سفارش کرکے اجر حاصل کرو، میں وہی فیصلہ کروں گا جو حق ہوگا۔ نووی نے کہا ہے کہ سفارش حاکم اور ہر شخص سے کی جاسکتی ہے خواہ یہ سفارش کسی کو کچھ دلوانے کے لیے ہو یا ظلم کو روکنے یا سزا کی معافی کے لیے ہو۔ البتہ ناحق مطالبہ کے لیے اور حدود کے معاملہ میں سفارش کرنی جائز نہیں ہے۔

سادگی

(۱) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا بَعَثَ بِهٖ اِلَی الْیَمَنِ قَالَ: اِیَّاکَ وَالتَّنَعُّمَ۔ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں یمن بھیجا تو فرمایا: ''دیکھنا عیش پسندانہ زندگی سے دور رہنا، کیوں کہ اللہ کے بندے عیش پسندانہ زندگی نہیں گزارتے۔''

تشریح: اس حدیث میں تنعم اور عیش کوشی سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ تنعم سے مراد وہ زندگی ہے جو مسرفانہ، عیش پسندی اور تن آسانی کی ہو۔ دنیا اور دنیوی عیش وعشرت کی طلب اصلاً ان

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومن بھولا بھالا صاحبِ کرم اور فاجر سیانا بخیل و بد بخت ہوتا ہے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مومن کم فہم اور نادان نہیں ہوتا لیکن اپنی فیاضی طبعی اور حسن خلق کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ اس کا معاملہ سہولت اور نرمی کا ہوتا ہے۔ وہ دھوکا کھا جائے یہ تو ممکن ہے لیکن اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی شخص کو دھوکا دے گا۔ اس کے برخلاف فاجر شخص نہایت چال باز اور سیانا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں اخلاق کی بلندی نہیں پائی جا سکتی۔ وہ فریب کار ہوتا ہے۔ اس سے ہمیشہ بخل اور شر کا اندیشہ رہتا ہے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ مومن کو کوئی شخص بار بار دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ تجربات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَيْنِ (بخاری، مسلم، ابوداؤد) ''مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔''

وقار و عظمت

سکون و وقار

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّهٗ دَفَعَ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ یَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النَّبِیُّ ﷺ وَرَاءَهٗ زَجْرًا شَدِیْدًا وَ ضَرْبًا وَ صَوْتًا لِلْاِبِلِ فَاَشَارَ بِسَوْطِهٖ اِلَیْهِمْ وَ قَالَ: اَیُّهَا النَّاسُ عَلَیْکُمْ بِالسَّکِیْنَةِ فَاِنَّ الْبِرَّ لَیْسَ بِالْاِیْضَاعِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ عرفہ کے روز ہم نبی ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے، اتنے میں سخت ڈانٹنے، مارنے اور اونٹوں کے بلبلانے کی آواز نبی ﷺ نے سنی۔ آپؐ نے اپنے کوڑے سے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اے لوگو! سکون اختیار کرو کیوں کہ تیزی اور جلد بازی نیکی و طاعت نہیں ہے۔''

تشریح: یعنی بلا ضرورت دوڑ بھاگ کرنے اور جلد بازی دکھانے کو نیکی اور اطاعت نہیں کہتے، مطلوب سکینت اور اطمینان ہے۔ ہمیشہ وقار و متانت کا خیال رکھنا ہی مومن کے شایانِ شان ہے۔ قرآن میں بھی ہے: وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا ''رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر متواضع ہو کر چلتے ہیں۔'' (الفرقان: ۶۳)

نرمی اور بردباری

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: بَالَ اَعْرَابِیٌّ فِی الْمَسْجِدِ، فَقَامَ النَّاسُ اِلَیْهِ لِیَقَعُوْا فِیْهِ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: دَعُوْهُ وَ اَرِیْقُوْا عَلٰی بَوْلِهٖ سَجْلاً مِّنْ مَّاءٍ اَوْ ذَنُوْبًا مِّنْ مَّاءٍ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی شخص نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس پر بگڑنے لگے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی بہا دو۔ تم تو آسانی پیدا کرنے ہی کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تم سختی اور دشواری پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے ہو۔''

تشریح: یعنی تمھیں سخت گیر بنا کر دنیا میں نہیں اٹھایا گیا ہے۔ تم جس پیام کو لے کر اٹھے ہو، وہ سراپا رحمت ہے۔ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانوں کی مشکلات اور دشواریاں دور ہوں۔ اور وہ بندشیں کٹ جائیں جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں تم کو اپنے منصب اور مقام کو پہچاننا چاہیے۔ مسئلہ یا معاملہ کوئی بھی ہو اس میں تمھاری امتیازی خصوصیت کا اظہار ہونا چاہیے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: یَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا۔ وَ بَشِّرُوْا۔ وَلاَ تُنَفِّرُوْا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''آسانی پیدا کرو، سختی نہ کرو۔ اور بشارت دو۔ نفرت نہ دلاؤ۔''

تشریح: ایک روایت میں بَشِّرُوْا کی جگہ سَکِّنُوْا کا لفظ آیا ہے۔ مراد سَکِّنُوْا بِالْبَشَارَۃِ، ہی ہے... یعنی بشارت کے ذریعہ سے انھیں تسکین دو۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت انس کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت آپؐ نے ان سے فرمایا تھا: یَسِّرَا وَلاَ تُعَسِّرَا وَ بَشِّرَا وَلاَ تُنَفِّرَا وَ تَطَاوَعَا وَلاَ تَخْتَلِفَا (بخاری۔ مسلم) ''آسانی پیدا کرنا، سختی اور دشواری پیدا نہ کرنا، بشارت دینا، نفرت نہ دلانا اور حکم میں اتفاق سے کام لینا، اختلاف میں نہ پڑنا۔''

ان روایتوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت کی سہولت کس قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر رہتی تھی۔ آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ طاعات کے معاملہ میں ترغیب سے کام لیا جائے تا کہ اطاعت لوگوں کے لیے آسان ہو جائے۔ اجر و ثواب اور دوسری برکات کا ذکر کر کے اطاعت اور فرماں برداری کو ان کے لیے ایک شے مطلوب بنا دیا جائے۔ دینی احکام و فرائض کو امر دشوار بنا کر ہرگز نہ پیش کیا جائے کہ قلوب اس سے متنفر ہو جائیں یا اسے اپنے لیے ایک مصیبت تصوّر کرنے لگ جائیں۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ صرف حضرت انسؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ ہی کی بات نہیں ہے بلکہ آپؐ جب بھی اور جس صحابی کو بھی حاکم بنا کر کہیں بھیجتے تو اسے یہی تعلیم دے کر بھیجتے: بَشِّرُوْا وَلاَ تُنَفِّرُوْا وَ یَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا۔ (بخاری، مسلم)

اعلیٰ ظرفی

﴿۱﴾ عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِذَا مَاتَ صَاحِبُکُمْ فَدَعُوْہُ وَلاَ تَقَعُوْا فِیْہِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تمھارا رفیق مرجائے تو اسے چھوڑ دو اور اس کا عیب بیان نہ کرو۔''

تشریح: یعنی تمھارا ساتھی جب اپنے رب کے پاس جا چکا تو اچھا برا سب اس پر ظاہر ہو چکا ہوگا۔ اب اس کی برائیوں کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کسی کی برائیوں کا تذکرہ تو یوں بھی صحیح نہیں ہے الا یہ کہ اس کی کوئی ناگزیر ضرورت پیش آجائے۔ کسی کے مرنے کے بعد اور وہ بھی جو اپنا ساتھی یا رفیق رہ چکا ہو اسے برائی کے ساتھ یاد کرنا نہایت کم ظرفی کی بات ہوگی۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ وَ کُفُّوْا عَنْ مَسَاوِیْھِمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے مردوں کی خوبیوں کا ذکر کرو اور ان کی برائیاں بیان کرنے سے بچو۔''

تشریح: یعنی اب جب کہ مرنے والے دنیا میں تمھارے ساتھ نہیں رہے تو یاد کرنے کی چیز ان کی خوبیاں اور محاسن ہیں نہ کہ ان کے معائب۔ جانے والے تو یاد آئیں گے ہی۔ انھیں یاد کرنا ان کا ایک حق بھی ہے۔ لیکن یہ بھی ان کا حق ہے کہ جو لوگ پردہ پوش ہو گئے تم ان کی پردہ دری نہ کرو۔ ان کے عیبوں کا اظہار تمھاری زبان یا قلم سے نہ ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو خواہ وہ اچھے رہے ہوں یا نہ رہے ہوں تم اچھے کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اسلام جس عفو و درگزر اور اعلیٰ ظرفی کی تعلیم دیتا ہے وہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے عیبوں کی تشہیر سے احتراز کرو۔ کوئی گندہ اشتہار بننے کے بجائے اچھے ذوق کی بات یہ ہوگی کہ تمھارے ذریعہ سے برائی کے بجائے بھلائی کو تقویت حاصل ہو۔

اعتدال پسندی

﴿۱﴾ عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِیِّؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْاَنَاۃُ مِنَ اللّٰہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطٰنِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کام کو اطمینان و متانت کے ساتھ انجام دینا اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی کرنا شیطان کے اثر سے تعلق رکھتا ہے۔''

تشریح: ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اَلسَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَۃُ

وَالْاِقْتِصَادُ جُزْءٌ مِّنْ اَرْبَعٍ وَّ عِشْرِیْنَ جُزْءً مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ (ترمذی) ''اچھی سیرت اور وقار و سکون کے ساتھ کام انجام دینے کی عادت اور میانہ روی نبوت کے چوبیس[۲۴] حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔''

ان ارشادات سے متانت، سنجیدگی اور اعتدال پسندی کی اہمیت بہ خوبی ظاہر ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ محاسن پیغمبرانہ زندگی کی خصوصیات ہیں۔ ان سے عاری ہونا بڑی محرومی کی بات ہے۔ یہ وہ خصائل ہیں جن کی تعلیم انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ اس کے برخلاف جلد بازی یا وہ انداز جو وقار و متانت کے منافی ہونا محمود ہے۔ اس سے یہی نہیں کہ آدمی کی شخصیت مجروح ہوتی ہے بلکہ اس سے دین کی بھی کوئی حقیقی خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے کہ دین کو نقصان پہنچا کر دین کی خدمت ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ثَلَاثٌ مُّنْجِیَاتٌ وَّ ثَلَاثٌ مُّهْلِکَاتٌ، فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ: فَتَقْوَی اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضٰی وَالسَّخَطِ وَالْقَصْدُ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ۔ وَ اَمَّا الْمُهْلِکَاتُ: فَهَوًی مُّتَّبَعٌ وَ شُحٌّ مُّطَاعٌ وَّ اِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَ هِیَ اَشَدُّهُنَّ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تین چیزیں نجات دینے والی اور تین چیزیں ہلاک کردینے والی ہیں۔ جو چیزیں نجات دینے والی ہیں وہ یہ ہیں: چھپے اور کھلے ہر حال میں اللہ سے ڈرنا۔ خوشی ہو یا ناراضی، دونوں حالتوں میں حق بات کہنا اور امیری ہو یا محتاجی دونوں صورتوں میں میانہ روی اختیار کرنا۔ اور رہیں ہلاکت میں ڈالنے والی چیزیں تو وہ یہ ہیں: خواہشِ نفس جس کا اتباع کیا جائے۔ اور حرص و بخل جس کا کوئی غلام بن جائے۔ اور عجب و خود بینی جس میں کوئی شخص مبتلا ہو اور یہ ان سب میں سخت اور بدترین خصلت ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کیا چیزیں نجات دلانے والی ہیں۔ (۱) اپنی خوشی اور ناراضی کے مقابلہ میں آدمی حق کو اہمیت دے۔ کسی سے خوش ہو جب بھی بات وہ کہے جو حق ہو اگرچہ وہ اس شخص کے خلاف پڑ رہی ہو جس سے وہ خوش ہے۔ اسی طرح اس وقت بھی وہ حق بات کہنے سے گریز نہ کرے جب کہ وہ کسی سے ناراض ہو۔ خواہ اس کے حق بات کہنے سے اس شخص کو فائدہ پہنچ رہا ہو جس سے وہ ناراض اور ناخوش ہے۔ (۲) یعنی خرچ کرنے میں توسط کا خیال رکھے۔ خرچ کرنے میں نہ تو اسراف سے کام لے اور نہ تنگی دکھائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فقر اور تنگی کی حالت میں آدمی نہ تو اپنی خودداری کو مجروح ہونے دے اور نہ کشادگی میں مغرورو

سرکش اور فرعونِ وقت بننے کی کوشش کرے۔ وہ ہر حال میں اس طرزِ عمل کو اختیار کیے رہے جسے خدا نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اور وہ طرزِ عمل یہ ہے کہ آدمی زندگی میں اعتدال کی روش کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دے۔

(۳) نجات کے حصول کے لیے خواہشاتِ نفس کو ہمیشہ فرمانِ حق کے تابع رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر خواہش نفس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو آدمی کی ہلاکت اور خاص طور سے اس کی آخرت کی تباہی و ناکامی یقینی ہے۔

(۴) ہلاکت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کی طبیعت بخل و حرص سے پاک ہو، یہ آسان بات نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ تو کر ہی سکتا ہے کہ بخل و حرص کے تقاضوں پر عمل نہ کرے بلکہ اس کے برخلاف زندگی میں اپنے لیے فیاضی کو ہی منتخب کرے۔

(۵) ہلاکت سے محفوظ رہنے کے لیے سب سے ضروری ہے کہ آدمی عجب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ یہ عجب وغرور اور خود بینی بدترین خصلت ہے۔ نتائج اور ضرر کے لحاظ سے بھی اور اس اعتبار سے بھی یہ بدترین مرض ہے کہ خدا کی نگاہ میں سب سے زیادہ برا اور مبغوض شخص وہ ہے جو مغرور اور خود پسند ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے گناہوں میں تو اس کی امید کی جاتی ہے کہ آدمی اس سے باز آجائے اور اپنے طرزِ عمل کو بدل لے لیکن مغرور اور عجب کے گرفتار سے اس کی توقع بہت کم ہوتی ہے کہ وہ اس پستی سے نکلنے میں کام یاب ہو سکے گا جس کو اس نے اپنی جگہ بلندی تصوّر کر رکھا ہے۔

قصور معاف کرنا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: قَالَ مُوْسَی بْنِ عِمْرَانَ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَا رَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِکَ عِنْدَکَ؟ قَالَ: مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے رب، تیرے بندوں میں کون شخص تیرے نزدیک زیادہ باعزت ہے؟ اللہ نے فرمایا: وہ شخص جو قدرت رکھنے پر بخش دے۔“

تشریح: درحقیقت انسان کی حیثیت ایک اخلاقی وجود کی ہے۔ اس کی تکمیل کا راز اخلاق کی تکمیل میں پوشیدہ ہے۔ اخلاقی لحاظ سے وہ جتنا زیادہ بلند ہوگا خدا کی نگاہ میں بھی وہ اتنا ہی زیادہ باعزت قرار پائے گا اور مخلوقِ خدا کی نظر میں بھی اس کی اتنا ہی زیادہ وقعت ہوگی اور اتنا ہی زیادہ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے احترام کا جذبہ پایا جائے گا۔

اس حدیث نے اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا ہے کہ عام زندگی میں یہ کیسے معلوم ہو کہ کس شخص کو اخلاق کا اونچا درجہ حاصل ہے؟ قدرت رکھنے اور قابو پانے کے باوجود اگر کوئی اس شخص کو معاف کر دیتا ہے اور انتقام نہیں لیتا جس نے اسے تکلیف و اذیت پہنچائی ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ اخلاقی لحاظ سے بہت ہی بلند اور خدا کی نگاہ میں بہت ہی باعزت ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ وَّمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا وَّمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ رسولِ خدا ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''صدقہ دینے سے کوئی مال گھٹتا نہیں اور معاف کرنے اور درگزر سے کام لینے کی وجہ سے اللہ بندے کی عزت ہی بڑھاتا ہے۔ اور جو کوئی شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اس کے سبب سے اللہ اسے بلندی و رفعت ہی عطا فرماتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ بندۂ مومن کی نگاہ مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں نہ تو خرچ کرنے سے مال میں کوئی کمی آتی ہے اور نہ عفو و درگزر سے کام لینے سے عزت کو کوئی بٹّا لگتا ہے اور نہ تواضع و خاک ساری سے آبرو خاک میں ملتی ہے۔ بلکہ نتائج بالکل اس کے برعکس نکلتے ہیں۔ صدقہ سماج کو اونچا اٹھانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ پھر معاشرہ میں اگر بے اطمینانی کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو تو اس سے خود صدقہ دینے والے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کی تجارت اور کاروبار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح صدقہ بالواسطہ اس کی دولت کا محافظ اور اس کے مال میں برکت کا باعث ثابت ہوتا ہے۔

عفو و درگزر سے کام لینا ایک کریمانہ عمل ہے اس سے آدمی کی شخصیت میں نکھار آتا ہے اور وہ حددرجہ حسین و جاذبِ نظر ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سیرت انسانی میں تواضع اور انکسار کی حیثیت بھی حسن و زیبائش کی ہے۔ اس سے سیرتیں نکھرتی اور سنورتی ہیں اور آدمی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ تواضع کسی کو پستی میں نہیں گراتا بلکہ اسے مقامِ بلند عطا کرتا ہے۔

پاکیزگیِ نفس

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ؟ قَالَ كُلُّ مَخْمُوْمِ الْقَلْبِ، صَدُوْقِ اللِّسَانِ۔ قَالُوْا: صَدُوْقُ اللِّسَانِ نَعْرِفُهٗ فَمَا

مَخمُومُ الْقَلْبِ؟ قَالَ: هُوَ النَّقِیُّ التَّقِیُّ لَآ اِثْمَ عَلَیْہِ وَلاَ بغیَ وَلاَ غِلَّ وَلاَ حَسَدَ۔ (ابن ماجہ، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں بہترین شخص کون ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہر وہ شخص جو مخموم القلب اور زبان کا نہایت سچا ہو۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ صدوق اللّسان (زبان کا نہایت سچا) تو ہم سمجھ گئے، لیکن مخموم القلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا، اس کی وضاحت فرمادیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ وہ صاف دل اور خدا ترس شخص ہے جس پر نہ تو گناہ کا بوجھ ہو اور نہ ظلم و تعدّی کا کوئی بار ہو اور نہ دل میں اس کے کسی کے لیے کوئی غبار ہو اور نہ حسد۔''

تشریح: اس حدیث میں انسانِ مطلوب کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ نہایت واضح اور مکمل ہے۔ اس میں سیرت کا کوئی بھی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ہے۔ دل، زبان اور کردار، یہ وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن سے شخصیت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ اس حدیث میں ان تینوں اجزاء کے ذریعہ سے انسان کی جو تصویر پیش فرمائی گئی ہے اس میں اس کے ظاہر اور باطن دونوں کی پاکیزگی اور حسن و خوبی نمایاں ہے۔ ایسے شخص کے ایک بہترین انسان ہونے میں کسی شخص کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔

زبان جھوٹ اور کذب سے نا آشنا اور دل ہر طرح کے غبار اور کثافت سے پاک ہو۔ اور کردار میں کہیں ظلم و زیادتی کا نشان موجود نہ ہو تو آدمی کی شخصیت میں جو حسن اور دلآویزی پیدا ہوگی اس کا اندازہ کرنا کسی کے لیے مشکل نہیں ہے۔

اس حدیث سے یہ بہ خوبی واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام کو کس اخلاق اور سیرت و کردار کے افراد مطلوب ہیں اور ایسے افراد کے ذریعہ سے جس معاشرہ کی تشکیل عمل میں آئے گی وہ معاشرہ کتنا پاکیزہ ہوگا۔

دوسرے کے مرتبہ ومقام کا لحاظ

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَرَانِیْ فِی الْمَنَامِ اَتَسَوَّکُ بِسِوَاکٍ فَجَآءَ نِیْ رَجُلاَنِ اَحَدُھُمَا اَکْبَرُ مِنَ الْاٰخِرِ فَنَاوَلْتُ السِّوَاکَ الْاَصْغَرَ مِنْھُمَا

فَقِيْلَ لِيْ كَبِّرْ فَدَفَعْتُهُ اِلَى الْاَكْبَرِ مِنْهُمَا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مسواک کر رہا ہوں۔ میرے پاس دو آدمی آئے جن میں سے ایک شخص دوسرے سے (عمر میں) بڑا تھا۔ ان میں جو چھوٹا تھا میں نے اسے مسواک دینے کا ارادہ کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں بڑے کو دوں۔ پس میں نے مسواک ان میں جو شخص بڑا تھا اسے دے دی۔"

تشریح: "مجھ سے کہا گیا کہ میں بڑے کو دوں" یعنی بہ ذریعہ وحی یا فرشتے کے ذریعہ سے آپؐ سے کہا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شخص نبی (ﷺ) کے بائیں جانب تھے۔ اس صورت میں مسواک کا حق دار وہ شخص تھا جو دونوں میں عمر میں بڑا تھا۔ بہ صورت دیگر اولیٰ بات یہ ہوتی کہ جو شخص آپؐ کے دائیں طرف ہوتا مسواک اسی کو دی جائے خواہ وہ عمر میں دوسرے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہوتا جیسا کہ حدیث میں ہے: اَلْاَيْمَنُوْنَ اَلْاَيْمَنُوْنَ اَلَا فَيَمِّنُوْا (بخاری، مسلم) "دائیں جانب کے مقدم ہیں، دائیں جانب کے مقدم ہیں۔ خبردار، پس دائیں طرف والوں کو دیا کرو۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آدمی کی جگہ اور اس کی حیثیت وغیرہ مختلف پہلوؤں کی اسلامی آدابِ زندگی میں کس درجہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَسْمَآءَؓ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّيْ قَدِمَتْ عَلَيَّ وَ هِيَ رَاغِبَةٌ اَوْ رَاهِبَةٌ اَفَاصِلُهَا؟ قَالَ: "نَعَمْ۔" (مسلم)

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ دین سے بےزار ہے۔ کیا میں اس کے ساتھ احسان کروں؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں۔"

تشریح: صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب نبی (ﷺ) نے قریش مکہ سے صلح کی تھی اور حضرت اسماءؓ کی ماں مشرکہ تھی۔ حضرت اسماءؓ نے عرض کیا: قَدِمَتْ عَلَيَّ اُمِّيْ وَ هِيَ رَاغِبَةٌ اَفَاصِلُ اُمِّيَ؟ قَالَ نَعَمْ صِلِيْ اُمَّكِ۔ "میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ دین سے بےزار ہے تو کیا میں اس کے ساتھ احسان کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اپنی ماں کے ساتھ احسان کرو۔ (یعنی حسنِ سلوک سے پیش آؤ)

مطلب یہ ہے کہ مشرکہ ہونے کے باوجود اور اس کے باوجود کہ اسے دینِ حق سے

نفرت ہے۔ وہ تمھاری ماں ہے۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اخلاق انسانی کا تقاضا ہے۔ اسلام انسانی اخلاق مٹانے نہیں، بلکہ اسے اور زیادہ محکم کرنے آیا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: حُلِبَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ شَاةٌ دَاجِنٌ وَ شِيْبَ لَبَنُهَا بِمَآءٍ مِّنَ الْبِئْرِ الَّتِیْ فِیْ دَارِ اَنَسٍؓ فَاُعْطِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْقَدَحَ فَشَرِبَ مِنْهُ وَ عَلٰی یَسَارِهٖ اَبُوْبَكْرٍؓ وَ عَنْ یَّمِیْنِهٖ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ عُمَرُؓ: اَعْطِ اَبَا بَكْرٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَعْطَی الْاَعْرَابِیَّ الَّذِیْ عَنْ یَّمِیْنِهٖ ثُمَّ قَالَ: اَلْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنُ وَ فِیْ رِوَایَةٍ: اَلْاَیْمَنُوْنَ اَلْاَیْمَنُوْنَ، اَلَا فَیَمِّنُوْا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے گھر کی پلی ہوئی بکری کا دودھ دوہا گیا پھر اس میں اس کنویں کا پانی ملایا گیا جو انسؓ کے گھر میں تھا۔ پھر (دودھ کا) پیالہ رسولِ خدا ﷺ کو دیا گیا۔ آپؐ نے اس میں سے کچھ پیا۔ اس وقت آپؐ کے بائیں جانب ابوبکرؓ تھے اور آپؐ کے دائیں طرف ایک دیہاتی شخص تھا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (بچا ہوا دودھ) ابوبکرؓ کو عنایت فرمائیں۔ آپؐ نے اسے اس دیہاتی کو دے دیا جو آپؐ کے دائیں جانب تھا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''دایاں مقدم ہے پھر دایاں (یعنی پھر جو اس کے قریب ہو)'' ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''دائیں جانب کے مقدم ہیں، دائیں جانب کے مقدم ہیں۔ سن لو، پس دائیں طرف والوں کو دیا کرو۔''

تشریح: حضرت انسؓ نے وضعِ مظہر موضعِ مضمر کے طور پر اپنا نام لیا، ورنہ وہ کہہ سکتے تھے کہ اس دودھ میں اس کنوئیں کا پانی ملایا گیا جو میرے گھر میں تھا۔ بکری بھی حضرت انسؓ کے گھر میں تھی۔ نبی (ﷺ) ان کے یہاں تشریف لے گئے تھے۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اوّل اس کو دیا جائے جو داہنی طرف ہو اور پھر اس شخص کو جو اس کے پہلو میں ہو دیا جائے۔ اور اسی طرف سے اور اسی ترتیب کے ساتھ چیز دی جائے یہاں تک کہ اس شخص تک نوبت پہنچے جو بائیں طرف ہو۔

حضرت ابوبکرؓ کے قرب اور ان کی فضیلت کے باوجود اور اس کے باوجود کہ حضرت عمرؓ نے ان کے حق میں اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی آپؐ نے اعرابی (دیہاتی) کو مقدم قرار دیا اس لیے کہ وہ آپؐ کے دائیں جانب پڑتا تھا۔ اس سے آپؐ کے کمالِ عدل اور حق شناسی کا پتہ چلتا ہے۔

دائیں جانب کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کا حتی الوسع خیال رکھنا چاہیے۔ عام زندگی کے اس طرح کے معاملات بھی جو بہ ظاہر غیر اہم اور چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جو ان چھوٹے امور میں حق شناس ثابت نہ ہو اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑے امور میں حق اور انصاف پر قائم رہ سکے گا۔ آدمی کی تربیت درحقیقت زندگی میں چھوٹی چھوٹی چیزوں ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

زبان کی حفاظت

⟨۱⟩ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ الْعَبْدَ لَیَتَکَلَّمُ بِالْکَلِمَةِ مَا یَتَبَیَّنُ فِیْهَا یَزِلُّ بِهَا فِی النَّارِ اَبْعَدَ مِمَّا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے سنا: ''بعض اوقات بندہ ایسی بات زبان پر لاتا ہے جس کے نتیجہ پر وہ غور نہیں کرتا اور اس کی وجہ سے وہ پھسل کر دوزخ میں جا پڑتا ہے حالانکہ وہ اس سے اتنی دور ہوتا ہے جتنی دوری مشرق و مغرب کے درمیان پائی جاتی ہے۔''

تشریح: صحیح مسلم میں یہ الفاظ آئے ہیں: یَنْزِلُ بِهَا فِی النَّارِ اَبْعَدَ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ ''اس کی وجہ سے وہ دوزخ میں گر جاتا ہے اتنی دوری سے بھی زیادہ فاصلہ سے جتنی دوری مشرق و مغرب کے درمیان پائی جاتی ہے۔'' یعنی وہ جہنم کی انتہائی گہرائی میں جا پڑتا ہے۔

زبان سے نازیبا اور ناپسندیدہ بات کہنے میں کوئی وقت نہیں لگتا لیکن آدمی خدا کی نگاہ سے گر جاتا ہے اور وہ قعر جہنم میں جا گرتا ہے۔ یہ لغزش کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ اس سے ہم بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں انسان کی پوزیشن کتنی نازک ہے۔ ذرا سی غفلت اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ انسان کو خدا نے جو عزت عطا کی ہے اس کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے حتیٰ کہ وہ اپنی زبان پر کوئی ایسی بات لانے کا بھی روادار نہ ہو جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ اگر وہ اس معاملہ میں بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو اس سے خود اسی کی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ خواہ اسے اس کا شعور و احساس ہو یا نہ ہو۔ یہ بے شعوری خود ایک سنگین قسم کا جرم ہے جسے حقیقت نظر انداز نہیں کرسکتی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ الْعَبْدَ لَیَقُوْلُ الْکَلِمَةَ لَا یَقُوْلُهَا اِلَّا لِیُضْحِکَ بِهِ النَّاسَ یَهْوِیْ بِهَا اَبْعَدَ مِمَّا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَ اِنَّهٗ لَیَزِلُّ عَنْ لِّسَانِهٖ اَشَدَّ مِمَّا یَزِلُّ عَنْ قَدَمِهٖ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بعض اوقات بندہ ایسی بات کہتا ہے جس کے کہنے سے اس کی غرض محض لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ (دوزخ میں) گرتا ہے اتنی دوری سے جتنی دوری کہ زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اور وہ اپنی زبان کے سبب سے اس سے کہیں زیادہ شدّت سے پھسلتا ہے جتنا وہ اپنے قدم سے پھسلتا ہے۔“

تشریح: یعنی قدم کا پھسلنا اتنا زیادہ اندیشہ ناک نہیں ہوتا جتنا زبان کا پھسلنا آدمی کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ قدم کے پھسلنے سے آدمی زمین پر گر سکتا ہے۔ اسے جسمانی چوٹ آسکتی ہے لیکن زبان کی لغزش آدمی کی شخصیت ہی کو مجروح کر دیتی ہے اور ہم کسی کے لیے اس سے بڑے کسی نقصان کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

A slip of the Foot you may soon recover.
But a slip of the Tongue you may never get over.

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ صَمَتَ نَجَا۔

(احمد، ترمذی، دارمی، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس نے خاموشی اختیار کی وہ نجات پا گیا۔“

تشریح: بے شمار فتنے ایک زبان کی وجہ سے اٹھتے ہیں۔ یہ زبان آدمی کو جہنم تک کی سیر کراتی ہے۔ آدمی اوندھے منہ دوزخ میں گرتا ہے۔ کہا بھی گیا ہے: اَللِّسَانُ جِرْمُهٗ صَغِیْرٌ وَ جُرْمُهٗ کَبِیْرٌ۔ (زبان کا عضو چھوٹا ہوتا ہے لیکن اس کے جرم و گناہ بھاری اور بہت ہوتے ہیں)۔ کذب، غلط بیانی اور فضول گوئی کی تو دین میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن وہ باتیں جو مفید ہوتی ہیں ان میں بھی ریا، نمائش، تصنع وغیرہ کتنی ہی آفات کی آمیزش کا خدشہ پایا جاتا ہے۔ خاموشی بے شمار آفتوں اور مصیبتوں سے آدمی کو نجات دلاتی ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: تُوُفِّیَ رَجُلٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ فَقَالَ رَجُلٌ: اَبْشِرْ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَوَلاَ تَدْرِیْ فَلَعَلَّهٗ تَكَلَّمَ فِيْمَا لاَ يَعْنِيْهِ اَوْ بَخِلَ بِمَا لاَ يَنْقُصُهٗ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا۔ایک شخص نے (میت کو خطاب کرتے ہوئے) کہا کہ تجھے جنت کی بشارت ہو۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''کیا تو یہ بات کہتا ہے اور حقیقتِ حال کی تجھے مطلق خبر نہیں۔شاید اس نے لایعنی بات کی ہو یا اس چیز میں بخل کیا ہو جس میں اس کا کوئی نقصان نہ تھا۔''

تشریح: یعنی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جس کو تو جنت کی خوش خبری دے رہا ہے اس سے کوئی مواخذہ ہو رہا ہو۔ اور اس کے جنت میں جانے میں مشکلیں اور دشواریاں پیش آ گئی ہوں۔ یہ دشواری کفر و شرک کی وجہ سے ہی پیش نہیں آتی بلکہ وہ چیزیں بھی آدمی اور اس کی جنت کے درمیان روک بن سکتی ہیں جن کو لوگ معمولی سمجھتے ہیں۔ کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ اس نے کچھ اور نہیں تو لایعنی اور فضول گفتگو ہی کی ہو اور ایسی چیزوں میں بخل سے کام لے کر اپنی تنگ دلی کا ثبوت دیا ہو جن میں بخل سے کام لینے کی مادی اعتبار سے بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً کشادہ روئی سے لوگوں سے ملنا، سلام کرنا، صحیح مشورے دینا۔ کسی کو پانی پلا دینا وغیرہ۔ جنت تو نہایت بلند، کشادہ اور پاک مقام ہے۔ اس میں کسی پستی، تنگی، تاریکی اور کثافت کے لیے کوئی گنجائش کیوں کر نکل سکتی ہے۔

بَخِلَ بِمَا لاَ يَنْقُصُهٗ (اس چیز میں بخل کیا ہو جس میں اس کا کوئی نقصان نہ تھا) کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اس صدقہ کے دینے میں بخل کیا جو اس پر واجب تھا، جس کے دینے سے مال میں برکت ہی ہوتی، کمی نہ ہوتی جیسا کہ قرآن میں ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ (السبا:۳۹) ''اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو وہ اس کا بدلہ دے گا۔'' حضور (ﷺ) کا ارشاد ہے: وَمَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ (مسلم) ''صدقہ سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی۔''

﴿۵﴾ وَ عَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِیِّؓ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَآ اَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَیَّ؟ قَالَ: فَاَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهٖ وَ قَالَ: هٰذَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، جن چیزوں کو آپؐ میرے لیے خوف ناک خیال فرماتے ہیں ان میں سب سے زیادہ

خوف ناک کون سی چیز ہے؟ حضرت سفیانؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: ''یہ''

تشریح: زبان کے غلط استعمال سے جو فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اس کی قیامت خیزی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ جو زبان سے ادا ہوتا ہے اپنی تاثیر کے لحاظ سے شہد بھی ہے اور زہر بھی ہے۔ اس کا انحصار درحقیقت اس شخص پر ہے جو زبان سے الفاظ ادا کرتا ہے۔ اس لیے آدمی کو زبان کے معاملے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی الفاظ ہیں جو دلوں کو جوڑتے بھی ہیں اور دلوں کو توڑتے بھی ہیں۔ انسانوں کو باہم ملانے کا کام بھی کرتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے دور اور متنفّر بھی کرتے ہیں۔ یہ رلاتے بھی ہیں اور ہنساتے بھی ہیں۔ ان سے جذبات کو مشتعل کرنے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور یہ جذبات کو سرد بھی کرسکتے ہیں۔ کبھی آدمی کی زبان اس کا قلم ہوتا ہے۔ نپولین نے کہا ہے کہ اگر سلاطین بوربن (Bourbon Kings) فرانس کے طاقت ور اہل قلم کو قابو میں رکھتے تو دولت بوربن (House of Bourbon) کا ایسا عبرت ناک حشر ہرگز نہ ہوتا۔

الفاظ کا اثر مسلم ہے خواہ وہ زبان سے ادا ہوں یا قلم کے ذریعہ سے صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوں۔ الفاظ کا غلط استعمال کسی بھی ستم سے کم نہیں ہے۔ اس سے بڑا مجرم کون ہوگا جو خدا کی عطا کردہ قوت کو منشائے خداوندی کے خلاف استعمال کرکے مخلوقِ خدا کو کسی فتنہ میں ڈال دے۔ اور اصلاح کے بہ جائے انسانی معاشرہ کو فساد اور بگاڑ سے بھر دے۔

ہماری زبان ہمارے باطن کی سب سے بڑی عکّاس ہے۔ ہمارے الفاظ بتاتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ایک فقرہ جو بے خیالی میں بھی زبان پر آتا ہے وہ ہمارے شعور یا تحت الشعور کا ترجمان ہوتا ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ہم اپنے الفاظ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دے رہے ہوتے ہیں وہ ہم کو عظیم المرتبت لوگوں میں شامل کررہے ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایک بری بات جو ہماری زبان ادا کررہی ہوتی ہے اور ہمیں اس کی برائی کا خیال بھی نہیں ہوتا یا ہم اسے ایک ہلکی اور معمولی بات سمجھ رہے ہوتے ہیں درحقیقت وہ پست ترین لوگوں میں ہماری شمولیت کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زبان کی طرف سے آدمی کو کتنا محتاط رہنا چاہیے۔

یہ مسئلہ تو زبان اور گفتگو کا تھا۔اسی پر آپ اعمال کے بارے میں بھی قیاس کر سکتے ہیں بہت ممکن ہے کہ ایک کام جسے ہم کوئی خاص وزن نہیں دیتے وہ خدا کی رضا کا سبب قرار پائے اور ایک فعل جس میں اپنی بے پروائی کی وجہ سے ہم کوئی قباحت محسوس نہ کرسکیں وہ ہمیں خدا کے غضب کا مستحق بنادے۔

〈۶〉 وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَ یَدِہٖ وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَا نَھَی اللّٰہُ عَنْہُ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلم وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔اور مہاجر (صحیح معنی میں) وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے روکا ہے۔''

تشریح: مسلم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی خدا کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کے بندوں کے حقوق کا بھی پاس ولحاظ رکھے۔زندگی میں بندوں کے حقوق ادا کرنا وہ خاص کسوٹی ہے جس سے کسی بھی شخص کی ایمانی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔جس کسی شخص کی زبان اور ہاتھ سے خود اس کے بھائیوں کی عزت اور ان کے اموال وغیرہ محفوظ نہ رہیں وہ صحیح معنی میں مسلم نہیں بن سکا ہے،خواہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا نہایت زوروشور سے اعلان کرتا پھرتا ہو۔

خدا کے دین کے لیے گھر بار چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہوجانے کو ہجرت کہتے ہیں۔ مہاجر کی دین میں ایک خاص حیثیت ہے۔لیکن حضور (ﷺ) کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس ہجرت کے سوا بھی ایک ہجرت ہے اور وہی حقیقی ہجرت ہے۔اس ہجرت میں بہ ظاہر نہ تو گھر بار ترک کرنا پڑتا ہے اور نہ کہیں منتقل ہوکر جانا ہوتا ہے لیکن وہ ایک اہم ہجرت ہے۔اور وہ ہے برائیوں کو چھوڑنا اور ان باتوں کو ترک کردینا جن سے خدا نے روکا ہے۔یہ مکان کی تبدیلی نہیں، سیرت وکردار میں انقلاب ہے۔ایک عظیم انقلاب!

〈۷〉 وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنَّ فُلَانَۃَ تُذْکَرُ مِنْ کَثْرَۃِ صَلَاتِھَا وَ صِیَامِھَا وَ صَدَقَتِھَا غَیْرَ اَنَّھَا تُؤْذِیْ جِیْرَانَھَا بِلِسَانِھَا، قَالَ: ھِیَ فِی النَّارِ، قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنَّ فُلَانَۃَ تُذْکَرُ قِلَّۃُ صِیَامِھَا وَ صَدَقَتِھَا وَ صَلٰوتِھَا وَ

اِنَّهَا تَصَدَّقُ بِالْاَثْوَارِ مِنَ الْاَقِطِ وَلاَ تُؤْذِیْ بِلِسَانِهَا جِیْرَانَهَا، قَالَ: هِیَ فِی الْجَنَّةِ۔ (احمد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، فلاں عورت کی نماز، اس کے روزے اور اس کے صدقہ وخیرات کی بڑی شہرت ہے، مگر اس میں ایک عیب بھی ہے۔ وہ اپنے ہم سایوں کو اپنی زبان سے اذیّت پہنچاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''وہ دوزخ میں ہے۔'' اس نے کہا کہ یا رسول اللہؐ، فلاں عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے یہاں روزے، صدقے اور نماز کی کثرت نہیں، وہ پنیر کے چند ٹکڑے صدقہ کرتی ہے لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کو اپنی زبان سے کوئی تکلیف اور اذیت نہیں پہنچاتی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''وہ جنت میں ہے۔''

تشریح: عام نگاہوں میں اصل اہمیت نماز اور صدقہ یعنی بدنی اور مالی عبادت کی ہوتی ہے۔ عام لوگ معاملات، حسنِ اخلاق اور معاشرتی آداب کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اس حدیث میں ایک بڑے مغالطہ کو دور فرمایا گیا ہے۔ عبادت اور پرستش ذات بے نیاز کا حق ہے اور حسنِ معاملہ انسانوں کے حقوق میں سے ہے جو بے نیاز نہیں۔ ضرورت مند اور ہماری توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ خدا سے متعلق فرائض وواجبات کے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ بندگانِ خدا کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس سے غفلت حد درجہ خطرناک ہے۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لینے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ نیکی خواہ کوئی بھی ہو جب تک وہ ہماری بہترین سیرت کا مظہر نہ ہو حقیقت کی نگاہ میں اس کا کوئی بھی وزن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عورت جو نماز بھی پڑھتی تھی، روزے رکھتی تھی، صدقہ اور خیرات بھی دیتی تھی اس کو اس کی یہ عبادتیں جہنم سے نہ بچا سکیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان عبادتوں کے باوجود وہ نیک سیرت نہ تھی۔ سیرت وکردار کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہوتا ہے۔ اس لیے بہترین اور پسندیدہ سیرت کا حامل ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے کسی بھی حصہ میں برا ثابت نہ ہو۔ اسے ہم کہیں بھی ظلم اور زیادتی کا مرتکب نہ پائیں، بلکہ وہ ہر معاملہ میں خواہ اس کا تعلق خدا سے ہو یا اس کے بندوں سے، عدل وانصاف پر قائم رہے۔ ایک طرف وہ خدا کا وفادار

ہوتو دوسری طرف بندگانِ خدا کا خیر خواہ اوران کی فلاح اور بھلائی کا خواست گار ہو۔ وہ کسی کے لیے مصیبت اوراذیّت کا سبب نہ بنے۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ رَفَعَهٗ قَالَ: اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَآءَ کُلَّهَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اِتَّقِ اللّٰهَ فِیْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِکَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا وَ اِنْ اِعْوَجَجْتَ اِعْوَجَجْنَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ مرفوعًا روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ’’ابنِ آدم جب صبح کرتا ہے تو جسم کے سارے ہی اعضاء زبان کے سامنے عاجزی کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے معاملہ میں خدا سے ڈر، کیوں کہ ہم تیرے ساتھ وابستہ ہیں، اگر تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو نے کج روی اختیار کی تو ہم بھی کج رو ثابت ہوں گے۔‘‘

تشریح: یعنی ہر صبح کو بہ زبانِ حال سبھی اعضا زبان سے درخواست کرتے ہیں کہ درست رہ اور بے باکی سے نہ چل کہ ہم سب تیری وجہ سے گرفتارِ بلا ہوں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ سارے اعضا کی درستی کا انحصار دل کی درستی پر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: اِذَا صَلُحَ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ۔ ’’جب دل درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو پورے جسم میں بگاڑ آ جاتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں حقیقت کی رو سے کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اصل تو دل ہے لیکن ظاہر میں زبان اس کی قائم مقام، نمائندہ اور خاص ترجمان ہوتی ہے۔ اس لیے دونوں ہی کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ ٹھیک ہیں تو سب ٹھیک ہیں اور اگر ان میں فساد اور بگاڑ آ گیا تو پھر آدمی کا گرفتارِ بلا ہونا ناگزیر ہے۔

﴿۹﴾ وَ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ لَقِیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ مَا النَّجَاةُ؟ فَقَالَ: اَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ وَلْیَسَعْکَ بَیْتُکَ وَابْکِ عَلٰی خَطِیْئَتِکَ۔

(احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’اپنی زبان پر قابو رکھو اور چاہیے کہ تمھارے لیے تمھارے گھر میں گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔‘‘

تشریح: زبان آدمی کی شخصیت کی ترجمان ہوتی ہے۔ کوئی آدمی کیا ہے؟ یہ اس کے چند بول بتا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک بیمار کی آواز بتاتی ہے کہ اس کی جسمانی صحت ٹھیک ہے یا نہیں۔ اسی طرح آدمی کی آواز یہ بھی خبر دیتی ہے کہ اس کی اندرونی صحت کیسی ہے۔ آدمی کی شخصت اس کی تصویر سے کہیں زیادہ اس کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اپنی زبان کی طرف سے آدمی غافل نہ رہے۔ زبان کو قابو میں رکھے۔ اور بے جا چلنے سے اسے روکے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ آدمی اپنی گفتگو کے ذریعہ سے اپنے آپ کو عیاں کرتا ہے اگر وہ زبان کو جا بے جا ہر جگہ استعمال کرتا ہے تو یہ اس کے سطحی ہونے کی واضح دلیل ہے۔ زبان کی حفاظت میں بڑی حکمتیں ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے زبان پر قابو رکھتا ہے تو یہ علامت ہے کہ:

۱- وہ معتدل المزاج اور حلیم اور بردبار شخص ہے۔

۲- یہ چیز باعثِ زینت اور وقار میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

۳- ایسے شخص کو سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کے قیمتی مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں بلکہ ایسے شخص کے دل میں حکمت کے چشمے بھی جاری ہو سکتے ہیں۔

۴- دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنی اس کے لیے مشکل نہ ہوگی۔ زبان پر اگر قابو نہیں ہے تو آدمی اپنی ہی کہے جائے گا۔ دوسروں کو بولنے کا موقع نہ دے گا۔ یہ صریح حق تلفی اور دل شکنی کی بات ہے۔

۵- ایسا شخص غیبت، بدگوئی اور لغو باتوں سے بہ آسانی بچ سکے گا۔

۶- ایسا شخص فضول اور لغو باتوں کے سننے سے بھی احتراز کرے گا۔

۷- اس کی ساری قوت گفتار میں صرف نہ ہوکر کردار کی تعمیر میں صرف ہو سکے گی۔

۸- جب وہ زبان پر قابو رکھے گا تو یہی چیز اسے اس بات پر بھی آمادہ کرے گی کہ وہ اپنے دوسرے اعضاو جوارح اور قوتوں کے استعمال میں محتاط ہو۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایمان کا تقاضا صرف دل کی نگہ بانی سے ہی پورا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر پہلو کو نگاہ میں رکھے اور اُسے اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی سرے سے گفتگو ہی نہ کرے۔ حدیث کا منشا یہ ہے کہ آدمی بلا ضرورت بات نہ کرے، نہ غلط بات زبان پر لائے اور نہ فضول گوئی اور بسیار گوئی کے امراض میں مبتلا ہو۔

ہم جو کچھ بولتے، پڑھتے اور سنتے ہیں اس کا دل پر اثر مرتب ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ اثرات دل پر اپنی ہی گفتگو کے مرتب ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہیں۔ یہ محاسبہ اعمال اور گفتگو تک محدود نہ ہو بلکہ اپنے قلوب کا بھی جائزہ لیتے رہیں۔ ہم یہ دیکھتے رہیں کہ ہمارے قلب کی کیا حالت ہے۔ اس میں صحیح ایمانی کیفیات کا نشو ونما ہو رہا ہے یا نہیں۔ ایمانی کیفیات مومن کے لیے خدا کے نقد انعام اور عطیہ ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تمھیں اپنے گھر اور اپنے اہل و عیال سے کوئی خاص دل چسپی نہ ہو۔ باہر کے کاموں سے فارغ ہو تو اپنے گھر کے کام کاج کو بھی دیکھو۔ اور اہلِ خانہ کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دو۔ بے ضرورت باہر گھومتے پھرتے رہنا کتنی ہی برائیوں اور فتنوں کا پیش خیمہ بن جاتا اس سے تمھیں بے خبر نہ ہونا چاہیے۔ تمھارا گھر تمھارے لیے سامانِ سکون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادھر ادھر وقت گزارنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ تم کو گھر کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہے۔

''اپنے گناہوں پر رویا کرو۔'' یہ بہترین تعلیم ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہوں پر نظر ڈالو۔ خاص طور سے فارغ اوقات میں اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا جائزہ ضرور لو اور خدا کے حضور اشک باری اور گریہ وزاری کر کے انھیں معاف کرانے کی فکر کرو۔

﴿۱۰﴾ وَ عَنْ مُعَاذٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ يُّدْخِلُنِی الْجَنَّةَ وَ يُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ: لَقَدْ سَاَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِيْمٍ وَ اِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰی مَنْ يَّسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ، تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا وَ تُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَ تُؤْتِی الزَّكٰوةَ وَ تَصُوْمُ رَمَضَانَ وَ تَحُجُّ الْبَيْتَ ثُمَّ قَالَ: اَلَآ اَدُلُّكَ عَلٰی اَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ وَّالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ وَ صَلٰوةُ الرَّجُلِ فِیْ جَوْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ تَلَا: تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ حَتّٰی بَلَغَ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلَآ اَدُلُّكَ بِرَاْسِ الْاَمْرِ وَ عُمُوْدِهٖ وَ ذُرْوَةِ سَنَامِهٖ؟ قُلْتُ: بَلٰی يَا رَسُوْلَ

اللّٰہِ، قَالَ: رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَ عُمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ وَ ذُرْوَۃُ سَنَامِہِ الْجِھَادُ، ثُمَّ قَالَ: اَلَا اُخْبِرُکَ بِمِلَاکِ ذٰلِکَ کُلِّہِ؟ قُلْتُ: بَلٰی یَا نَبِیَّ اللّٰہِ فَاَخَذَ بِلِسَانِہِ فَقَالَ: کُفَّ عَلَیْکَ ھٰذَا، فَقُلْتُ: یَا نَبِیَّ اللّٰہِ وَ اِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَکَلَّمُ بِہِ قَالَ: ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا مُعَاذُ وَ ھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ اَوْ عَلٰی مَنَاخِرِھِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِھِمْ۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت معاذؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے (ایک بار) عرض کیا کہ یارسول اللہؐ، آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیں جو جنت میں لے جائے اور دوزخ سے دور رکھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم نے ایک بہت بڑی بات پوچھی ہے۔ مگر (بڑی اور بھاری ہونے کے باوجود) وہ اس شخص کے لیے آسان ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو آسان کردے (اور اسے اس کی توفیق دے دے) اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رمضان کے روزے رکھو اور خانۂ کعبہ کا حج کرو۔'' پھر آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں خیر کے دروازے بھی بتادوں؟ روزہ سپر اور ڈھال ہے اور صدقہ گناہ (سے پیدا ہونے والی آگ) کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اور کسی شخص کی وہ نماز جو وہ رات کے درمیانی حصے میں ادا کرے (یعنی اس کا بھی یہی حال ہے۔ اور ابوابِ خیر میں اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔)'' پھر آپؐ نے تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ کی تلاوت یَعْمَلُوْنَ تک فرمائی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں اصل امر کا سر وستون اور اس کی بلند چوٹی بھی نہ بتادوں؟'' حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں یارسول اللہ، آپؐ ضرور ہمیں بتائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''راس الامر تو اسلام ہے۔ اور اس کا ستون نماز اور اس کی بلند چوٹی جہاد ہے۔'' پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تمھیں وہ چیز نہ بتادوں جس پر ان میں سے ہر ایک کا مدار ہے۔'' حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں اے اللہ کے نبیؐ، آپؐ ضرور بتائیں۔ آپؐ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: ''اس کو روکو۔'' میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبیؐ، ہم جو کچھ بولتے ہیں کیا اس پر بھی ہم سے مواخذہ ہوگا؟ فرمایا: ''تجھے گم کرے تیری ماں اے معاذ! لوگوں کو دوزخ میں ان کے منہ کے بل یا ان کی ناکوں کے بل ان زبانوں کی بے باکیاں ہی گرائیں گی۔''

تشریح: آیتیں آپؐ نے یہ تلاوت فرمائیں: تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَo فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ ج جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَo (السجدہ ۳۲: ۱۶-۱۷) ’’ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کو خوف اور طمع سے پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا اسے جو آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پوشیدہ رکھی گئی ہے ان کاموں کے صلے میں جو وہ کرتے تھے۔‘‘

ان آیتوں سے نمازِ تہجد کی فضیلت و اہمیت بہ خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لیے آپؐ نے اپنی بات کی تائید میں ان آیتوں کی تلاوت فرمائی۔

اسلام کو راس الامر یعنی دین کا سر کہا۔ آدمی کے اعمال و اخلاق بہ ظاہر کتنے ہی درست کیوں نہ ہوں اگر اسلام پر اس کا ایمان نہیں ہے تو پھر اس کے اخلاق اور اعمالِ نیک کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دھڑ تو ہو مگر سر نہ ہو۔ ایسا دھڑ خواہ وہ کتنا ہی خوب صورت ہو کس کام کا ہوسکتا ہے جو بے سر کا ہو۔

جس دین کا قیام اسلام میں مطلوب ہے وہ نماز کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔ جس طرح کسی عمارت کے لیے ستون درکار ہوتا ہے کیوں کہ ستون کے بغیر عمارت کھڑی نہیں ہوتی۔ اسی طرح دین کی عمارت بھی تعمیر نہیں ہوسکتی اور نہ قائم رہ سکتی ہے جب تک نماز کا ستون اس کے لیے فراہم نہ کیا جائے۔

دین ایک نظامِ حیات ہے۔ اس نظام کی اصل روح توحید اور بندگیِ رب ہے۔ نماز عین خدا پرستی اور خدا کی طلب ہے۔ اس طلب اور جذبۂ عبدیت کے بغیر اس نظامِ حق کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس کی طرف قرآن نے دنیا والوں کو دعوت دی ہے۔

اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دینِ حق کی سربلندی چوں کہ جہاد پر موقوف ہے اسی لیے جہاد کو بلند ترین چوٹی سے تعبیر فرمایا گیا۔

یہ سارے ہی اعمال اکارت ہیں اگر زبان کی حفاظت نہ کی گئی۔ زبان کے معاملہ میں احتیاط کس درجہ ضروری ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے حضور (ﷺ) کا یہی ارشاد کافی ہے۔

زبان پر کنٹرول رکھنے میں اگر کوئی شخص کام یاب ہوگیا تو اس سے ہر اس طاعت کی توقع کی جاسکتی ہے جس کی تعلیم اسلام نے اپنے پیروؤں کو دی ہے۔

زبان کے استعمال میں بے احتیاطی ایک عام مرض ہے اور اس مرض میں عوام اور خواص سبھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

''تجھے گم کرے تیری ماں۔'' عربی محاورہ کے لحاظ سے یہ پیار و محبت کے الفاظ ہیں۔ یہ کوئی بددعا نہیں ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ زبان کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ بہ کثرت لوگ زبان کی بے باکیوں کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

خوش گفتاری

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْکَلِمَةُ الطَّیِّبَةُ صَدَقَةٌ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ ہے۔''

تشریح: یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔ بندوں پر خدائے بزرگ و برتر کے بے پایاں احسانات ہیں۔ صدقہ کے ذریعہ سے بندہ اپنے رب کے احسانات کا شکر ادا کرتا ہے۔ صدقہ اظہارِ شکر کا ایک اہم اور خاص ذریعہ ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ شیریں اور عمدہ بات بھی ایک قسم کا صدقہ ہے۔ صدقہ اور خیرات کر کے آدمی ضرورت مندوں کی مدد کرتا اور انھیں آرام پہنچاتا ہے۔ روپے پیسے سے ہی نہیں، اچھی اور عمدہ باتوں سے بھی لوگوں کو فائدے پہنچتے ہیں۔ شیریں گفتاری دلوں کی مسرت کا باعث بھی ہے۔ اس لیے اچھی اور میٹھی باتوں کو صدقہ سے تعبیر کرنا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

گفتگو میں متانت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَا یَنْبَغِیْ لِصِدِّیْقٍ اَنْ یَّکُوْنَ لَعَّانًا۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ صدیق کی شایانِ شان نہیں کہ وہ زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔“

تشریح: صدیقیت ایک اونچا مقام ہے۔ صدیقین کا اخلاق نبیوں کے اخلاق کے مشابہ ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء دنیا میں رحمت بن کر آتے ہیں۔ انھیں اس سے دل چسپی نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں پر لعنت کرتے پھریں۔ لوگوں کو رحمتِ الٰہی سے دور پھینکنا ان کے لیے کوئی دل چسپ مشغلہ نہیں ہوتا۔ ان کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ حق سے قریب اور رحمتِ الٰہی کے امیدوار ہوں۔ انبیاء علیہم السلام کے اسی طریقہ کی پیروی کرنی صدیقین کا شیوہ ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَکَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَکُهُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی شخص یہ کہے کہ ہلاک ہوئے لوگ، تو سب سے بڑھ کر وہ خود ہلاک ہونے والا ہے۔“

تشریح: بالعموم لوگ ایک طرح کے عجب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انھیں خود اپنے عیوب اور کم زوریاں نظر نہیں آتیں۔ وہ دوسروں کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے ہیں۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھنے میں ان کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے لیکن ان کو اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ حقیقت میں عجب و رعونت کے شکار ہوتے ہیں۔ حالانکہ انھیں لوگوں کا غم خوار اور خیر خواہ ہونا چاہیے تھا۔ ان کی کوشش تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ لوگوں کو رحمتِ حق سے مایوس کرنے کے بہ جائے ان کی اصلاح کے لیے فکر مند ہوں۔ لیکن اس کے برعکس لوگوں کی غفلت پر متاسف اور رنجیدہ ہونے کے بہ جائے ان کو جہنم رسید کرنے ہی میں ان کی ساری دل چسپی ہوتی ہے۔ ایسی فطرت کے لوگوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ خود سب سے بڑھ کر ہلاکت سے دو چار ہونے والے ہیں جس کا انھیں مطلق احساس نہیں ہے۔ البتہ اگر امورِ دین میں لوگوں کی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے تحذیراً کسی نے هَلَکَ النَّاسُ (لوگ ہلاکت میں پڑ گئے) کہا تو اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے کہ سب سے زیادہ وہ خود ہلاک ہونے والا ہے۔

فَهُوَ اَهْلَکُهُمْ بہ صیغۂ تفضیل کے بہ جائے بہ صیغۂ ماضی یعنی فَهُوَ اَهْلَکَهُمْ (پس اس نے انھیں ہلاک کیا) بھی آیا ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کہہ کر کہ لوگ

ہلاک ہوئے آدمی ان کی خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ ان کو شکستہ دل کر کے وہ انھیں واقعی ہلاکت میں ڈالنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ انھیں مایوس کر کے ان سے شوق اور جذبۂ طاعت چھین لینا چاہتا ہے۔ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ جب ہم لوگوں کو معاصی میں مبتلا دیکھیں تو حکمت کے طور پر انھیں طاعت رب کی طرف بلائیں اور ان کے اندر طاعت و بندگی کی رغبت اور رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کا ذوق و شوق پیدا کریں تاکہ وہ غفلت سے باز آئیں اور خدا کی رحمتوں کے امیدوار ہوسکیں۔

طہارتِ زبان اور پاکیزہ زندگی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَذَکَرَ الْحَدِیْثَ بِطُوْلِہٖ اِلٰی اَنْ قَالَ قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوْصِنِیْ قَالَ: اُوْصِیْکَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ اَزْیَنُ لِاَمْرِکَ کُلِّہٖ۔ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: عَلَیْکَ بِتِلَاوَۃِ الْقُرْاٰنِ وَ ذِکْرِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّہٗ ذِکْرٌ لَّکَ فِی السَّمَآءِ وَ نُوْرٌ لَّکَ فِی الْاَرْضِ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: عَلَیْکَ بِطُوْلِ الصَّمْتِ فَاِنَّہٗ مَطْرَدَۃٌ لِّلشَّیْطَانِ وَ عَوْنٌ لَّکَ عَلٰی اَمْرِ دِیْنِکَ، قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: اِیَّاکَ وَ کَثْرَۃَ الضِّحْکِ فَاِنَّہٗ یُمِیْتُ الْقَلْبَ وَ یُذْھِبُ بِنُوْرِ الْوَجْہِ۔ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: قُلِ الْحَقَّ وَ اِنْ کَانَ مُرًّا۔ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: لَا تَخَفْ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ قُلْتُ: زِدْنِیْ۔ قَالَ: لِیَحْجُزْکَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُ مِنْ نَّفْسِکَ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد (وہ یا ان سے روایت کرنے والے راوی نے) ایک طویل حدیث بیان کی۔ (جو یہاں مذکور نہیں) اسی سلسلے میں بیان کیا کہ میں نے (حضرت ابوذرؓ نے) عرض کیا کہ یارسول اللہ آپؐ مجھے وصیت و نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، کیوں کہ وہ تمھارے تمام کاموں کو بہت ہی سنوارنے اور زینت بخشنے والا ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ مزید آپؐ مجھے وصیت فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم قرآن کی تلاوت اور اللہ عزوجل کے ذکر کو اپنے لیے لازم قرار دے لو۔

کیوں کہ یہ آسمان میں تمھارے ذکر کا موجب ہوگا اور زمین میں تمھارے لیے نور ثابت ہوگا۔'' میں نے عرض کیا کہ آپؐ مجھے کچھ اور وصیت فرمائیں، آپؐ نے فرمایا: ''زیادہ خاموش رہنے کو اپنا شعار بنالو، کیوں کہ یہ چیز شیطان کو دفع کرنے والی اور تمھارے دین کے معاملہ میں تمھاری مددگار ہوتی ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ آپؐ مجھ کو مزید وصیت و نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''زیادہ ہنسنے سے بچو، کیوں کہ یہ چیز دل کو مردہ اور چہرے کے نور کو زائل کر دیتی ہے۔'' میں نے گزارش کی کہ آپؐ مجھے اور نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''حق اور سچی بات کہو، اگرچہ تلخ ہو۔'' میں نے عرض کیا کہ آپؐ مجھے مزید وصیت فرمائیں آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروانہ کرو۔'' میں نے عرض کیا کہ آپؐ مجھ کو اور نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو کچھ تم اپنے بارے میں جانتے ہو چاہیے کہ وہ تمھیں لوگوں کے عیبوں کے پیچھے پڑنے سے باز رکھے۔''

تشریح: آں حضرت (ﷺ) نے پہلی وصیت اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے اور اس سے ڈرتے رہنے کی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ خدا کا تقویٰ تمھارے سارے کاموں کو خواہ ان کا تعلق امورِ دین سے ہو یا دنیا سے، سنوار دے گا۔

آدمی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتا ہے خواہ وہ کام دین کا ہو یا دنیا کا کوئی کام ہو۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کاموں میں کام یابی حاصل ہو۔ یہاں بتا دیا گیا کہ اگر کوئی شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اس سے اس کے سارے ہی کام درست ہو جائیں گے۔ تقویٰ خوف اور پاس و لحاظ یا ہوش مندی کو کہتے ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ احساس ذمّہ داری اور ہوش مندی کے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام نہیں پا سکتا۔ اسی لیے ہر ایک کو عملی زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرنی ہوتی ہے۔ کاروباری آدمی اپنے کاروبار کے نفع و نقصان ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ وہ ایسی تدابیر اختیار کرتا ہے جس سے اس کے کاروبار میں گھاٹا نہ ہو بلکہ وہ نفع کما سکے۔

اہلِ ایمان کے یہاں بھی ہوش مندی اور احساس ذمہ داری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اہلِ دنیا اور خدا سے بے گانہ لوگ دنیا ہی کو اپنا قبلۂ مقصود جانتے ہیں۔ وہ بس ظاہر کو دیکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے لیکن اہلِ ایمان ظاہر ہی کو نہیں بلکہ اس کے پیچھے کارفرما اصل حقیقت پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک

عظیم ہستی اس کارخانۂ حیات کو ایک عظیم مقصد کے تحت چلا رہی ہے۔ وہ اس کو بھی جانتے ہیں کہ جس طرح آج کا ایک کل بھی ہے ٹھیک اسی طرح اس دنیا کی ایک آخرت بھی ہے جس سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا۔ اس لیے اہلِ ایمان اپنا رشتہ صرف عالمِ ظاہر سے ہی قائم نہیں کرتے بلکہ وہ اپنا تعلق اس غیبی ہستی سے بھی بلکہ اصلاً اسی سے قائم کرتے ہیں جو اس کارخانہ کو ایک مقصد کے تحت چلا رہی ہے۔

اس طرح مومنین اور غیر مومنین کے نقطۂ نظر میں عظیم فرق واقع ہو جاتا ہے۔ غیر مومن صرف دنیا کے لیے جیتا ہے۔ اس کی ساری تگ و دو دنیا کے لیے ہوتی ہے۔ اہلِ ایمان بھی گرچہ اسی دنیا میں بستے ہیں اور اسی فضا میں سانس لیتے ہیں لیکن ان کا یہاں جینا ایک بڑے مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ وہ خدا کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں اور اس بات کو بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ خدا کی مرضی کا پاس و لحاظ رکھنا ہی وہ واحد طرزِ عمل ہے جس کے ذریعہ سے اپنے حقوق کی بھی حفاظت ممکن ہے۔ اگر ہم خدا کی مرضی کے خلاف چلتے ہیں تو یہ خلاف ورزی صرف منشائے رب کی نہ ہوگی بلکہ اس طرح ہم خود اپنی فطرت، زندگی کی معنویت اور اپنے مستقبل کو بھی تباہ کرلیں گے اور اس کے بعد تو جس چیز کا انتظار کیا جا سکتا ہے وہ دائمی حسرت و یاس اور ہلاکت ہی ہوگی۔

ایک دوسرے پہلو سے بھی اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز کا خالق خدا ہے۔ ہر شے اپنے وجود و بقا میں اسی کی محتاج ہے۔ قرآن میں ہے: اَلَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی o (طٰہٰ: ۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر رہ نمائی کی۔'' ہر چیز کو خدا نے ساخت اور رنگ و روپ دیے اور وہی اسے راہ پر بھی لگاتا ہے۔ پرندوں کو پر بھی اسی کے عطا کردہ ہیں اور ان کو اڑنا اور پرواز کرنا بھی وہی سکھاتا ہے۔ مچھلیوں نے تیرنا اسی سے سیکھا۔ اس کی رہ نمائی حاصل نہ ہو تو نہ تو باغ میں پھول کھل سکیں اور نہ زمین میں کہیں ہم کو ہریالی اور شادابی نظر آئے۔ پھولوں کی مہک بھی جاتی رہے اور بلبل کا نغمہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ ہمارے کاموں میں درستی اور ہماری ذات کی تکمیل بھی خدا کی مرضی کی پیروی ہی سے ممکن ہے۔ اگر خدا کی مرضیات کا پاس و لحاظ رکھا جائے تو اس سے ہمارے دنیوی معاملات بھی درست ہو سکتے ہیں اور اس سے ہماری آخرت کی زندگی بھی سنور سکتی ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں ہم کو خدا کی اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

لیکن حق سے بے گانہ لوگوں کا رویہ تو بس ستم ہوتا ہے۔ وہ خدا سے روگردانی اختیار کر کے مقصدِ حیات کو بھی پامال کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کو بھی ظلم و فساد سے بھر دیتے ہیں۔ جس کا خمیازہ بالآخران کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اور آخرت میں جس دردناک انجام سے وہ دو چار ہوں گے وہ اپنی جگہ ایک ایسی بڑی مصیبت ہے جو کسی کے ٹالے نہ ٹلے گی۔ اپنی دوسری وصیت میں یہ جو فرمایا کہ ''یہ (ذکر اور تلاوت قرآن) آسمان میں تمھارے ذکر کا موجب ہوگا اور زمین میں تمھارے لیے نور ثابت ہوگا'' تو درحقیقت اس میں تلاوتِ قرآن مجید اور ذکر اللہ کے اثرات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عالمِ بالا اور ملاءِ اعلیٰ کا ہماری دنیا سے بھی گہرا ربط و تعلق ہے۔ اہلِ زمین کے معاملات کے فیصلے وہاں ہوتے ہیں۔ فرشتوں کے یہاں آنے جانے کا سلسلہ بھی اعلیٰ مقاصد کے تحت قائم رہتا ہے۔ فجر و عصر کے علاوہ بعض اہم مواقع پر بھی مثلاً شبِ قدر میں فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ ہمارے بارے میں عالمِ بالا اگر مطمئن ہے تو ہم خیر و عافیت سے ہیں بہ صورت دیگر ہم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے چاند پر اترنے والوں سے زمین پر مسلسل رابطہ قائم رکھا جاتا ہے۔ زمین میں ان سے ربط قائم رکھنے والے سائنس داں اگر ان کے بارے میں اطمینان کا اظہار کرتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ خلائی مسافر عافیت کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہے ہیں اور وہ کسی خطرے سے دو چار نہیں ہیں۔ ان کی کام یابی اور سلامتی متوقع ہے۔ ماہرین کو جس وقت بھی یہ پتا چلتا ہے کہ انھیں کوئی خطرہ درپیش ہے تو وہ ان کے لیے زمین سے ہدایات جاری کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو پیش آمدہ خطرے سے باہر نکال سکیں۔ اب اگر وہ ان ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور زمین سے اپنے ربط و تعلق کی پروا نہیں کرتے تو ان کے لیے ہلاکت ہی مقدر سمجھی جائے گی۔ ٹھیک یہی کیفیت عالمِ بالا سے ہمارے ربط و تعلق کی ہے۔ ہمارے اخلاق و عمل کے نمایاں اثرات کا مشاہدہ عالمِ بالا میں کیا جاتا ہے۔ اگر آسمانوں کے عالم میں ہمارے لیے اطمینان کا اظہار ہو اور وہاں ہمارا ذکر اور تحسین ہو تو سمجھیے کہ ہم سلامتی کی راہ پر قائم ہیں۔ بہ صورت دیگر ہم تباہی اور ہلاکت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا عالمِ بالا میں ان لوگوں کا ذکر فرشتوں کی مجلس میں کرتا ہے جو دنیا میں خدا سے غافل نہیں ہوتے بلکہ اس کو یاد کرتے ہیں۔

قرآن میں بھی یہ مژدہ سنایا گیا ہے: فَاذْكُرُونِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ ۲:۱۵۲) ''تم مجھے یاد رکھو میں تجھے یاد رکھوں گا۔''

پھر یہ ذکر و تلاوت بندے کے لیے زمین میں نور کا موجب ہے۔ یہ نور اصلاً بندۂ مومن کے باطن میں پیدا ہوتا ہے۔ اسے ایک پاکیزہ زندگی میسر آتی ہے جو ایمانی کیفیات و لذات سے معمور اور خدا کی مرضیات کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا شخص اس پرند کی طرح زندگی نہیں گزارتا جو اپنا آشیانہ بھول گیا ہو اور فضا میں ادھر ادھر بھٹک رہا ہو۔ ایسا شخص زندگی کے ہر موڑ پر اور زندگی کے ہر نشیب و فراز میں صحیح فیصلہ کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ صحیح اور درست ہوتا ہے اور وہ وقت پر صحیح اقدام کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ خدا کی نصرت اور مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے۔

اپنی تیسری وصیت میں آپؐ نے زیادہ خاموش رہنے پر زور دیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاموشی مومن کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہے جس کی وجہ سے وہ شیطانی حملوں سے بھی اپنے آپ کو بچا سکتا ہے اور اپنے دین و ایمان کی بہ آسانی حفاظت کرسکتا ہے۔

فضول گوئی اور بسیار گوئی آدمی کو بے وزن بنا دیتی ہے۔ بسا اوقات زبان کی بے باکیوں کی وجہ سے آدمی جہنم میں جا گرتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی، بے باک انسان شیطان کے لیے اس کا پورا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اسے اپنے ناپاک مقاصد کے لیے استعمال کرسکے۔ بسیار گو کے لیے ان گناہوں میں مبتلا ہونے کے اندیشے زیادہ ہوتے ہیں جن کا تعلق آدمی کی زبان سے ہوتا ہے مثلاً جھوٹ، غیبت اور بدزبانی وغیرہ۔ اگر اپنا شعار خاموشی ہے تو ہم بہت سی دنیوی اور دینی آفات اور فتنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اور اپنے دین کی حفاظت پر ہمیں زیادہ قدرت حاصل ہوسکتی ہے۔ زیادہ خاموش رہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدمی سرے سے زبان ہی نہ کھولے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بے ضرورت باتوں میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہ کریں۔ بولیں اس وقت جب کہ فی الواقع اس کی ضرورت محسوس ہو۔ ایک حدیث میں ہے: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ (مسلم) ''جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ یا تو اچھی بات کرے یا پھر خاموش رہے۔''

خاموشی اس لحاظ سے بھی مفید اور ضروری ہے کہ خاموشی آدمی کو اس کا موقع دیتی ہے کہ وہ آیات الٰہی اور نعمائے الٰہی میں غور وفکر کر سکے۔ خاموشی سے اسے اس کا بھی موقع ملتا ہے کہ وہ ایمان کی کیفیات کی حفاظت کر سکے اور ان کو ترقی دے سکے۔

یہ آپؐ کی چوتھی وصیت تھی کہ زیادہ ہنسنے سے بچو۔ زیادہ ہنسی آدمی کے دل کو مردہ کر دیتی ہے یعنی زیادہ ہنسی، مذاق سے دل بے حسی اور غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے ایک طرح کی ظلمت گھیر لیتی ہے۔ جب دل بے نور ہو گیا تو چہرہ بھی بے نور ہو جائے گا۔ آدمی کا چہرہ اس کے دل کی حالت و کیفیت ہی کا ترجمان ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ؕ (الفتح ۲۹:۴۹) ''ان کا امتیاز ان کے چہروں سے سجدوں کے اثر سے ظاہر ہے۔''

یہ آپؐ کی پانچویں وصیت ہے کہ حق بات کہنے سے کبھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ خواہ وہ بات خود اپنے یا دوسروں کے لیے ناخوش گوار اور تلخ ہی کیوں نہ ہو۔ غلط بیانی سے کام لے کر آدمی اپنے آپ کو غیر معمولی نقصان پہنچاتا ہے۔ غلط بیانی کا اثر بہ راہِ راست (Direct) آدمی کی شخصیت پر پڑتا ہے اس سے اس کی شخصیت مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کسی چیز سے ممکن نہیں ہے الا یہ کہ آدمی سچے دل سے توبہ کر کے اپنی اصلاح کرے۔

یہ چھٹویں وصیت ہے کہ حق شناس شخص کو اللہ کے معاملہ میں کسی کی پرواہ نہیں ہوگی۔ وہ وہی کہے گا جو خدا کو پسند ہے اور اپنے لیے وہ اسی راستے کا انتخاب کرے گا جس پر چل کر وہ خدا کی رضا اور اس کی خوش نودی حاصل کر سکتا ہے۔ کسی کی خوشی کے لیے وہ اپنے رب کو ہرگز ناراض نہیں کر سکتا۔

آپؐ کی ساتویں وصیت بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ کسی شخص کو اپنے عیبوں اور گناہوں کی خبر نہیں ہوتی۔ اسے اپنے کو عیبوں سے پاک رکھنے کی اس درجہ کوشش کرنی چاہیے کہ دوسروں کے عیوب و ذنوب ڈھونڈنے کے لیے اس کو فرصت ہی نہ مل سکے۔ جو شخص بھی اپنے نفس کا احتساب کرتا رہے گا اسے اپنے اندر اتنی خامیاں اور کمزوریاں دکھائی دیں گی کہ دوسروں کے عیبوں پر نظر ڈالتے ہوئے اسے شرم دامن گیر ہوگی اور اس سے باز رہے گا۔

لوگوں کی اذیتوں اور پریشانیوں کا خیال

﴿۱﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَۃً فَاَفْضَلُھَا قَوْلُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَدْنَاھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَآءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''ایمان کی شاخیں ستر سے کچھ اوپر ہیں۔ ان میں سب سے افضل اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سب سے کم تر درجہ کی شاخ کسی تکلیف و اذیت دینے والی چیز کو راستے سے ہٹا دینا ہے۔ نیز شرم و حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔''

تشریح: یعنی ایمان کے شعبے اور تقاضے بہت سے ہیں۔ ان میں سب سے افضل جس کی حیثیت درحقیقت ایمان کی جڑ کی ہے، وہ کلمۂ توحید کا اقرار ہے۔ توحید پر یقین و ایمان اگر حاصل نہ ہو تو انسان کے سارے اعمال اور اس کی ساری نیکیاں بے روح اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ عقیدۂ توحید ہی ہے جو ہمارے اعمال کو معتبر اور قابل قدر بناتا ہے۔ توحید کے بغیر انسان کے کردار میں نہ بلندی اور استحکام آ سکتا ہے اور نہ اس میں حسن و رعنائی کی وہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جس کی فطرت انسانی ہمیشہ سے تمنائی رہی ہے۔

اس حدیث میں ایمان کی آخری شاخ اس کو قرار دیا گیا ہے کہ راستے سے اذیت رساں چیز کو ہٹا دیا جائے تاکہ کسی راہ گیر کو کوئی تکلیف یا نقصان نہ پہنچے۔ اسی طرح حیا اور شرم کو بھی ایمان کا ایک شعبہ بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام انسان کے صرف عقائد ہی سے بحث نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے پاس انسان کے اعمال و کردار اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انسان کے ذوق اور اس کے رجحانات تک کو سنوارنے کا منصوبہ رکھتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَآئِشَۃَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: خُلِقَ کُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْ بَنِیْ اٰدَمَ عَلٰی سِتِّیْنَ وَ ثَلٰثِ مِائَۃِ مِفْصَلٍ فَمَنْ کَبَّرَ اللّٰہَ وَ حَمِدَ اللّٰہَ وَ ھَلَّلَ اللّٰہَ وَ سَبَّحَ اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ اللّٰہَ وَ عَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِیْقِ النَّاسِ اَوْ شَوْکَۃً اَوْ عَظْمًا اَوْ اَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ نَھٰی عَنْ مُّنْکَرٍ عَدَدَ تِلْکَ السِّتِّیْنَ وَالثَّلٰثِ مِائَۃِ بِہٖ فَاِنَّہٗ یَمْشِیْ یَوْمَئِذٍ وَ قَدْ زَحْزَحَ نَفْسَہٗ عَنِ النَّارِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ بنائے گئے ہیں (ہر جوڑ ایک صدقہ یا اظہارِ شکر کا تقاضا کرتا ہے) تو جس کسی نے اللہ اکبر، الحمد للہ، لا الہ الّا اللہ، سبحان اللہ، استغفر اللہ کہا اور لوگوں کے راستے سے کوئی پتھر یا کانٹا یا ہڈی ہٹادی یا بھلائی کا حکم دیا یا برائی سے روکا، غرض، اس طرح عدد تین سو ساٹھ کے مطابق عمل کر لیے تو وہ اس دن اس حال میں چلتا پھرتا ہوگا کہ خود کو آتشِ دوزخ سے دور کر چکا ہوگا۔''

تشریح: اس حدیث میں ایک طرف اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان پر خدا کے بے پایاں احسانات ہیں جن کا اسے شعور و احساس ہونا چاہیے اور دنیا میں اسے بندۂ شاکر بن کر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ احسان فراموش اور بندۂ کافر بن کر زندگی گزارنا اس کے لیے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

دوسری طرف یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان خدا کے احسانات کا شکر کس طرح ادا کرسکتا ہے اور اس سلسلہ میں اس کے لیے کتنی کشادگی رکھی گئی ہے۔ چنانچہ بتایا گیا کہ ذکر اللہ یعنی تکبیر و تسبیح اور تحمید ہی نہیں بلکہ ہر نیک کام جو بندہ خوش نودیِ رب کی خاطر انجام دے گا وہ اس کی شکرگزاری میں محسوب ہوگا۔ اگر انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں تو ان میں سے ہر جوڑ خدا کا ایک احسان ہے جو اس نے اپنے بندہ پر کیا ہے۔ اس کے جسم کے جوڑوں میں سے کوئی ایک جوڑ بھی کم ہو تو انسان سخت مشکل میں پڑ جائے۔ اب یہ تین سو ساٹھ مہربانیوں کے جواب میں ہم اظہارِ شکر اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ایک طرف تو ہماری زبان پر خدا کی حمد اور تہلیل و تسبیح ہو، ہمارا سر نیاز اس کے آگے خم رہے۔ دوسری طرف عملی زندگی میں ہم ہر موقع پر کوئی نہ کوئی بھلائی کا کام کرتے رہیں۔ لوگوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے کوشاں ہوں۔ انھیں نیکی اور بھلائی کی دعوت دیں۔ برائیوں سے انھیں باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہ بھی گوارا نہ ہو کہ راستہ پر پتھر کے ٹکڑے، کانٹے وغیرہ ایسی چیزیں پڑی رہیں جن سے لوگوں کو تکلیف پہنچے۔ اس طرح اگر ہم خدا کے احسانات کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو زمین میں ہمارے وجود کی حیثیت محض نجات پانے کے مستحق کی نہیں بلکہ نجات یافتہ وجود کی ہوگی۔